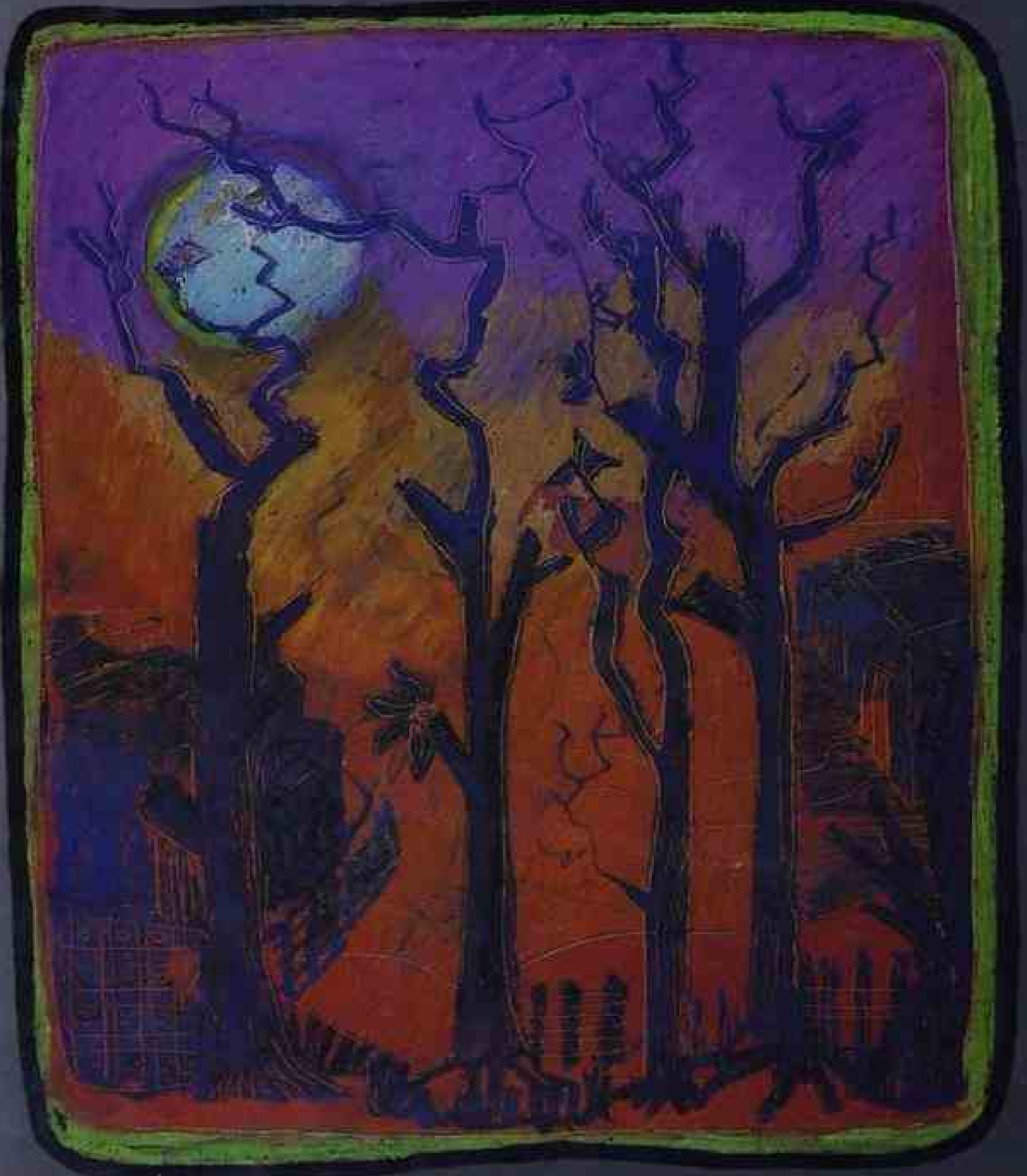
پہلی کہانیاں

انور سجّاد



پہلی کہانیاں

افسانے (۵۷-۱۹۵۱ء)

انور سجاد

سنگِ میل پبلی کیشنز ○ چوک اردو بازار - لاہور

۱۹۹۰

نیاز احمد نے

زاھد بشیر پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

سے شائع کی۔

تعداد ــــــ ایک ہزار

ترتیب

ہوا کے دوش پر[۵]

وہ اندھا دھند ہوائی جہاز چلا رہا تھا۔

اس کے کانوں میں اسکواڈرن لیڈر کی آواز گونج رہی تھی کہ وہ اتنے فٹ کی بلندی پر پرواز کر رہا ہے۔ اس کی رفتار اتنے سو میل فی گھنٹہ ہے اور وہ کافی اُڑان کر چکا ہے اس لیے اُسے اب نیچے اتر آنا چاہیے۔ مگر اُس نے سُنی اَن سُنی کر دی۔ دو ایک دفعہ اُس نے یہ دھمکی بھی دی کہ اگر وہ لینڈ نہیں کرے گا تو اس کو ملازمت سے الگ کر دیا جائے گا۔ لیکن اُس کے کانوں پر سے آواز پھسلتی رہی۔ فلائینگ لیفٹیننٹ کے کان ہینڈٹک ایسی آوازیں سُن سُن کر پک گئے تھے۔ اُس نے ہیڈ فون اتار کر پرے پھینک دیا۔ اسکواڈرن لیڈر چلاتا رہا۔ اس کا ہاتھ تھراٹیل کو آگے کی طرف دھکیلتا رہا اور ہوائی جہاز کی رفتار بڑھتی رہی۔

رہ رہ کے اُسے یاسمین کا خیال آ رہا تھا۔ ویسے اُسے ایئر فورس میں

---

۵ پہلی مطبوعہ کہانی۔ نقوش، خاص نمبر ۲۰-۱۹، اپریل ۱۹۵۱ء

بھرتی ہوئے اتنا عرصہ ہو چکا تھا کہ اس نے اس کے متعلق کبھی نہ سوچا تھا۔ مگر نہ جانے وہ آج اُسے کس طرح یاد آ رہی تھی، کہ وہ اس وقت پڑھنے کے بہانے پٹھان لونڈے جلیس سے محبت کر رہی ہوگی۔ اس کی ممی بڑے اطمینان سے ڈرائینگ روم میں فائر اسکرین کے پاس آرام کرسی پر بیٹھی سویٹر بُن رہی ہوں گی اور اس کے ڈیڈی دُنیا و مافیہا سے بے خبر وسکی کا ایک پیگ چڑھائے خمار میں بیٹھے نوکروں کو گالیاں پلا رہے ہوں گے۔ بادل اپنے سینوں میں نامعلوم مقصد چھپائے، فضا میں گھوم رہے ہوں گے۔ اور وہ نیند کا سہارا لیے کر باہر باغیچے میں املتاس کے درخت کے نیچے جلیس کے زانوؤں پر سر رکھے، ہونٹوں پر کوئی انجان سا نغمہ تیرا رہی ہوگی۔ پھر اُس چغد نے آہستہ سے اپنے کوٹ کی جیب سے چاندی کی بنی ہوئی نسوار کی ڈبیا نکالی ہوگی اور اس کی نظروں سے بچ کر ایک چٹکی نسوار اپنے نچلے ہونٹ میں رکھ کر ایک بڑی سی پیک پیچھے جھاڑیوں میں پھینکی ہوگی۔ اور ڈبیا جیب میں رکھ کر کوٹ سے ہاتھ صاف کرنے کے بعد اس کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرنے لگ گیا ہوگا۔ (تاکہ انگلیوں سے لگی ہوئی باقی نسوار بھی جھڑ جائے) ڈیڈی بھی گالیاں بک جھک کے اخبار ہاتھ میں لیے ڈرائینگ رُوم سے ممی کو لے کر سونے چلے گئے ہوں گے جیسے اس کے وہاں ہوتے ہُوئے وہ انھیں سلانے کے لیے لے جایا کرتے تھے —— کوئی اُسے بھی تھپک تھپک کر سلانے لگا —— سو جا میرے آرٹسٹ سو جا —— سو جا فلائنگ لیفٹننٹ سو جا —— سو جا میرے پیارے قربانی کے بکرے سو جا۔

اس کی یاسمین کے کُنبے سے یُوں ہی واقفیت ہو گئی تھی۔ ہُوا یُوں کہ ایک دفعہ آرٹ کونسل میں مصوری کی نمائش ہُوئی جس میں زبیر نے بھی چند شاہکار پیش کیے۔ اس کی بنائی ہُوئی تصویریں ممی کو بہت پسند آئیں۔ ایک تصویر پر اُسے اوّل انعام بھی ملا تھا۔ انھوں نے یہ تصویر خریدلی اور نمائش کے صدر سے کہا کہ وہ زبیر سے ملنا چاہتی

ہیں۔ چنانچہ اُسے، جو اس وقت ساتھ والے کافی ہاؤس میں بیٹھا پیالی پر پیالی چڑھا رہا تھا، بلایا گیا۔ جب اُنھوں نے دیکھا کہ تصویر کے خالق کی عمر صرف بیس بائیس سال ہے تو حیران رہ گئیں اور ساتھ ہی اس کا حُلیہ دیکھ کر مسکرا بھی دیں۔ ماشاء اللہ کیا حُلیہ تھا۔ گریبان کُھلا ہُوا، بال بکھرے ہُوئے، ناک کی چونچ پہ کافی کی کریم جمی تھی اور اس پر طرہ یہ کہ کالی عینک ناک پر سوار تھی جس کا ایک شیشہ مکمل طور پر غائب تھا۔ دراصل قصور اس کا بھی نہ تھا کیونکہ وہ اس وقت بیٹھا ہُوا نسیم کو پیشہ ور آرٹسٹ بن کر دکھا رہا تھا۔ اور اسی طرح اٹھ کر چلا آیا۔ سامنے پڑے ہُوئے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر کچھ کھسیانا ہو گیا۔ عینک اتار کر جیب میں ڈال لی اور قمیص کے بٹن بند کرنے میں مشغول ہو گیا۔ ممی نے اپنے پرس سے چھوٹا سا رومال نکالا اور اس کی ناک پر لگی ہوئی کریم صاف کر دی۔ یاسمین پر اس کی نظر پڑی تو وہ اُسے گھور رہی تھی۔ وہ اور زیادہ کھسیانا ہو گیا اور وہ دوسری طرف مُنہ کر کے مسکرانے لگی مختصر سی رسمی گفتگو کے بعد اُنھوں نے کہا کہ وہ مصوری کی بہت دلدادہ ہیں اور خود بھی تھوڑی بہت جھک مارتی ہیں۔ مگر مہارت حاصل نہیں ہُوئی۔ اس لیے وہ اس سے مصوری سیکھیں گی۔ اس نے معذرت چاہی مگر وہ نہ مانیں۔ اور پرس میں سے کارڈ نکال کر اُسے پکڑاتے ہُوئے کہا "میں کل شام پانچ بجے تمہارا انتظار کروں گی" اور وہ اس پہ لکھا ہُوا ایڈریس پڑھنے لگا۔ "بیگم علی مشتاق ۲۔ بی، ۳۱ لنکن روڈ!!" ملک کی عظیم ترین ادیبہ! اس نے سر اٹھایا تو وہ واپس جا رہی تھیں۔ انکار کی گنجائش نہ رہی۔ اس نے سر کھجاتے ہُوئے کارڈ جیب میں ڈال لیا اور واپس آرٹ کونسل کے کافی ہاؤس کی طرف لپکا۔ اس نے کرسی کھینچی اور دھپ سے بیٹھ گیا۔

"خیر تو ہے، سانس پھُولا ہُوا ہے۔" نسیم نے اپنے ہونٹوں سے پیالی ہٹا لی۔

"بھئی نسیم! اب لُطف رہے گا۔" اس نے ایک ثابت اُبلا ہُوا انڈا مُنہ میں رکھا۔

"کیوں کیا ہُوا؟"

"بیرا ـــ! یہ کافی گرم کرکے لاؤ ـــ جانتے ہو کون تھی؟"

"تھی؟ وہ چیختا۔ کون تھی؟"

"بیگم علی مشتاق یعنی میری دوست رینو کی خالہ ـــ اور "رُدبی" کی مصنفہ اب بے جا مُنہ دھو کے رکھ، وہ تجھے کیوں بلانے لگیں"؟ اُس نے ایک ہی سانس میں تمام الفاظ کہہ دیے۔

"مُنہ تو دُھلا دُھلایا ہے۔ بلکہ ابھی ابھی نہا کر آیا ہوں۔ تم نہ مانو۔" اس نے کارڈ جیب سے نکال کر اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "کل شام پانچ بجے اپائنٹمنٹ ہے۔"

"اچھا! حیرانی کی بات ہے۔ آخر بلایا کیوں ہے؟"

"مجھ سے مصوری سیکھیں گی ـــ سگریٹ ......"

"اندھوں میں کانا راجہ۔" نسیم کی آنکھوں میں مذاق ناچنے لگا۔ "یعنی تم مصوری سکھاؤ گے۔ خیر چھوڑو۔ ساتھ یاسمین ہوگی۔"

"شاید۔"

"وہی ہوگی۔ اوّل تو وہ گھر سے نکلتی ہی نہیں۔ اگر باہر نکلے گی تو ممی کے ساتھ ـــ کیا وہ گُل یاسمین کے پودے کی طرح نازک تھی؟"

"ہوں ـــ ہوں۔" اس نے سر ہلایا۔

"تو پھر یقیناً وہی ہوگی ـــ اماں یار ذرا سنبھل کے جانا لڑکیوں کے معاملے میں تمہارا دِل ویسے بھی کمزور ہے۔ اس نے سگریٹ کی ڈبیہ میز پر پھینکی جو پھسلتی ہوئی زبیر کے پاس جا پہنچی۔ "کہو تو رینو سے سفارش کروا دوں؟"

"ضرورت پڑی تو۔" اُس نے مُسکرا کر سگریٹ سُلگا لیا۔

بیرا گرم کافی میز پہ رکھ کر اور پھر جُھک کر نہایت ہی عاجزی سے مڑا جیسے وہ ان کا قرضدار ہو۔ زبیر نے اس کی طرف اشارا کرتے ہوئے کہا: "ہم ذہنی طور پر کتنے مفلوج ہوتے

ہیں ——— اپنے آپ کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔"

"تمھیں کیا ——— یہ سالے پیدا ہی دوسروں کے سامنے جھکنے کے لیے ہوتے ہیں۔ یقیناً اس کا باپ بھی بیرا ہوگا اور اس کا بیٹا بھی بیرا ہی بنے گا۔ ان باتوں کو چھوڑو۔ آؤ پیار محبت کی باتیں کریں۔ لڑکیوں کی باتیں کریں۔"

اور وہ پیار اور محبت کی باتیں کرتے رہے اور سگریٹ پھونکتے رہے۔

اس کی آنکھوں کے سامنے بھی دھوئیں ایسا سرمئی غبار چھا گیا جو بعد میں مٹیالا ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے چاروں طرف دھند چھا گئی۔ اور وہ طوفان کی لپیٹ میں آگیا۔ اس نے رفتار اور بھی تیز کر کے رُخ آسمان کی طرف پھیر دیا اور جہاز بڑی سُرعت سے تیز رو طوفان کا سینہ چیرتا ہوا زمین کو نیچے چھوڑ گیا۔ اسکواڈرن لیڈر چلا چلا کر تھک چکا تھا اور اپنے کمرے میں آرام کر رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر مُسکراتا ہُوا آرٹ کونسل کے بغل والے کافی ہاؤس پہنچ گیا اور نسیم کو کل کی کارروائی سُنانے لگا۔

"جناب کل خوب خاطر تواضع ہوئی۔" اس نے چہک کر کہا۔

"مگر سر پر بال تو اب بھی موجود ہیں۔"

"مذاق چھوڑو ——— یہاں کسی کا مستقبل سنور رہا ہے اور تم۔۔۔۔۔۔۔۔"

وہ روسا دیا۔

Don't cry اس نے تھپکی دی۔ "اچھا پھر۔"

"بڑا اچھا کنبہ ہے۔" اس کے ماتھے کی تمام سلوٹیں نکل گئیں جیسے کسی نے استری پھیر دی ہو۔

"اچھی جگہ ہاتھ مارا ہے۔"

"قسمت نے یاوری کی ہے۔"

"اب تو تم پہاڑ پر نہیں جاؤ گے؟"

"اس صحت افزا مقام کو چھوڑ کر کون جاتا ہے۔"

"یاسمین سے باتیں ہوئی تھیں؟"

"نہیں ——— آئندہ ہوا کریں گی۔ مَیں اور ممی بیٹھے ہُوئے تھے کہ وہ آئی کہنے لگی کہ ابھی تک آپ نے مجھے سائنس کا ٹیچر نہیں رکھ کے دیا اور ممی جھوم کر کہنے لگیں۔ بیٹا! تم ایم۔ ایس سی میں پڑھتے ہو۔ ذرا یاسمین کو فزیالوجی پڑھا دیا کرو نا۔ ایک گھنٹے کے بجائے دو گھنٹے سہی' اور مَیں تھوڑی سی ظاہری پس و پیش کے بعد مان گیا۔" وہ پائپ میں تمباکو بھرتے ہُوئے بولا۔

بہت دیر تک یہی باتیں ہوتی رہیں۔ جب پانچ بج گئے تو دونوں باہر نکلے۔

"اچھا ماسٹر چل دیئے" زبیر نے ایم۔ جی سپورٹس کار کی پچھلی سیٹ پر اپنا کوٹ پھینکا۔ "تمھیں رینو کے یہاں لفٹ دے دُوں؟"

"نہیں بھئی" اس نے سائیکل پکڑ لی۔ ...... "پہلے مَیں گھر جاؤں گا۔ آج صبح سے نہیں گیا۔ پھر وہاں سے اپنی کار پر ......"

"ہمارا گھر نہیں ہے؟ ہم بھی صبح ہی سے نکلے ہُوئے ہیں۔"

"تمھارا کیا گھر بار ہے ——— ایک باپ ہی باپ ہے۔ اُسے بھی دفتر سے چھٹی نہیں ملتی۔ صبح دس بجے جاتا ہے۔ شام کو لوٹتا ہے ——— کولھو کے بیل کی طرح ......" اس نے آہستہ سے کہا۔ آخری الفاظ پر وہ بڑبڑا گیا۔

"تو پھر ———"

"کل کالج سے یہیں آجائیں گے۔ مَیں کل سائیکل نہیں لاؤں گا۔ کار پر رینو کی طرف سیدھے یہیں سے چلیں گے۔"

پھر اُس نے کار اسٹارٹ کی اور کار اضطراب سے پھنکارتی ہُوئی گول اور چھوٹے لان کے گرد گھومتی ہُوئی پورچ میں جا کھڑی ہُوئی۔ ممی باغیچے میں کھڑی ہُوئی' کچھ پینٹ

کر رہی تھیں۔

وہ ممی کو پینٹنگ سکھاتا رہا اور یاسمین کو پڑھاتا رہا ——— دن گزرتے رہے اور یاسمین کے ساتھ اس کے تعلقات بڑھتے گئے، جس قسم کے تعلقات کی اُسے اُمید تھی۔ وہ دونوں اپنی اپنی تقدیروں کو رینو اور یاسمین کی مسکراہٹوں میں جگمگاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

اور ممی مُسکراتی اور ساڑھی کے پلّو کو ہاتھ میں مسلتی ہوئی باغیچے میں آئیں۔

"اندر چل کر بیٹھو بیٹا۔ باہر سردی ہے"

"آداب ممی —— کوئی بھی تو نہیں سردی" وہ اپنے پٹھے اکڑاتے ہوئے بولا۔

"ابھی گرم خون ہے نا —— اسی لیے۔ مَیں کہتی ہوں چلو اندر۔"

"مگر آپ منظر کشی اندر کس طرح کریں گی؟"

"نہیں۔ آج موڈ نہیں ہے" انھوں نے انگڑائی لی۔

اور وہ دونوں ڈرائینگ روم میں آ گئے۔

"وہاں فائر سکرین کے پاس بیٹھو اور مجھے ماؤتھ آرگن سناؤ۔ تاکہ مَیں ایک بار پھر اپنی آباد کی ہوئی دُنیا میں پہنچ جاؤں۔"

وہ فائر سکرین کے پاس بیٹھ گیا اور سانس ماؤتھ آرگن کے سروں میں ڈھلنے لگے۔ کبھی کبھی تو وہ ممی کی اس قسم کی باتوں سے بہت جھنجلایا کرتا تھا۔ مثلاً تم مجھے دُنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو، اور وہ سوچتا۔ کیا علی مشتاق صاحب سے بھی زیادہ؟ پھر مجھے تم سے شدید محبت ہے۔ واہ علی مشتاق صاحب کے ہوتے ہوئے مجھ سے محبت کیوں ہونے لگی۔ ابھی تو خیر سے وہ زندہ ہیں۔ مادرانہ شفقت ہو گی —— اور پھر بے جا تعریف۔ تم کتنے خوبرو ہو، تمھارا جسم بالکل اسی نسبت سے تراشا گیا ہے۔ جس نسبت سے یونانی دیوتاؤں کے مجسمے۔ تمھاری نیلی نیلی آنکھیں بے حد خوبصورت ہیں۔ ٹیگور کو تو

ساری عمر نیلی آنکھوں کی تلاش رہی کاش آج بنگال کا مہاکوی زندہ ہوتا جو کہتا تھا "کہاں ہیں وہ نیلی جھیل ایسی آنکھیں جن میں میرا ڈوب جانے کو جی چاہتا ہے" تو میں اُسے کہتی کہ دیکھ لو، جن آنکھوں کی تمہیں تا زیست تلاش رہی، آج میں ان آنکھوں میں غوطہ زن ہوں۔" اس وقت وہ بالکل ٹیگور معلوم ہوتیں۔ اسی طرح پُر جلال چہرہ، کندھوں پر بال بکھرے ہوئے اور آنکھوں میں اُداس مسکراہٹ۔ فرق تھا تو صرف داڑھی کا۔ اس نے یہ راز نسیم کو بھی نہ بتایا اور یہ وجہ وہ خود بھی نہیں جانتا تھا۔ وہ بہت حیران ہوتا کہ یہ کس قسم کی ہیں۔ اس کی امی تو اس کے چھٹپن ہی میں فوت ہو گئی تھیں اور اُسے مادری شفقت کی پہچان نہ تھی۔ وہ ممی کے متعلق سوائے ممی کے اور کوئی رائے قائم کرنا گناہ سمجھتا تھا اس لیے وہ اس قسم کے بیہودہ خیالوں کو ذہن میں آتے ہی شیشے کی طرح چکنا چور کر دیتا تھا۔

"ممی —— ! آج یاسمین کہاں گئی ہے؟" اس نے ماؤتھ آرگن بجانا بند کر دیا۔

"کیوں؟ اس کے بغیر دل نہیں لگ رہا ہے۔"

اور وہ پھر شرما گیا۔

"جی آج اسے پڑھنا نہیں؟" وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

اس کو آج میں نے جان بوجھ کر رینو کی طرف بھیج دیا ہے۔"

"کیوں؟"

"تم سے باتیں کرنی تھیں۔" اُن کی آنکھوں میں خمار اور آواز میں لوچ تھا۔

وہ اُٹھ کر زبیر کے اس قدر قریب بیٹھ گئیں کہ سانس اس کے چہرے پر ہوائی لمس کی طرح بکھرنے لگے۔

وہ حیران ہو گیا۔

"خاموش کیوں ہو؟"

اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور ہونٹ سل گئے۔

"میں چاہتی ہوں کہ تمہارے ساتھ۔۔۔۔۔"

وہ بھاگنے کی تیاری کرنے لگا۔

"کہ تمہارے ساتھ یاسمین کی شادی کر دوں"

وہ زمین میں گڑ گیا۔ اس کو ایسا محسوس ہوا گویا کسی نے اُسے زہریلا شہد چٹا دیا ہو۔ اُس نے یُوں ہی ممی کے متعلق اتنی ذلیل رائے قائم کی۔

"بیٹا! کیا سوچ رہے ہو؟"

"جی کچھ نہیں" اُس نے حواس درست کیے اور زمین میں گڑا ہوا باہر نکلنے لگا۔

"تو پھر کیا خیال ہے تمہارا؟"

"یہ تو آپ کی مہربانی ہے"

"میں تمہارے ڈیڈی سے ملی تھی۔ انھیں تو میں نے راضی کر لیا ہے کہ ایم۔ایس سی کے بعد شادی ہو جائے گی۔ میں نے سوچا تمہاری رائے بھی لے لی جائے تو کوئی حرج نہیں"

"آپ ماؤتھ آرگن سنیئے"

اس نے پلکیں جھکا کر ماؤتھ آرگن بجانا شروع کر دیا اور ممی مسکرا پڑیں۔

تھوڑی دیر میں چائے آگئی اور ممی اس کے لیے چائے بنانے لگیں۔ چائے پی کر زبیر جانے ہی والا تھا کہ کار کا ہارن سُنائی دیا اور ممی نے بتایا کہ یاسمین آگئی ہے۔ وہ جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھنے لگی کہ مشتاق صاحب بل ڈاگ کی طرح غرائے کہ تیزی سے نہ چڑھو ورنہ گر جاؤ گی۔ اس نے پروا نہ کی اور ڈرائنگ روم میں پہنچ گئی۔

"آؤ یاسمین ـــــ ٹیچر صاحب انتظار کر کے تھک گئے ہیں۔ کیوں بیری؟"

"اجی نہیں" وہ بولا۔

آج تو وہ زبیر کی آنکھوں میں کھُب رہی تھی۔ سفید شلوار، سفید قمیض، کالا سویٹر، کالا دوپٹہ جو ڈھلک کر اس کے سینے پر آ رہا تھا۔ اور پاؤں میں کالی سوئیڈ کی بنی ہوئی سیلم شاہی جوتی۔ ایسے معلوم ہوتی تھی جیسے چاند کا ایک کونہ چھوٹی سی کالی بدلی میں چھپ گیا ہے ——— وہ زبیر کے ساتھ بیٹھ گئی اور ممی اُٹھ کھڑی ہوئیں۔

"دیکھو میری بائیں اور میاں کلب جا رہے ہیں۔ گھنٹے دو گھنٹے تک لوٹیں گے جب تک تم یہیں بیٹھنا۔"

"ابا گھر انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ان سے کہہ دینا کہ تم میری طرف تھے۔"

"جیسا آپ فرمائیں۔"

اور وہ چلی گئیں ——— یاسمین باتوں باتوں میں وہیں کوچ پر زبیر کی رانوں پر سر رکھ کر دراز ہو گئی اور وہ حسبِ عادت آہستہ آہستہ اس کے نرم نرم ریشم کی طرح ملائم بالوں میں اپنی انگلیوں سے کنگھی کرنے لگا۔ اس نے اپنی شادی کے متعلق اُسے خوشخبری سنائی تو وہ بہت خوش ہوئی۔ پھر اُس نے غزل کی فرمائش کی اور زبیر نہایت ہی اچھی غزل گانے لگا۔ اُس نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اس وقت وہ بالکل وینس معلوم ہو رہی تھی۔ غزل ختم کرنے کے بعد وہ بولا "تمہارے بال بہت اچھے ہیں۔"

وہ سو گئی تھی۔ ——— اس نے نہایت ملائمت سے اس کے گال کو چاروں انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان پکڑ کر آہستہ سے بلایا۔ اُس نے آنکھیں کھول دیں اور سہمے ہوئے ہاتھ اُس کے بازو پر پھیرنے لگی۔

"سو گئی تھیں؟"

"جی ویسے ہی ذرا آنکھ لگ گئی تھی۔ میں نے بڑے اچھے اچھے خواب دیکھے ہیں۔"

"کیا؟" اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔

"جب یہ خواب پورے ہو جائیں گے تو آپ کو خود ہی پتہ چل جائے گا۔"

"اچھا!"

پھر اس نے اس کے بالوں کی بہت تعریف کی ——— اور ممی کی واپسی تک وہیں بیٹھا رہا۔ پھر کھانا کھا کے لوٹ آیا۔ دن بڑی ہمواری سے گزرتے گئے۔

یاسمین نے زبیر کو اپنے گلہری کی دُم ایسے ملائم بالوں کا بنا ہُوا پینٹنگ بُرش تحفہ دیا ——— یاسمین کی سالگرہ پر زبیر نے اُس کی تصویر خود بنا کر پیش کی۔ اور نسیم نے بھی چند اچھی اچھی کتابیں دیں۔ محفل میں اس کی تصویر کو سراہا گیا۔ لوگوں کا متفقہ فیصلہ تھا کہ تصویر میں صرف رُوح کی کمی ہے۔ اور زبیر کی رُوح پھڑپھڑانے لگی۔ کاش وہ رُوح پھونک سکتا۔ پھر وہ یاسمین سے علیحدگی میں ملا تو اس نے تصویر کو سامنے رکھ کر بتایا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ آئینے میں اپنا عکس دیکھ رہی ہے۔ اس نے بھی کہا کہ کمی صرف رُوح کی ہے۔

وہ سوچ رہا تھا کاش وہ ولی اللہ ہوتا۔ وہ قم باذن اللہ کہتا اور تصویر میں حرکت پیدا ہو جاتی۔ اور دوسری یاسمین اس کے سامنے کھڑی ہو جاتی۔ شاید اس نے اپنے دل میں دو ایک مرتبہ کہا بھی مگر تصویر میں حرکت پیدا نہ ہُوئی۔ البتہ یاسمین جو کتنی ہی دیر سے کھڑی اس کے مُنہ کو تکے جا رہی تھی مُسکرائی اور ڈرائینگ روم میں جا کر چغتائی کی پینٹنگ کی جگہ اپنی تصویر لٹکا دی۔

——— پھر جیسے اس کے سامنے ونڈ سکرین پر یاسمین کی تصویر لٹک رہی ہو۔ اُس نے اپنی سیٹ سے لپک کر اُسے پکڑنا چاہا لیکن اس کا ہاتھ شیشے سے ٹکرا گیا۔ اس نے چونک کر اپنے آپ کو سنبھالا اور جہاز پہاڑیوں سے ٹکراتا ٹکراتا بچا۔

ایک دن وہ بڑی تیزی سے کار چلا رہا تھا کہ ایک موڑ پر اس کے سامنے تانگہ آگیا۔ اُس نے بدحواس ہو کر سٹیئرنگ جو گھمایا تو کار بجلی کے کھمبے سے ٹکرا گئی۔ اور وہ

شدید زخمی ہوگیا۔ دو ایک دِن تک ممی نے اس کا انتظار کیا۔ پھر وہ خود ہی اس کے گھر چلی آئی اور ان کے ساتھ یاسمین بھی تھی۔ زبیر کے ابا سرہانے بیٹھے اس کا سر دبا رہے تھے اور وہ تقریباً پٹیوں میں چھپا ہوا لیٹا تھا۔ علیک سلیک کے بعد انھوں نے بڑی کوشش سے اجازت حاصل کرلی کہ یاسمین اس کی تیمارداری کرے گی۔ چند دنوں میں وہ اچھا ہوگیا۔ نسیم نے اُسے خوشخبری سُنائی کہ اگلی اتوار کو اس کی شادی رینو سے ہو رہی ہے۔ سارا ہفتہ وہ سامان خریدتے رہے حتیٰ کہ وہ خود رینو کو ساتھ لے جاکر اس کی پسند کی چیزیں خریدتے رہے۔ دِن گزرتے گئے اور نسیم کی جھٹ منگنی اور پٹ بیاہ ہوگیا۔ وہ دونوں چوتھے ہی دِن لندن چلے گئے کیونکہ نسیم کو ذوآلوجی کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے حکومت نے وظیفہ دیا تھا جس دِن وہ لندن جارہے تھے، اسی دِن نسیم کے کہنے پر اس نے یاسمین کو انگوٹھی بھی دی۔

ہوائی اڈے سے واپسی پر یاسمین نے زبیر کو بتایا کہ کل اس کے ایک مقامی دوست اس سے ملنے والے ہیں۔ جو دراصل پشاور کے ہیں۔

اس نے کہا "یاسمین، قلمی دوست بڑی مہلک چیز ہے۔"

"کیوں۔ کس کے لیے؟"

"میرے لیے۔"

"ارے نہیں —— ایسی کوئی بات نہیں۔ وہ تو محض میرے دوست ہیں۔ دوست بنانا کوئی بری بات نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" اس نے دِل ہی دِل میں اپنے آپ کو تسلی دی۔ "اُس کا نام کیا ہے؟"

"جلیس۔"

"کتنا پیارا نام ہے۔"

"مگر زبیر سے پیارا نہیں۔"

راتیں دِنوں میں اور دِن راتوں میں ڈھلتے رہے۔ اُسے زبیر سے زیادہ کوئی نام پیارا نہ لگا۔ جلیس اس کے دوست کی حیثیت سے ان کے یہاں آنے جانے لگا۔ ممی نے برا بھی نہ مانا۔ زبیر کو کئی دفعہ دھچکا لگا مگر وہ اُسے برابر یقین دلاتی رہی۔ آخر اس کی فطرت میں کسی کو کوئی دخل نہ تھا، اس پہ غالب آگئی اور وہ جلیس کو زبیر پر ترجیح دینے لگی جس طرح وہ اچانک زبیر کو اکرام سے زیادہ اچھا سمجھنے لگی تھی۔

خزاں کی ایک اداس شام کو زبیر بہت خوش گیا کہ آج ممی نہیں ہیں ذرا باتیں کریں گے لطف رہے گا۔ اس نے چپکے سے کار کھڑی کی اور آہستہ آہستہ اُس کے کمرے کی طرف جانے لگا کہ اُسے ایک دم ڈرائے گا مگر دروازے کے پاس جا کر وہ ٹھٹک کر رہ گیا۔ آج سے دو سال پہلے کی باتیں جو اُس نے اس کے ساتھ کی تھیں، وہی جلیس کے سامنے دُہرائی جا رہی تھیں۔ وہ واپس چلا آیا۔ کار کا دروازہ کھولنے ہی والا تھا کہ اس کی دی ہوئی انگوٹھی اس کے پیروں میں آ گری۔ اس نے آہستہ سے جھک کر اُسے اُٹھایا اور اپنی جیب میں ڈال لیا اور چلا آیا۔

وہ اب کسی کے دامن میں چھپنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ اس نے ایک عورت کی فطرت کو برہنہ ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس نے گھر آتے ہی یاسمین کا دیا ہوا پینٹنگ برش ایک ڈبے میں بند کر کے ایک خط کے ساتھ پارسل کر دیا۔ دوسرے ہی دن اُس نے ایئر فورس میں بھرتی کے لیے درخواست دے دی۔ انٹرویو وغیرہ ہوا۔ جب وہ جی، ڈی پائلٹ بھرتی ہو کر جا رہا تھا تو یاسمین نے فائر برش کے پاس کھڑے ہو کر اس کا خط اٹھارہویں دفعہ پڑھا۔ "ہونہہ کہتا ہے اتنا عرصہ تم میری زندگی سے کھیلتی رہیں۔ اب میں اپنی زندگی سے کھیلوں گا —— تو کھیلو۔ تمہیں منع کون کرتا ہے۔ ہر انسان کو حق ہے جو چاہے کرے۔ میں تمہیں روکنے والی کون ہوں۔" اور پھر خط کو برش سمیت

آگ میں جھونک دیا۔

وہ زندگی اور موت کے سنگم پر کھڑا سوچ رہا تھا کہ ایک قدم آگے بڑھے تو موت ہے ورنہ زندگی ——— "نہیں۔ میں ہمیشہ زندگی سے بھاگتا رہا ہوں ——— میں بھگوڑا ہوں" کوئی اس کے کانوں میں چیخ چیخ کر کہنے لگا۔ ہوائی جہاز دھاڑنے لگا۔ اس بار وہ نہیں بھاگے گا۔ جب وہ اپنی ذہنی الجھنوں سے ڈر کے بھاگا تھا تو اُس نے عورت کا سہارا لیا تھا۔ مگر اس نے پناہ دے کر اس کی زندگی کو اور بھی اُلجھا دیا تھا۔ پھر اُس نے ہوابازی کی زندگی کو اپنایا۔ اب وہ اسے کبھی نہیں چھوڑے گا۔ حتیٰ کہ اس کو آخری زندگی بلانے کے لیے آجائے گی۔ اور وہ اس ابدی زندگی کی کمر میں بازو حمائل کر کے ناچتا، کودتا، ہنستا کھیلتا چلا جائے گا۔

اس نے ہوائی جہاز لینڈ کر لیا اور مسکراتا ہوا نیچے اُترا۔ اسکواڈرن لیڈر کو سلام کرنے کے بعد اس نے ٹوپی اتاری اور رومال سے صاف کرنے لگا۔ اس نے تھوڑی سی ڈانٹ پلائی اور سب ٹھیک ہو گیا۔ دراصل وہ زبیر پر بہت مہربان تھا اور اُسے اپنا ہی بیٹا سمجھتا تھا۔ وہ ایروڈروم کے بلیرڈ سیلون میں چلے گئے اور شام تک بلیرڈ کھیلتے رہے۔ پھر وہ اپنے گھر چلا گیا اور زبیر ریستوران میں جا بیٹھا اور سوچنے لگا کہ وہ ایک بار پھر ۲۱ لنکن روڈ جائے گا۔ اور یاسمین سے اس تمام واقعے کی وجہ دریافت کرے گا۔ ہو سکتا ہے اُس نے مذاق کیا ہو۔ اُسے پتہ بھی تو تھا میں شام کو آنے والا ہوں۔ اس لیے وہ کوئی دوسرا وقت مقرر کر سکتی تھی ——— شرارتی لڑکی نے ضرور مذاق کیا ہے ...... نہیں اگر اس نے مذاق کیا ہوتا تو ضرور خط میں ازالہ کرتی ——— مگر میں نے اُسے ایڈریس بھی تو نہیں لکھا۔ گھر سے تو میں بھاگا ہوا ہوں ——— اباجان مجھے کتنا ناہنجار سمجھتے ہوں گے۔ انھیں کتنا صدمہ ہوا ہو گا۔ اُس نے بیرے کو چائے کے لیے کہہ کر سگریٹ سلگا لیا۔ اور ایئر ہوسٹس داخل ہوئی۔ اس نے زبیر کو انگریزی کا ایک ہفتہ وار رسالہ دیا اور اُس نے

مسکرا کر پکڑ لیا۔ آج وہ بات بات پر کھل رہا تھا۔ اس کو شکوہ تھا کہ وہ اُس کے ساتھ ہنس کر بات نہیں کرتا۔ مگر آج اس نے اُس کے ساتھ بہت سی باتیں کیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ خوش ہو کر کہنے لگی: "اب بس کیجیے —— تھوڑی سی باتیں کل کے لیے چھوڑ دیجیے۔" اور وہ چلی گئی۔

اُس نے چائے کا گھونٹ پی کر رسالہ کھولا اور پڑھنے لگا۔ جب Couples کے صفحے پر پہنچا جہاں تازہ شادی شدہ جوڑوں کی تصویریں چھپی ہوتی ہیں، تو وہ ہر ایک جوڑے کو مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ آخر میں آ کر اس کی نگاہیں اٹک کر رہ گئیں۔ اس کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اُس کے سینے میں خنجر بھونک دیا ہو۔ جلیس ایم اے اور یاسمین ایک دوسرے سے کندھا ملائے کھڑے مسکرا رہے تھے۔ گویا اس کا منہ چڑا رہے ہوں۔ وہ اُٹھا اور سٹے میں ہارے ہوئے سٹہ باز کی طرح ہوائی جہاز کی طرف چل دیا۔ ہوائی جہاز چنگھاڑنے لگا۔ "بھگوڑا۔ بھگوڑا۔" مگر ہوائی جہاز دھاڑتا ہی رہا اور اس نے کوئی پروانہ کی۔ وہ بڑھتا گیا اور بڑھتا ہی رہا اور آخر دُور شفق میں شام کے دھندلکے میں تحلیل ہو کر رہ گیا۔ آخری زندگی اُسے بلا کر لے گئی تھی اور وہ اس کی کمر میں بازو حمائل کر کے ناچتا، کودتا، ہنستا کھیلتا اس کے ساتھ جا چکا تھا۔

دوسرے دن ممی اخبار ہاتھ میں پکڑے رومال سے آنسو پونچھ رہی تھیں: "وہ ہماری زندگی میں سمانے کے لیے ہی ہماری زندگی میں آیا تھا —— ہو سکتا ہے۔" یاسمین بولی نہیں وہ نہیں مرا، وہ اب بھی آئے گا اور فائر سکرین کے پاس بیٹھ کر ماؤتھ آرگن سنائے گا۔"
اور یاسمین مسکرا کر اپنے ہونٹ لپ اسٹک سے سُرخ کرنے لگی۔

کپاس کا دِل

پہلے بیبی اور پھر منّی جب انھوں نے میرے حسین خوابوں کو چور چور کر دیا۔ تو مجھے یُوں محسوس ہُوا۔ جیسے زندگی ہمارے حسین خوابوں کی لاشوں پر بنی ہُوئی ایک ایسی عمارت ہے۔ جس کی آخری منزل پر موت کھڑی مُسکرا رہی ہے۔ اور ہمارے خدا نے ہمیں صرف اس لیے زندگی عطا کی ہے۔ کہ ہم آخری منزل پر پہنچتے پہنچتے کئی مرتبہ پھسل جائیں۔ پہلے اپنے جذبات اور احساسات کے عزرائیلوں سے ملیں۔ اور پھر جب ہمارے ذہن کو کچلتے کچلتے یہ عزرائیل شرما جائیں تو وہ ہمیں بڑے اطمینان سے آخری منزل کی طرف دھکیل دیں۔ جہاں حیات کا عزرائیل ہمیں اپنے خوشنما لیکن ایک نامعلوم خوف کا احساس دلانے والے پردوں میں چھپا لے۔ اور پھر قبر کی مٹی میں تحلیل ہوتے ہُوئے ہم اس حیاتِ ابدی کا تجربہ کریں۔ جس کا وجود شاید نہ ہو۔

بہرحال اگر مجھے یہ معلوم ہوتا۔ کہ پیٹو کے ساتھ زندگی بِتانے کا خواب بھی کانچ کا خواب ثابت ہوگا۔ اور زندگی کے متعلق میرا نظریہ قنوطی ہو کر رہ جائے گا۔ تو میری

انتہائی کوشش یہ ہوتی۔ کہ مَیں یہ خواب نہ دیکھتا ـــــ لیکن خواب دیکھنے بھی تو اپنے بس میں نہیں ہوتے ۔ یہ تو لاشعور سے آتے ہیں ۔ اور نیند کو خوشیوں اور مسکراہٹوں سے ویران کرتے ہُوئے جانے کہاں غائب ہوجاتے جاتے ہیں ۔ صرف ان کی بے جان لاشوں پر ہماری زندگی کی عمارت بنتی رہتی ہے ۔

پنٹو کے آخری ٹیلیفون کے بعد جانے کیوں ایک ویران سی اداسی نے میری رُوح اور میرے دل کو محیط کرلیا تھا ـــــ شاید احساسِ کمتری کے باعث مجھے اپنے اکیلے پن کا احساس شدید سے شدید تر ہوگیا تھا ۔ کہ مجھ ایسے اِنسان کے ساتھ کوئی لڑکی بھی محبّت نہیں کرسکتی ۔ ایک ایسا انسان جس کا قد بہت چھوٹا ہے ۔ اور جو موٹے موٹے شیشوں کی عینک لگاتا ہے ۔ اور جس کے سر کے بال ٹائیفائیڈ کے باعث غائب ہوتے جا رہے ہیں ـــــ میرے پاس جسمانی خوبصورتی نہیں ۔ لیکن لائیڈز بنک میں میرا حساب تو تھا ـــــ اور سیمی ، منی ، پنٹو بھی تو ایسی لڑکیاں تھیں ۔ جن کے والدین کا اکاؤنٹ لائیڈز کے علاوہ گرنڈلے بنک میں تھا ۔ لیکن ان کے پاس جسمانی خوبصورتی بھی تو تھی ۔ ان تمام حقائق کے باوجود جانے میری فطرت محبّت کی پیاسی کیوں تھی ۔ زُلفی کا خیال تھا ۔ کہ مَیں ایسے انسانوں میں سے ہُوں ۔ جو دو ایک مرتبہ لڑکیوں سے فریب کھانے کے بعد لڑکی کی محبت کو زندگی کی ڈھال بناتے ہیں ۔ بڑے سے بڑے خطرے کا مقابلہ کرتے ہیں ۔ اور اس لڑکی کی خاطر بڑے آدمی بننے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے اور اکثر بہترین لیکن "ماڈرن" آرٹسٹ بن جاتے ہیں ۔ اور اگر ایسا نہیں ہوتا ، تو انھیں خود بھی پتہ نہیں چلتا ۔ کہ وہ زندہ ہیں یا مردہ ـــــ میرے متعلق شاید زُلفی کا مشاہدہ عمیق تھا ۔

جب میری اُداس خاموشی سے زُلفی بور ہوکر پریشان ہوگیا ۔ تو اُس نے مجھے مشورہ دیا ، کہ مَیں اس کی زمینوں پر چلا جاؤں ، وہاں دیہاتی زندگی کو "ماڈرن تکنیک" میں پینٹ کروں ۔ ممکن ہے ہنگاموں سے دُور میرا دِل بہل جائے ۔

وہ خود تو کسی سرکاری امتحان کی تیاری میں مشغول تھا۔ اس لیے میرے ساتھ نہ آسکا۔ مَیں اس کی زمینوں پہ پہلی مرتبہ جا رہا تھا۔ سارا راستہ ریل گاڑی میں بھی اور بیل گاڑی میں بھی رہ رہ کر ایک خیال مجھے تنگ کر رہا تھا۔ کہ جانے مَیں وہاں رہ بھی سکوں گا یا نہیں۔ خدا معلوم وہاں کا ماحول کیسا ہو۔ لیکن جب مَیں وہاں پہنچا تو مجھے یُوں محسوس ہُوا۔ جیسے مَیں بھول کر کسی ماؤنٹ اولمپیا پر پہنچ گیا ہُوں۔ جہاں میری حیثیت بالکل جو پیٹر دیوتا ایسی ہے ——— تاج سرور کی مختصر سی آبادی میری پرستش پر تُلی ہُوئی تھی۔

زُلفی نے اپنے ذوق کے مطابق ایک چھوٹا سا خوبصورت گھر بنوایا تھا۔ شیشم اور نیم کے درختوں میں گھری ہُوئی یہ عمارت یُوں معلوم ہوتی تھی جیسے بَونوں کی با تصویر کہانیوں میں چھپا ہُوا مکان نکل کر تاج سرور میں آگیا ہے۔ اس مکان میں باقاعدہ بیڈ روم، ڈرائینگ روم اور سٹڈی روم بھی تھے۔ میرا جی چاہتا تھا۔ کہ ایسی کوٹھی کے بجائے مٹی کا گھر ہوتا۔ تاکہ مَیں مخصوص دیہاتی زندگی بسر کرتا۔ لیکن زُلفی کی عقلمندی کا قائل مَیں اس وقت ہُوا۔ جب اس کے منشی صاحب سے ملنے اِن کے ہاں گیا تھا۔ اور لاتعداد مکھیوں نے میرا سواگت کیا تھا۔ ان کے بتانے پر مجھے معلوم ہُوا۔ کہ گاؤں کے ایسے مکانوں میں آدمی کم ہوتے ہیں اور مکھیاں زیادہ۔

میرے جانے کے بعد دو ایک دن تک چاروں طرف سے لوسن، چٹالا اور کپاس کے کھیتوں میں گھری درختوں کے دامن میں چھپی اس عمارت میں زمینوں کے ملازموں کے علاوہ اور دوسرے دیہاتی بھی اپنے "سید بادشاہ" یعنی مجھ سے ملنے کے لیے آتے رہے، میرے پَیر اور گھٹنے چھُو کر آنکھوں کو لگانے کے بعد باہر باغیچے میں میرے گرد نصف دائرے کی شکل میں یُوں بیٹھ جاتے۔ جیسے مَیں ابھی آگ کو گلزار بنادوں گا۔ کسی دریائے نیل پہ عصا پھینک کر پُل بنادوں گا۔ یا قم باذن اللہ کہہ کر کسی

قبر سے جیتا جاگتا انسان برآمد کروں گا۔

وہاں کے نوکر کھیتوں کو جانے سے پہلے ہر صبح مجھے سلام کرنے آتے۔ میرا چہرہ دیکھنا وہ اچھا شگون سمجھتے تھے۔ شام کے وقت سب نوکر میرے پاس باہر باغیچے میں آ بیٹھتے۔ حقوں کی گڑگڑاہٹ میں دُنیا بھر کے قہقہے گونجتے۔ سجوارے کی باتوں پر کریم۔ سُلطان اور بابا روشن خاص طور پر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ سجوارا اپنے تحصیل دار کی نقلیں اتارتا۔ تو سب محسوس کرتے کہ وہ بہت تنگ کرنے والے تحصیل دار سے بدلہ لے رہے ہیں۔ اگرچہ تحصیل دار کا تعلق براہِ راست ذُلفی سے تھا۔ لیکن پھر بھی وہ سب لوگ ذُلفی کی خاطر جان دینے سے دریغ نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ ذلفی نے انھیں احساس دلا دیا تھا۔ کہ اِن زمینوں کا مالک صرف ذُلفی ہی نہیں بلکہ ہر وہ آدمی ہے۔ جو ان زمینوں کو اپنے پسینے سے سینچتا ہے۔

مَیں باتوں ہی باتوں میں اپنے گلے سے "سید بادشاہ" کا طوق گلے سے اتارنے کی بہت کوشش کرتا تھا کیونکہ ان کے رویّے سے مجھے شرمندگی سی محسوس ہوتی تھی مجھے پسند کرنے کے باوجود سجوارا میرے اس نظریّے کا سختی سے مخالف تھا۔ وہ اپنے عقیدے پر سختی سے پابند تھا۔ کہ دُنیا اور آخرت میں سُکھ پانے کا ذریعہ صرف سید بادشاہ ہیں۔ اور اس سلسلے میں سجوارا کے اندازِ گفتگو سے محسوس ہوتا تھا۔ کہ سیّد ہونے کے باوجود اگر مَیں اس کے عقیدے کو جھٹلاؤں گا۔ تو وہ یقیناً مجھے بھی کلہاڑی سے قتل کرنے سے گریز نہیں کرے گا ـــــ وہ لوگ مجھے بے حد عزیز تھے۔ اور مجھے اپنی جان بھی پیاری تھی۔ اس لیے خاموش ہو رہا۔

سجوارا ایک عجیب و غریب قسم کا انسان تھا۔ وہ عجیب بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ غریب۔ وہاں کے تمام باسیوں میں اُسی کی شخصیت نے مجھے اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔

اس کا جسم بالکل کپاس کے پودے کے مانند کھُردرا تھا۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ہر وقت زعفران کے کھیت جھومتے تھے۔ اس کے پچکے ہُوئے گالوں کے ساتھ لپٹے ہُوئے موٹے موٹے ہونٹوں پر لہراتی ہُوئی بڑی خوفناک مونچھوں کا بسیرا تھا۔ روشن چاچا کا خیال تھا۔ کہ سجوارے نے مونچھیں نہیں رکھیں بلکہ مونچھوں نے سجوارے کو رکھا ہے۔ روشن چاچا کا یہ خیال حقیقت سے بہت دُور تھا۔ کیوں کہ مجھے تو یُوں محسوس ہوتا تھا۔ جیسے منشی صاحب کے السیشن کتّوں کی دُمیں کاٹ کر اُس کے ہونٹوں کے اوپر چپکا دی گئی ہیں ــــــ سجوارا کچھ اسی قسم کا جانور تھا۔ کہ جس کی دُم اپنے مالک کے سوا اور کسی کے لیے نہیں ہلتی تھی ــــــ روشن چاچا اور دوسروں کا خیال تھا۔ کہ وہ دیوانہ ہے۔ کیونکہ آج تک کسی نے اُس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ وہ ہر وقت ہنستا رہتا تھا۔ اس کے اپنے قول کے مطابق اس کا دِل بہت ہی دُکھوں کا گہوارہ تھا۔ مگر کسی نے آج تک اُسے اُداس نہیں دیکھا تھا ــــــ بابا دارا کہتا تھا۔ کہ رات کے وقت اپنی بیوی کے گھٹنوں سے لگ کر روتا ہے۔ لیکن روشن چاچا نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی ہنساتا رہتا ہے۔ وہ اس طرح کہ رات گئے روشن چاچا بابا دارا کو لے کر اس کی کوٹھری کے باہر لے گیا۔ انھوں نے دروازے کے ساتھ کان لگا کر سُنا اندر سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آواز آرہی تھی۔

سجوارا انتہائی اُونچی آواز سے باتیں کرتا تھا۔ باتیں کرتے وقت اس کا مُنہ لٹک سا جاتا۔ اور اس کے مُنہ سے جھاگ اڑ اڑ کر مونچھوں کو سیراب کرتے رہتے۔ اور اگر اتفاقاً کسی وقت اس کا مُنہ بند ہوتا تو لعاب کی ایک پتلی سی لکیر اس کے ہونٹوں کے درمیان جمی رہتی جسے کبھی کبھی وہ اپنی قمیض کے کف سے پونچھ لیتا ــــــ لیکن ایسا بہت کم ہوتا کہ وہ خاموش ہو۔ فصل کاٹتے وقت اس کے آس پاس اگر کوئی نہ ہوتا۔ تو وہ اپنی درانتی سے گفتگو کرتا۔ فصلوں کے ساتھ باتیں کرتا ہُوا ہنستا رہتا۔ اس کے چہرے پر

بیک وقت اجنبیت اور مانوسی کا ایک عجیب سا امتزاج رہتا تھا جسے محسوس نہ کرنے کے باعث منشی صاحب کے اسٹیشن کتے اکثر بھونکتے ہوئے اس پر لوگوں کو کاٹنے کا ریہرسل کیا کرتے تھے۔ اور پھر پہچان لینے کے بعد اس سے یوں گلے ملتے جیسے برسوں سے بچھڑا ہوا بھائی گھر لوٹ آیا ہے۔

مَیں نے کئی مرتبہ روشن چاچا اور دوسروں سے پوچھا کہ سجوارا ایسا کیوں ہے۔ وہ ہمیشہ یہی کہتے کہ بچپن سے اس کے دماغ کے پیچ ڈھیلے ہیں، اسی لیے وہ بیل گاڑی کے پہیوں کی مانند چرچراتا رہتا ہے لیکن مَیں اس جواب سے مطمئن نہ ہوسکا کیونکہ ان میں سے کسی کو اس کے ماضی کا پتہ نہ تھا۔

پھر ایک دوپہر کو سجوارا میرے ہاں آیا۔ مَیں اس وقت بیٹھا تصویر کشی کر رہا تھا مَیں نے اس کی آمد کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ میرے لیے گنّے لے کر آیا ہے۔ مَیں نے اُس سے کہا —— زمین پر دس پندرہ منٹ ٹھیر کر چلے جانا۔ آؤ میرے پاس بیٹھو۔ اکٹھے گنّے چوستے ہیں۔ پہلے تو وہ نہ مانا پھر میرے مجبور کرنے پر اُس نے دو گنّے اٹھائے اور جھجکتے ہوئے میرے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔ مَیں نے بھی پلیٹ اور برش میز پر رکھ دیے اور گنّا اٹھا کر اس کے پاس گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ گھبرا کر کچھ اس طرح سکڑنے لگا جیسے وہ سمٹ سمٹ کر ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔ مَیں نے مسکرا کر کہا۔

"سجوارے تم اس طرح کیوں محسوس کرتے ہو —— کیا مَیں انسان نہیں ہے؟"

"نہیں جی آپ تو انسان نہیں —— شاہ جی آپ تو فرشتہ ہیں" اور پھر جانے ہم کیوں ہنس دیے مَیں نے اس سے کہا۔

"سجوارے تم نے ایک مرتبہ ذکر کیا تھا تمھارے سینے میں بھی دُکھوں کا بسیرا ہے۔ وہ کون سے دُکھ ہیں سجوارے —— ؟ کیا تم ایسا انسان بھی دُکھی ہو سکتا ہے؟" —— جانے کیوں میرے اپنے دکھ میرے سینے میں اُمڈ آئے تھے۔ اس نے ہنستے ہوئے کئی

لطیفوں کے ساتھ مجھے اپنے ماضی کا خلاصہ سنا دیا۔

سجوارے کا وجود بالکل کپاس کے مانند کھُردرا تھا۔ لیکن کپاس کا یہ پودا بانجھ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ کومل رُوئی بھی کھلتی تھی۔ اس کا دِل بالکل رُوئی تھا —— شاید اسی وجہ سے اس کے دِل نے حالات کی آگ کو بہت جلد قبول کر لیا تھا۔ جانے اس آگ نے اس کے ہونٹوں کو مسکراہٹیں کیوں بخشیں تھیں۔ شاید اس لیے کہ بہت سارے دُکھ مِل کر انسان کو گدگدی کرتے ہیں اور وہ ہنستا رہتا ہے۔

سجوارے کو اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی۔ لیکن جہاں وہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ماں باپ اس لڑکی کے سخت مخالف تھے۔ اس کی ماں کے کہنے کے مطابق وہ لڑکی بہت آوارہ تھی اور اس کے تعلقات چودھری کے بڑے لڑکے کے ساتھ تھے۔ لیکن سجوارا اس بات کو نہیں مانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ماں یہ کیڑے صرف اس لیے ڈال رہی ہے کہ وہ اس کی بھانجی سے شادی کرے سجوارا اپنی ماں کی بھانجی سے شادی تو کر لیتا لیکن اس کو اس سے محبت نہیں تھی۔ لیکن وہ لڑکی بھینگی بھی تھی۔ اس کی ماں کے نزدیک یہ کوئی خامی نہ تھی۔ کیونکہ اس کے باپ کی زمین کافی تھی۔ صرف زمین کی خاطر سجوارا ان شاموں کو فراموش نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جو اس نے غلام فاطمہ کے ساتھ گزاری تھیں۔ وہ غلام فاطمہ جو سجوارے کے چوڑے چکلے سینے پر سر رکھ کر اس کے بازوؤں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کے جسم کی مضبوطی کی تعریف کیا کرتی تھی۔ غلام فاطمہ کا خیال تھا۔ کہ سجوارا اگر بھینسے سے بھی لڑے تو اسے گردن دبا کر مار سکتا ہے (سجوارے نے مجھے بتایا تھا۔ کہ وہ واقعی اتنا مضبوط اور طاقتور تھا لیکن غلام فاطمہ کے دِیئے ہوئے دُکھوں کے باعث اب وہ آدھا بھی نہیں رہا تھا) جس شام اس نے اپنی ماں سے صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اس بھینگی کے ساتھ شادی نہیں کرائے گا۔ اسی شام اس کی ماں کے سر میں درد ہو کر بخار ہو گیا۔ لیکن سجوارا اپنی ماں کے

ساتھ محبت کے باوجود اپنی بات پر اڑا رہا۔ کیونکہ اُسے اپنے الفاظ کے مطابق غلام فاطمہ کے ساتھ عشق تھا اور اسے شادی کا قول دے چکا تھا۔ اس کا باپ بھی غلام فاطمہ کو بہو نہیں بنانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ بہت غریب تھے۔ لیکن جب اس نے اپنی محبوبہ کے ساتھ شادی کی تو اس کے باپ نے اپنی تھوڑی بہت زمین سے بھی محروم کر دیا۔ شادی کے دوسرے تیسرے روز اس کی ماں فوت ہو گئی لڑکی کے والدین چونکہ بہت غریب تھے اس لیے انھوں نے سجوارے کو بصد خوشی قبول کر لیا۔ اسے اپنی وراثت کی زمین کے جانے کا کوئی صدمہ نہیں تھا۔ اسے صدمہ تھا تو اپنی ماں کی موت کا، جس کی زندگی کسی کی جائداد نہیں تھی جو کسی کے ورثے میں آ سکتی۔ شادی کے بعد کچھ دیر تو وہ اپنے سسر کے ہاں رہا۔ لیکن پھر اس کی غیرت نے جوش مارا اور نوکری کی تلاش میں نکل پڑا۔ دو ایک دن خاک پھانکنے کے بعد زلفی کے ہاں اسے ملازمت مل گئی۔ وہ اپنی بیوی کو بھی وہیں لے آیا ـــــ چونکہ ایک تو اسے چودھری کے لڑکے پر واقعی شک سا ہونے لگا تھا۔ دوسرے زلفی کا گھر وہاں سے بہت دُور تھا۔ اور اس وقت سجوارا ایک لحظہ بھی اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں سجوارے نے تفصیلات میں جانے سے گریز کیا اور میں نے بھی زیادہ پوچھنا کچھ مناسب نہ سمجھا ـــــ اس کی شادی کا تیسرا سال ہونے کو آیا تھا لیکن غلام فاطمہ کی گود ہری نہیں ہوئی تھی۔ اس وجہ سے وہ ہر وقت سجوارے کو کوستی رہتی تھی ـــــ سجوارے نے کئی مرتبہ اسے سمجھایا کہ خدا کی بندی ایسا اکثر ہو جایا کرتا ہے کہ بچے دیر سے پیدا ہوتے ہیں۔ لیکن غلام فاطمہ اُسے ہر وقت کوستی رہتی۔ سجوارا اس معاملے میں خود کو ہی قصوروار گردانتا تھا اسے اس بات کا بھی صدمہ تھا کہ وہ اپنی بیوی کو ابھی تک سونے کے زیور نہیں پہنا سکا تھا۔ اور غلام فاطمہ سارا دن سجوارے کو گالیاں دیتی رہتی لیکن سجوارا اپنی حیثیت سمجھتے ہوئے اُس کی گالیوں کو ہنسی میں اڑا دیتا تھا۔ میں نے وِشن چاچا

سے سجوارے کی بیوی کی خوبصورتی کی تعریف بہت دفعہ سُنی۔ ٹیوب ویل اور ٹریکٹروں کا مستری محمد حسین جب بھی اس کی بیوی کا ذکر کرتا۔ تو اس کے مُنہ سے رال ٹپکنے لگتی۔ اور اس کی باتوں سے صاف پتہ چل جاتا کہ انگور کھٹے ہیں۔ مستری محمد حسین کنوارا تھا۔ اس نے غلام فاطمہ کی خوبصورتی اور جوانی کو اپنے مضبوط بازوؤں کے جال میں لانے کی بہت کوشش کی۔ لیکن غلام فاطمہ سجوارے کے بازوؤں کی جکڑ نہ بھُولی تھی۔ اور بابا دارا کے کہنے کے مطابق وہ لڑکی بہت شریف تھی۔

یہ تھے وہ مختصر سے حالات جنھوں نے سجوارے کے رُوتی ایسے دل کو انگارے بخشے تھے۔ یہ تھے وہ مختصر سے دُکھ (ممکن ہے یہ دُکھ سجوارے کو نہ سمجھنے کے باعث کسی کے نزدیک دُکھ نہ ہوں۔) جنھوں نے اس کے ہونٹوں کو کڑوی مسکراہٹیں اور کانٹے دار قہقہے عنایت کیے تھے اور اس کے ذہن میں زعفران کا کھیت اُگایا تھا۔ میں نے سجوارے کا ماضی سُن کر اس کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تو وہ میرے بہت قریب ہو گیا۔

"—— شاہ جی ہم بہت غریب لوگ تو صرف محبت کے دو بولوں کے بھُوکے ہوتے ہیں" یہ سُن کر میں نے اسے سینے سے لگانا چاہا۔ لیکن وہ اچھل کر دُور ہو گیا۔ جیسے میرے سینے پر الٹے چاقو گڑے ہُوئے تھے۔ میرا جی چاہتا تھا کہ میں سجوارے کی ایک ایسی تصویر بناؤں۔ جس میں دُنیا بھر کے آنسو اور قہقہے بھر دوں۔ لیکن میرے برُش میرے ذہن کا ساتھ نہ دے سکے۔

روشن چاچا اور مستری محمد حسین کی تعریفوں کے باعث مجھے سجوارے کی بیوی دیکھنے کا بہت شوق تھا لیکن وہ اپنے میکے گئی تھی۔ میں نے باتوں باتوں میں سجوارے سے اس کی بیوی کی آمد سے متعلق پوچھا۔ اس نے کہا —— "جی مرضی کی مالک ہے جب چاہے آ جائے۔"

پھر چٹالا اور توسن میں سفید اور کاسنی پھُول کھلنے لگے۔ اور کپاس کی گود سفید سفید

گالوں سے بھرنے لگی۔

سارا سارا دن عورتیں رُوئی چنتی رہتیں اور میں قریب ہی کسی جگہ تصویر کشی کرتا رہتا۔ بلکہ سچ کہوں تو عورتوں کے جسموں کے تناسب دیکھتا رہتا تھا۔ ان کے نزدیک جانے کی مجھ میں ہمت نہ تھی۔ مبادا وہ گندم کے کھیتوں میں چڑیلوں کی مانند اڑنہ جائیں۔ اور مجھے یہ بھی ڈر تھا۔ کہ کہیں میرے سیدپن کے وقار کو ٹھیس نہ پہنچے۔ اور وہ لوگ کہیں مجھے جوتے مار مار کر وہاں سے نکال نہ دیں۔

پھر میں نے محسوس کیا کہ ایک لڑکی ہمیشہ مخالف سمت سے کپاس چنتی ہے اس کا منہ میری طرف ہوتا ہے شاید میری متوجہ کرنے کے لیے وہ بہت اونچی باتیں کرتی ہے اور غالباً میری طرف دیکھ کر بار بار مسکراتی بھی ہے —— میں ہندوستانی فلموں کا ہیرو نہیں بننا چاہتا تھا جو گاؤں میں اگر کسی نہ کسی لڑکی پر عاشق ہو جاتے ہیں لیکن پھر بھی نہ جانے کیوں ہر وقت میری آنکھوں میں اس لڑکی کے زرد دوپٹے کا آنچل جھولنے لگا۔

میں نے کئی مرتبہ شعوری طور پر اس آنچل کو اپنی آنکھوں سے نکالنے کی کوشش کی مبادا یہ لڑکی، سیمی، منّی یا پینو ہو —— لیکن پھر میں سوچتا کہ کھیتوں میں اور کوالتار کی سڑکوں میں بہت فرق ہے۔

میرا دل بہت چاہتا تھا کہ اس زرد دوپٹے کو اپنے گرد لپیٹ لوں اور اس کی گود میں دفن ہو جاؤں۔ لیکن میرے جذبات میری اس خواہش میں حرکت پیدا کرنے سے قاصر تھے۔

پھر ایک روز منشی صاحب میرے پاس آئے اور کہنے لگے کہ دن ڈھلے جب عورتیں ان کے گھر رُوئی جمع کرانے اور اپنا حصّہ لینے آتی ہیں تو بڑا اچھا منظر ہوتا ہے۔ آپ آرٹسٹ ہیں۔ ان کی تصویر بنایئے۔ میں نے سوچا ممکن ہے میں زرد دوپٹے والی لڑکی کو بہت قریب سے دیکھ سکوں۔ چنانچہ میں نے ان کی دعوت منظور کر لی۔

دوسرے دِن مَیں اپنی پنسل اور سکیچ بُک لے کر منشی صاحب کے ہاں پہنچ گیا۔ عورتیں ابھی تک نہیں آئی تھیں۔ مَیں مکان کی چھت پر چلا گیا اور اپنے ذہن میں اس کی تصویر بنانے لگا۔ تھوڑی دیر بعد شور مچاتی ہوئی عورتیں رُوئی کی گانٹھیں سر پہ رکھے دروازے سے داخل ہوئیں۔ میری نگاہیں اس لڑکی کو ڈھونڈ رہی تھیں، پھر سب سے آخر میں زرد آنچل دروازے میں لہرایا اور وہ سب سے الگ تھلگ بیٹھ گئی۔ وہ میرے ذہن کی تصویر سے کہیں مختلف تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے یُوں محسوس ہُوا، جیسے رافیل کی کوئی میڈونا دیہاتی کاسٹیوم میں وہاں آگئی ہے۔

مَیں نے اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی خاطر ایک چھوٹا سا کنکر اس کی طرف پھینکا اور دو کنول اس کی آنکھوں میں ڈوب گئے۔ وہ تمام عرصہ میری طرف دیکھ دیکھ کر مُسکراتی رہی۔

سُورج دُور شیشم کے درختوں کے پیچھے چھپ گیا سب عورتیں چلی گئیں اور میرا دِل ڈوبنے لگا کہ اپنے حصّے کی رُوئی لینے کے بعد وہ بھی چلی جائے گی۔ رافیل کی میڈونا میری آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی۔ پھر پینٹنگ میں تبدیل ہو جائے گی۔ لیکن اس نے اپنی چھوٹی سی گٹھڑی ایک کونے میں رکھ دی۔ اور باورچی خانے میں آٹا گوندھنے لگی۔ مَیں کسی بہانے سے باورچی خانے میں آگیا اور وہ شرما سی گئی۔ مَیں نے اس سے نام پوچھا۔ اس کا نام گومی تھا۔ مَیں نے اس سے کہا کہ خشک کنوئیں کے قریب جو کیکر کا ٹھنٹھ ہے وہاں مجھے صبح ملے۔ اس نے کہا اگر کسی نے دیکھ لیا تو ——؟ مَیں نے کہا کہ کہہ دوں گا کہ تصویر بنا رہا تھا۔ اگرچہ یہ جواز بڑا سطحی سا تھا۔ لیکن وہ مطمئن ہو گئی۔

اگلی صبح وہ مجھے ملی۔ اس نے مجھے بتایا کہ کتنے ہی دِنوں سے وہ مجھے دیکھتی رہی ہے۔ اور مَیں اُسے بہت اچھا لگتا ہُوں۔

گومی ہر روز مجھے اس کیکر کے ٹھنٹھ کے پاس ملنے لگی۔ اور بعض وقت موقع دیکھ

کر میرے گھر بھی آجاتی۔ گومی کون تھی اور کہاں رہتی تھی۔ مجھے یہ جاننے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ کیونکہ اس کو مجھ سے محبت تھی اور مجھے اس سے گومی نے میری کائنات مکمل کر دی تھی۔ اور مَیں اپنے آپ کو دُنیا کا خوش قسمت ترین انسان خیال کرتا تھا۔

مَیں نے زلفی کو خط کے ذریعہ گومی سے متعلقہ حالات سے آگاہ کیا تو اس کا لعنتوں ملامتوں بھرا جواب آیا کہ یہاں بھی محبت کی دیوی نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔

یہاں مَیں نے سُنا تھا۔ کہ لڑکیوں کے والدین لڑکوں سے دو ایک سو روپے لے کر اپنی بیٹی کی شادی کر دیتے ہیں۔ مَیں نے سوچا ممکن ہے گومی کے والدین بھی اسی طرح اسے بیچ دیں۔ اور میری زندگی کی عمارت کی بنیادوں میں ایک اور لاش کا اضافہ ہو جائے۔

مَیں گومی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ اور سیمی ٹُنی، پینو کو مدعو کر کے انھیں بتانا چاہتا تھا کہ —— تم نے اپنی تعلیم کے باوجود مجھے دھوکا دیا۔ تمھارے شہری پن نے تمھاری وفا تم سے چھین لی۔ تم کسی کی نہیں ہو سکتیں کیونکہ تم کولتار کی سڑک ہو —— آؤ مَیں تمھیں گومی سے ملاؤں۔ جو محض میرے لیے مجھ سے محبت کرتی ہے۔ جو صرف میرے لیے زندہ ہے —— لیکن نہیں تمھارا قصور نہیں یہ تو اس ماحول کا قصور ہے جس سے تمھارا خمیر اُٹھا ہے ——

پھر ایک صبح مَیں نے گومی سے شادی کے لیے کہا۔

"آپ مجھے سونا پہنائیں گے نا ——"

"گومی مَیں تمھیں سونے میں تول دوں گا" اور گومی کی آنکھیں خوشی سے سونے کی مانند چمکنے لگیں۔

مَیں نے کہا کہ مَیں اس سلسلے میں تمھارے والدین سے ملنا چاہتا ہوں تو اس نے بتایا کہ اس کے والدین اُسے شادی کی اجازت نہیں دیں گے۔ "اگر مَیں چاہوں تو اسے اپنے ساتھ بھگا کر لے جا سکتا ہوں۔ یہ کہہ کر وہ رُوتی چننے کے لیے چلی گئی۔

میں شادی اور اغوا کے مخمصے میں اُلجھا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔ کہ راستے میں مستری محمد حسین مل گیا۔ اس نے ایک عجیب انداز سے کہا۔

"آپ سجوارے کی بیوی سے کیا بات چیت کر رہے تھے ——؟"

"سجوارے کی بیوی —— ؟ گومی —— ؟" مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے مستری محمد حسین نے جلتے ہوئے موبل آئیل کا ڈرم میرے کانوں میں انڈیل دیا ہے۔ اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ پھیل گئی —— "وہ جی سجوارے کی بیوی گومی —— غلام فاطمہ"۔

"کچھ نہیں —— کچھ نہیں —— میں —— تو ——"

اور مستری محمد حسین چلا گیا۔ میں نے سوچا کم از کم گومی کو تو سیمی، منی اور پپو کا ضمیمہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔

شام کے وقت گومی مجھے ملنے آئی تو میں برس پڑا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سنتی رہی۔ اور جب میں چپ ہو گیا۔ تو اس نے کہا۔

"شاہ جی —— میں نے تو آپ سے یہ بات صرف اس لیے چھپائی تھی۔ کہ آپ کو مجھ سے عشق ہے۔ اگر آپ کو بتا دیتی تو آپ کو بہت دکھ ہوتا۔ میں آپ کا دل توڑنا نہیں چاہتی تھی۔ کیونکہ آپ کا دل میرا دل ہے —— شاہ جی آپ کی قسم ہم ایک دوسرے سے بہت دکھی ہیں —— وہ آج کل ہر وقت مجھے اس لیے کوستا رہتا ہے کہ میں اس کے لیے بچہ کیوں نہیں پیدا کرتی۔ میں ہر وقت کڑھتی رہتی ہوں۔ کم بخت طلاق کا رعب مجھے بھی دینے لگا ہے —— آج تک سونا ہی پہنایا ہے نہ ریشمی کپڑے سلا کر دیے ہیں —— مجھے آپ سے عشق ہے۔ مجھے اپنا بنا لیجیے ورنہ مر جاؤں گی —— شاہ جی —— شاہ جی ——"

اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبل پڑے۔ اور میں ان میں ڈوب ڈوب

گیا۔ مجھے سجوارے پر بہت غصہ آیا کہ مجھ سے کہتا ہے کہ غلام فاطمہ یعنی گومی کی خاطر اس نے اپنی ماں کی موت بھی گوارا کر لی۔ لیکن اس کے ساتھ سلوک اتنا ظالمانہ ہے گومی کے جانے کے بعد مَیں نے اسی وقت سجوارے کو بلایا اور اس سے ساری بات کہی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے میری ٹانگیں دباتے ہوئے کہا۔

"شاہ جی۔ وہ تو یونہی بکتی ہے مجھے اب بھی اس سے عشق ہے"

پھر مَیں نے بڑی ڈھٹائی سے اس کی محبت کی پروا نہ کرتے ہوئے کہا ——

"سجوارے تو اسے طلاق دے دے مَیں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں"

میری ٹانگیں دباتے دباتے اس کے ہاتھ جم کر رہ گئے —— "جی ——؟"

اُس کا مُنہ کھلا کا کھلا رہ گیا، اور مُنہ سے لعاب نکلنے لگا مَیں خاموش تھا۔

سجوارا ابھی خاموش تھا۔ اس کی مونچھیں ڈرے ہوئے کُتّے کی دُم کی طرح دبی ہوئی تھیں۔

مَیں نے بڑی مشکل سے دُنیا بھر کی خودغرضیوں کو سمیٹتے ہوئے کہا —— "ہاں سجوارے مَیں اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا"

اس نے کچھ دیر سوچنے کے بعد مُسکراتے ہوئے کہا —— "آپ سید بادشاہ ہیں —— آپ کو انکار کر کے دوزخ مول لینی ہے —— آج ہی حرام ہے اگر اُس کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھوں —— ویسے ——"

"ویسے کیا ——؟"

اس نے گھبرا کر کہا —— "جی کچھ نہیں —— کچھ بھی تو نہیں"

سجوارے نے اس حقیقت کا قطعاً انکار نہ ہونے دیا۔ کہ مَیں اس کے دِل پر درانتی چلا رہا ہوں۔ —— اور مَیں بھی یہ بھول چکا تھا۔ کہ سجوارا دُنیا کا سب سے قابلِ رحم انسان ہے۔ مَیں نے اس سے کہا کہ مَیں کل تیرے گھر آ کر گومی کو لے آؤں گا ——

—— تھوڑی دیر بعد وہ چلا گیا۔

دوسری صبح کسی کے زور سے دروازہ کھٹکھٹانے کے باعث میری آنکھ کھل گئی۔ مَیں نے دروازہ کھولا تو روشن چاچا کھڑا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی تیزی سے کہا —— "شاہ جی ادھر چل کے دیکھیے کیا ہوگیا ہے —— سجوارا پاگل ہوگیا ہے اس نے۔ اس نے رات پچھلے پہر گومی کو کلہاڑی مار کے قتل کر دیا ہے —— ہمیں ابھی ابھی پتہ چلا ہے۔" میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔

مَیں بھاگا ہُوا منشی صاحب کے گھر کے قریب سجوارے کی کوٹھڑی میں گیا۔ باہر سارے نوکر جمع تھے۔ سب کے چہرے لٹکے ہُوئے تھے۔ اور مستری محمد حسین ایک طرف کھڑا دانتوں تلے زبان چبا رہا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی سجوارا میری طرف آیا۔ اس کے ہونٹوں اور ہاتھوں پر خون جما ہُوا تھا جیسے وہ گومی کو چومتا رہا تھا۔ اس نے ہنستے ہُوئے زور سے کہا۔

"شاہ جی —— مَیں نے جنت خرید لی ہے۔"

"یہ تم نے کیا کر دیا سجوارے؟"

اس نے چارپائی کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا —— "کچھ نہیں شاہ جی —— اسی سے پوچھیے —— "اس کے مُنہ سے جھاگ نکل نکل کر اس کی مونچھوں میں اٹکنے لگے۔ اس نے چارپائی سے کپڑا اٹھایا مَیں نے دیکھا۔ کہ تیز کلہاڑی نے گومی کی گردن کاٹ کر رکھ دی تھی۔ مَیں کچھ نہ سمجھ سکا۔

"شاہ جی مَیں نے تو پہلے ہی کہنا چاہا تھا۔ کہ یہ آپ کے قابل نہیں —— جس طرح اس نے مجھے دیوانہ بنا چھوڑا تھا۔ اسی طرح خدانخواستہ آپ کو بھی پاگل بنا دیتی۔ —— لیکن مَیں سید بادشاہ کا کہا کس طرح رد کر سکتا تھا آپ کی خوشی میری خوشی ہے۔"

مَیں نے چیخ کر کہا —— "سجوارے تُو نے اسے قتل کیوں کیا؟"

مَیں نے پہلی مرتبہ سجوارے کی آنکھوں میں آنسو دیکھے تھے ــــ کپاس کا دل رو دیا تھا۔ اس نے کانپتے ہُوئے ہاتھوں سے گومی کے سرہانے سے ایک پوٹلی اُٹھا کر مستری محمد حسین کے ہاتھوں میں تھما دی۔ اور پوٹلی سے جھانکتے ہُوئے زیور دیکھ کر اس کا منہ پاگل قہقہے اگلنے لگا۔

ہنستے ہنستے کپاس کے دِل سے برسات اُمڈ آئی ــــ اور اس کی مونچھیں بالکل اسی طرح زور زور سے ہل رہی تھیں، جیسے منشی صاحب کے السیشن کُتّے وفاداری کے اظہار کے لیے دُم ہلایا کرتے تھے۔

گومی کی چارپائی کے ساتھ لپٹ کر روتے ہُوتے سجوارے کو اور سوتی ہوئی گومی کو دیکھ کر ایک بار پھر مجھے محسوس ہُوا۔ جیسے زندگی ہمارے حسین خوابوں کی لاشوں پہ بنی ہُوئی ایک ایسی عمارت ہے۔ جس کی آخری منزل پر موت کھڑی مُسکرا رہی ہے......

پیارے جمّی

۲۷ نومبر ۱۹۴۴ء

پیارے جمّی ! اس وقت سرد آسمان پر جڑے ہوئے ستاروں کی آنکھیں پتھرا رہی ہیں اور باغ میں یوکلپٹس کے درختوں نے کہرے کا لباس پہن لیا ہے۔

بینا ابھی رو رو کے سوئی ہے۔ امّی جی اور گڈو بھی اپنے بستروں میں چلی گئی ہیں اور وہاں میرا بستر بھی مجھ اکیلی کا انتظار کر رہا ہے۔

تمہیں یاد ہے نا، کہ آج ہماری شادی کی دوسری سالگرہ ہے پہلی سالگرہ پر تم یہاں تھے تو کتنا مزہ آیا تھا۔ ہم سب کتنے خوش تھے لیکن آج گھر میں کچھ ایسی خاموشی چھائی رہی جیسے محاذ پر بمباری سے پہلے چھا جاتی ہے۔ ہم سب چُپ چُپ سے تھے۔ ہوائی حملے سے لوٹے ہوئے جہاز کی طرح خالی خالی۔

تمہارے کمرے میں آگ روشن ہے۔ میں تمہارے صوفے پر بیٹھی ہوں اور تم سامنے مینٹل پیس پر پڑی تصویر میں مسکرا رہے ہو، تمہاری پی کیپ پر لگا ہوا تاج اور

تمہارے سینے پر تمغے دیکھ کر میرا سر فخر سے اونچا ہو گیا ہے۔ سونے والے کمرے میں بھی آگ جل رہی ہے اور میری طرح امی جی اور گڈو بھی تمہارے شریر سے مسکراتے چہرے کو آنکھوں میں لیے سونے کی کوشش کر رہی ہیں۔ گڈو نے ابھی مجھ سے کہا تھا کہ بھابی، جمی بھائی جان کہہ گئے تھے کہ میں کسی وقت چپکے سے آ جاؤں گا اور تمہارے لیے مزیدار ٹافیاں اور چاکلیٹ لاؤں گا اور وہ میرے سوتے ہوئے آ گئے تو مجھے جگا دیجیے گا۔ امی جی حسبِ معمول تمہاری میز پر تھرموس میں گرم گرم اوولٹین رکھ گئی ہیں اور مجھے ہر روز کی طرح ہدایت کرنا نہیں بھولیں کہ جمی آئے گا جمی آئے گا تو اسے کافی کی بجائے اوولٹین پلانا۔ کافی اس کی صحت کو نقصان پہنچائے گی جب وہ آئے گا تو مجھے اسی وقت نہ بتانا، مبادا میری دھڑکن بند ہو جائے اور میں اپنے پیارے بیٹے کو دیکھ بھی نہ سکوں —— گڈو ہر روز اپنے پیارے بھائی جان اور ان کے تحفوں کے انتظار میں سو جاتی ہے۔ امی کا سرد سینہ تمہارے لمس سے حدت حاصل کرنے کی آرزو میں لحاف میں ٹھٹھرتا رہتا ہے اور میں ——، میں نے ہر رات آتشدان میں جلتی ہوئی آگ میں راکھ کر دی ہے، پھر دن ننھا بیٹی کے ساتھ پائلٹ ابا کی باتیں کر کر کے رات کے انتظار میں گزار دیا ہے تاکہ تمہاری مینٹل پیس پر فریم شدہ مسکراہٹ کو اپنے ہونٹوں پہ پھیلا کر رات کو آتشدان میں اتار دوں۔

ہم سب سارا دن بے حد خوش رہتے ہیں اور جب کبھی ہم یک دم اداس سے ہو جاتے ہیں تو امی جی برقعہ اوڑھ کر حضرت علی ہجویریؒ کے مزار پر تمہارے لیے دعا مانگنے چلی جاتی ہیں۔ گڈو، نماز کا وقت نہ ہونے کے باوجود نماز پڑھ کر اپنے جمی بھائی کے لیے سجدہ میں رونے لگتی ہے اور میں تمہارے بغیر تنہائی میں بیتے ہوئے دنوں کے مزار پہ دعائیں مانگنے کے بعد تمہارے محبوب شاعر ایزرا پاؤنڈ کی نظمیں لے کر

بیٹھ جاتی ہُوں جن کا مفہوم تم نے مجھے سمجھایا تھا، یا پھر نینا سے تمھاری باتیں کرنے لگتی ہُوں۔
وہ ہاتھ میں پکڑے ہُوئے ننھے سے ہوائی جہاز کو پرے پھینک کر "امی" کہنے والی گڑیا اٹھا کر مجھے یُوں دیکھنے لگتی ہے جیسے کہہ رہی ہو، امی جس کی باتیں تم ہر وقت کرتی رہتی ہو وہ کبھی آئے گا بھی یا نہیں، میں اسے یقین دلانے لگتی ہُوں ـــــ کہ نینا، تمھارے اباجی ضرور آئیں گے انھوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے۔ پھر میرا دل نامعلوم خوف سے دھڑکنے لگتا ہے اور جب مَیں تمھارے سینے پر چمکتے ہُوئے کامیابی کے تمغے دیکھتی ہُوں تو خوف ہواؤں میں تحلیل ہو جاتا ہے اور تمھارے مُسکراتے ہُوئے ہونٹ ہلنے لگتے ہیں ـــــ جنگ اب جلد ہی ختم ہو جائے گی۔ مَیں جلد ہی لوٹ آؤں گا اور پھر مَیں کبھی ہوائی جہاز کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا، مجھے یقین ہے کہ امّی اور گڈو کی دُعائیں رائیگاں نہیں جائیں گی۔ ہم نے آج تک جو بھی اس سے مانگا ہے اس نے دیا ہے۔ لیکن تم اپنا وعدہ بھول کر کہ تم اب ایئر فورس چھوڑ دو گے۔ پھر نہ کہیں چلے جانا۔ مجھے گولیوں سے الجھتی ہُوئی ہواؤں پر اعتبار نہیں رہا، ہم سب کو تمھاری محبت کی ضرورت ہے اور ابّا کی وفات کے بعد اب تمھارا وجود ہمارے لیے لازمی ہے۔ گڈو اور نینا کو گڈے اور گڑیا کی شادی رچانے کے بعد خود ڈولی میں بیٹھنا ہے اور تمھارے بغیر یہ ناممکن ہے۔ امّی جی کی آنکھوں کی چمک کے لیے تمھارے مُسکراتے ہُوئے چہرے کی ضرورت ہے، تمھارے بغیر ان کے سر کے چاندی کے کرنوں ایسے بال گہنائے ہُوئے معلوم ہوتے ہیں۔ میرا اس دُنیا میں اور کوئی نہیں۔ بچپن ہی سے تمھارے ابّا اور امّی تھے۔ چاچا جی تو تب سے روٹھے ہُوئے ہیں جب سے انھیں اباجی نے تمھارے رشتے سے جواب دے دیا تھا ـــــ تمھیں یاد ہے نا وہ دن جب تم اپنی ٹریننگ ختم کر کے آئے تھے اور گھر میں بڑی بڑی کانفرنسیں ہُوا کرتی تھیں، چاچا جی، اباجی کو منانے کے لیے سارے حربے استعمال کر رہے تھے اور مَیں اور تم سوچا کرتے تھے کہ اگر اباجی مان گئے تو ہم کیا کریں

گے۔ تم نے کہا تھا کہ تم جہاز کا Crash کرلوگے اور میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ تم نے امّی جی کی کتنی منتیں کی تھیں۔ میں پردے کے پیچھے ہواؤں سے لرزتے ہوئے زرد پتے کی طرح ڈولتی رہتی تھی۔ پھر امّی جی تمھیں مایوس دیکھ کر کس طرح پرشفقت مسکراہٹ سے مجھے اپنے دوپٹے کے دامن میں چھپا لیتی تھیں اور ہمارے سب اندیشے دُور ہو جاتے تھے اور تم سے کہتی تھیں کبھی فکر نہ کرو۔ اللہ سے دُعا کرو۔ وہ ضروری تمھاری خواہش پُوری کرے گا ہم دونوں نے مل کر دُعا کی تھی اور اباجی نے امّی جی سے ہار مان لی تھی اور امّی جی نے اپنی فتح کا جشن ہماری شادی کی صورت میں منایا تھا —— وہ آج ہی کا دن تھا نا۔ آج میں نے پھر اسی خلوص دِل سے دُعا کی ہے کہ تم لَوٹ آؤ اور ہم اسی طرح کیرم کھیلیں، امّی جی ریفری بنیں اور —— Points کا میرے اور گڈو کے حق میں فیصلہ دیں۔ ہم دونوں نظمیں لکھیں اور امّی جی، ہر سال میرا دِل رکھنے کی خاطر میری نظم کو بہتر قرار دے کر مجھے ایک خوبصورت سی ساڑھی انعام میں دیں۔ اور ہم دونوں مل کر اپنے باغیچے کو سنواریں (ہیچی)، میں جب بھی اپنے باغیچے میں جاتی ہُوں تو مجھے پودوں کی جھکی ہُوئی ٹہنیاں سوال کرتی محسوس ہوتی ہیں کہ ہمارا جمی کہاں ہے؟ تم تنہا کیوں آتی ہو ——؟ مجھ سے کوئی جواب نہیں بنتا اور میں شرمندہ سی ہو کر لَوٹ آتی ہُوں، میرے آنسو ابھی ابھی خشک ہُوئے ہیں، کیوں کہ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اللہ میاں نے میری دُعا قبول کرلی ہے۔ میں نے خط لکھنے سے پہلے ایک چھوٹی سی نظم لکھ کر آگ میں پھینک دی ہے۔ جانے تمھاری غیر موجودگی میں کہی ہُوئی نظم اچھی کیوں نہیں لگتی۔

آج میرا دِل بہت باتیں کرنے کو چاہتا ہے۔ ہر گزری ہُوئی بات دہرانے کو چاہتا ہے شاید اس لیے کہ آج ہماری محبت کی تکمیل ہُوئی تھی۔ تم خفا نہ ہونا۔

آج مجھے اپنے قلم کی طرح دِل پر بھی اختیار نہیں رہا مجھے ابھی تک وہ دِن نہیں بھولے جب امّی نے تمہیں ایئر فورس میں جانے کے لیے منع کیا تھا اور تم نے کہا تھا کہ مرنا تو ایک ہی دن ہے۔ آپ میرے لیے دُعا کریں اور امی جی نے بے بسی سے دُعاؤں کے ساتھ تمہیں اجازت دے دی تھی۔ ابا جی کا دِل بہر حال ایک باپ کا دل تھا انھوں نے تمہارے شوق کے باعث منع نہیں کیا تھا اور میری سمجھ میں آج تک نہیں آسکا کہ تمہارے ہاتھ جو کہ دماغ کے بے پایاں سمندر کی سرگوشیوں کو کاغذ پر منتقل کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ رڈر سٹک کو کس طرح تھام سکیں گے۔ جانے تمہیں ہواؤں میں اڑنا اتنا پسند کیوں تھا کہ تم سب کے آنسوؤں کو مسکراہٹوں سے خشک کرتے ہوئے چلے گئے ـــ شاید اس لیے کہ تمہارے احساسات اور جذبات قلم تک محدود نہیں رہ سکتے تھے جب میں اسٹیشن پر تمہیں الوداع کہنے آئی تھی تو تم نے میرے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا کہ تم فاشزم کے خلاف لڑتے جا رہے ہو۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کیونکہ یہ ایک اصول کی جنگ ہے اگر یہی صورتِ حال رہی تو انسانیت فاشزم کی آگ میں جل جائے گی۔ میری عقل نے تو تمہاری تبدیلیوں کو قبول کر لیا تھا لیکن میرا دِل جمہوریت، فاشزم، کوئی بھی ازم یا فلسفہ نہیں جانتا۔ وہ تو صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے۔

جمی، میرے اچھے جمی، یہ نہ سمجھنا کہ مَیں بزدِل ہو گئی ہُوں لیکن میرا جی چاہتا ہے کہ مَیں تمہارے تمام تمغے سرکار کو واپس دے آؤں اور ان سے کہوں کہ ان کے بدلے میرے گھر کی مسرتیں لوٹا دیں۔ جمی، تمہارے جانے کے بعد وقت منجمد ہو کر رہ گیا ہے پچھلے دو ماہ سے تمہارا کوئی خط بھی نہیں آیا، شاید تم بہت مصروف ہو گے خط جلدی لکھا کرو۔ امّی جی پریشان سی ہو جاتی ہیں۔ جمی تم یُوں کرو کہ جان بوجھ کر بیمار ہو جاؤ۔ اپنڈسائٹس کا بہانہ کر کے چھٹی لے کر گھر آجاؤ ـــ مجھے معاف کر دو یونہی دیوانگی میں بات نکل گئی تھی۔

خط میں نینا کے ساتھ اُتری ہُوئی تصویر بھیج رہی ہُوں تمہیں پتہ ہے نا کہ تمہارے جانے کے دو ہی دِن بعد، شادی کی سالگرہ سے چوتھے ہی دِن نینا صاحبہ تمہاری یاد کی تازہ کلیوں کی خوشبو میں اضافہ کرنے کے لیے تشریف لے آئی تھیں۔ گول مٹول سی، بالکل تم پر گئی ہے تمہاری طرح شرارتی سی آنکھیں اور گھنگھریلے بال تمہاری تصویر کو دیکھ کر ابا، ابا کہتی ہے جب تم آؤ گے تو تمہیں دیکھتے ہی پہچان جائے گی۔

دیکھو نا، باتوں باتوں میں کتنی باتیں کر گئی ہُوں۔ باتونی ہُوں نا۔ یونہی تمہارا وقت ضائع کیا ہے۔ اس وقت کہرے کا لباس اور بھی درختوں کے ساتھ لپٹ گیا ہے۔ ستاروں کی پتھرائی ہُوئی آنکھیں بھی مندنے لگی ہیں۔ آتش دان میں لکڑیاں بھی سو گئی ہیں اور تھرموس میں پڑی ہُوئی اوولٹین بھی ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ امّی جی ہر روز کی طرح کل بھی تمہارا کمرہ خود صاف کریں گی۔ تمہارے کمرے میں آگ جلائیں گی۔ فر کے گرم جوتے اور تمہارا گاؤن الماری سے نکال کر رکھیں گی اور میز پر اوولٹین کی تھرموس رکھ کر تمہارے متعلق ہدایات دیں گی اور پھر گڈو اور میری طرح اور ننھا کی طرح بھی) دُعائیں مانگنے کے بعد تحت الشعور کی دنیا میں تمہارے پاس چلی جائیں گی ــــ تمہیں واپس لانے کے لیے۔

تمہارے خط کا بے حد انتظار رہتا ہے کم از کم خط تو جلدی لکھا کرو ــــ ورنہ مَیں روٹھ جاؤں گی اور دیر دیر سے خط لکھوں گی امّی جی کی طرف سے دُعائیں۔ گڈو اور نینا آداب کہتی ہیں۔

خدا ہمیشہ تمہارا حافظ و ناصر رہے

تمہاری

---

۲۷ نومبر ۱۹۴۴ء سے پُورے دو سال بعد میں برما کے جنگلات میں سروے کے لیے گیا تھا اور یہ دُھندلایا ہُوا خط مجھے گھنے درختوں میں ایک کیچڑ سے بھرے واٹر پروف بٹوے میں ملا تھا۔ اس بٹوے میں اہم جنگی کاغذات کے علاوہ ایک خوب صورت سی لڑکی کے ساتھ ایک پیاری سی گھنگھریلے بالوں والی بچّی کی تصویر بھی تھی۔ اس واٹر پروف بٹوے سے چند قدم کے فاصلے پر زنگ آلود لوہے کے دو ایک بڑے بڑے ٹکڑے پڑے تھے۔ جو غالباً کسی ہوائی جہاز کے تھے۔

وہ تصویر فریم کرا کے اپنے کمرے میں لگالی ہے۔ جب بھی بین الاقوامی حالات کا جائزہ لینے کے بعد مجھے آسمانِ تیسری جنگ سے ابر آلود نظر آتا ہے۔ تو میں گھبرا کر تصویر کی طرف دیکھتا ہُوں جس کے ہونٹوں پر پُر امید سی مسکراہٹ سے آنسو بہنے لگتے ہیں۔ پھر میں اپنی فائل سے یہ خط نکال کر کئی بار پڑھتا ہُوں اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ تیسری جنگ کے یہ تاریک بادل خوشگوار ہواؤں سے بکھر جائیں گے اور کبھی نہیں برسیں گے۔

بندرابن

مَیں نے کتنی بار سُنا ہے اور متعدد مرتبہ پڑھا ہے کہ جب کسی کے ساتھ کوئی المیہ پیش آتا ہے تو سبز پتے خزاؤں کے زرد جھولے میں اُتر آتے ہیں اور شوریدہ ہوائیں انہیں اس جھولے سے چھین کر اپنے گرد آلود پیروں میں روندتی ہوئی جانے زمین کے کس پردے میں دفن کر دیتی ہیں۔

لیکن اس وقت سبز پتّوں کا رنگ فق نہیں ہوا۔ خزاؤں کا زرد جھولا ساکن ہے اور شوریدہ ہوائیں گنگ ہیں۔

اور اس وقت سورج میرے سامنے لان میں لگے ہوئے املتاس کی زرد قندیلوں کے گھونگھٹ میں دھیرے دھیرے چھپ رہا ہے۔ سورج کی سُرخی اور قندیلوں کی زردی نے کچھ ایسی آگ بھڑکا دی ہے کہ گھونگھٹ کے گرد لپٹوں کا ہالہ سا بن گیا ہے جیسے رافیل کی میڈونا نے یہ ہالہ، یہ تاج اپنے سر سے اتار کے گھونگھٹ پر رکھ دیا ہو۔

اسی املتاس کے نیچے چند ایک عورتیں بیٹھی رو رہی ہیں۔ جیسے شوریدہ ہواؤں

نے زرد پتّوں کو خزاں کے جھولے سے چھین کر زمین کے کسی اجنبی پردے میں دفن کر دیا ہو۔ وہ روتی ہُوئی اٹھی ہیں اور سڑک کی طرف آ رہی ہیں جہاں کوئی چارپائی پر سر تک چادر اوڑھے بڑے اطمینان سے سو رہا ہے، جوان عورتوں کی چیخوں سے بھی نہیں جاگتا۔ ڈاکٹر نے اُسے ہسپتال سے ہمیشہ کے لیے ڈسچارج کر دیا ہے۔

میں مسٹر مس بُروس کے انتظار میں ہسپتال کے برآمدے میں کھڑا سوچ رہا ہُوں کہ اس وقت جب کہ ان روتی ہُوئی عورتوں کے آنسو فضا کی آنکھوں سے ٹپک رہے ہیں، میری آنکھیں کیوں خشک ہیں۔ یہ روتی ہُوئی عورتیں میری طرح یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ موت زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے جسے آنسوؤں میں ڈبویا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ حقیقت آنسوؤں کے سمندروں کی تہ بن سکتی ہے، اگر اس کے قہقہے چیخوں کے غاروں میں گم ہو سکتے ہیں تو پھر میری آنکھوں کا پانی کن صحراؤں نے چُوس لیا ہے، میرے حلق کی چیخیں کہاں سو گئی ہیں! میرے لیے فضا آج بھی کیوں ایسی ہے جیسی کہ کل تھی یا کل ہو گی۔ مجھے اپنے خلوص اور پیار پر شبہ سا ہونے لگا ہے "یہ مس بروس کی بچی آتی کیوں نہیں ——" میں اپنے شبہات کی قید میں سسک رہا ہوں۔

میں مسٹر مس بروس کو نہیں جانتا۔ مجھے آج صبح ہی اس کا تار ملا تھا جو اُس نے شاید اس جذبے کے تحت دیا تھا جو عورتوں میں مشترکہ ہوتا ہے۔ اُس نے ایم ایس کے کمرے کے سامنے نظریں جھکا کر بے حد اداس آواز میں کہا تھا۔

"—— اس وقت ان کے پاس کوئی نہیں تھا۔ مسٹر اعظم بڑی بے چینی سے باہر ٹہلتے ہُوئے سگریٹ کے دھوئیں میں اپنی بیوی کی زندگی ڈھونڈ رہے تھے —— چار گھنٹے کے مختصر سے وقفے میں رفتہ رفتہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ مسٹر اعظم اپنی بیوی کی زندگی محض اس لیے چاہتے ہیں کہ انھیں بیگم اعظم کی لائف انشورنس میں گھاٹا نہ پڑے۔ میں بیگم اعظم کے پاس تھی۔ اتنی گہری غنودگی میں بھی اُن کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ بہت

ہی آہستہ —— مَیں نے قریب ہو کر بہت غور سے سُنا —— "رِفّی ——
رِفّی —— بڑی التجا سے، بچّوں کی طرح جیسے کہہ رہی ہوں —— رِفّی، رِفّی ——!
ایک چاکلیٹ مجھے بھی دے دو ——"

(رِفّی —— رِفّی —— زندگی کا ایک دِن مجھے بھی دے دو۔)

سِسٹر بروس کی آنکھوں میں آنسو ڈھلک آئے تھے۔ جانے یہ نرسیں ہر ایک کے بارے میں کس طرح جذباتی ہو جاتی ہیں۔ چوبیس گھنٹے ایک سے واقعات اور ایک سے حادثات میں رہنے کے باوجود ان مشینوں کے احساسات قائم رہتے ہیں —— پھر جب ہر قسم کی کوشش کے باوجود زندگی کا چہرہ تمھارے لیے اجنبی ہی رہا تو مس بروس نے تم سے میرا اتا پتا پوچھ لیا —— شاید ضرورت پڑ جائے۔

اور اب جب کہ ضرورت پڑ گئی تھی اور مَیں سِسٹر بروس کے سامنے کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں گیلی تھیں اور میری خشک تر، تو اُس نے بڑے عجیب انداز میں کہا —— "تم لوگ بہت ظالم ہوتے ہو۔"

کائنات کا سارا ظلم اس کے ایک فقرے میں اُتر آیا تھا۔ پھر جانے اسے کیوں محسوس ہوا کہ میری آنکھوں میں خشک آنسوؤں کے بخارات ہیں۔ اس نے بڑی دھیمی آواز میں کہا تھا، آپ اُوپر برآمدے میں چلیے مَیں آپ کو وہ کمرہ دکھاؤں گی —— مَیں ابھی انجکشنز لگا کے آتی ہوں۔

وہ عورتیں روتی ہوئی چارپائی کے پیچھے پیچھے چلی گئی ہیں۔ اب فضا میں املتاس کے ناچتے ہوئے حبشیوں کے شور کے علاوہ کچھ نہیں۔ مَیں ان کی چیخوں اور ناچ سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوں۔ سُورج کے زرد گھونگھٹ کے گرد میڈونا کا ہالہ اور بھی چمکیلا ہو گیا ہے۔ میری آنکھیں اس چمک سے چُندھیا گئی ہیں۔ سُورج کے زرد گھونگھٹ میں ایک لو بسا چہرہ لمحہ بھر کے لیے ابھرا ہے اور املتاس کا درخت لمحہ بھر کے لیے یونیورسٹی کے دائیں

لان میں لگے ہوئے پیچ بلوسم میں ڈھل گیا ہے۔ اور وہ چہرہ اس لڑکی میں فیڈ ہو گیا ہے جو کہ سوت کا تار گلے میں پہنے پیچ بلوسم کی ایک شاخ کے ساتھ لٹکی ہوئی ہے۔ جس نے بڑی کوشش سے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کا جوڑا بنایا ہوا ہے اور جس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں کی چمک، آنکھوں پر پڑے دبیز کے پردے بھی نہیں روک سکتے۔ اس چمک سے میڈونا کے ہالے کا سایہ سورج میں پڑ رہا ہے —— اس چمک نے میری آنکھوں کی روشنی نگل لی ہے۔

مٹی کے پسینے میں ڈوبی ہوئی اس عام سی شام نے میرے ہاتھ میں مس بروس کا تار گیلا کر دیا ہے —— یہ تار ایک حقیقت ہے جسے میں پسینے کے تیزاب میں حل نہیں کرنا چاہتا۔ اسے پتلون کی جیب میں رکھتے وقت ایک چھوٹی سی ڈبیا میری انگلیوں سے ٹکرائی ہے اور میرا ہاتھ بجلی کے اس سرکٹ سے جڑ کر رہ گیا ہے —— اس ڈبیا میں گلاب کے دو خشک پھول ہیں۔ یہ پھول سفید ہیں۔ جب یہ مجھے دیئے گئے تھے تو میری آنکھوں نے انھیں سُرخی دے دی تھی۔ مُرجھا جانے کے بعد سفید پھولوں کا رنگ مٹیالا ہو جاتا ہے لیکن مس بروس سے ملنے کے بعد میں نے انھیں دیکھا تھا تو دونوں پھول سُرخ تھے —— بالکل سُرخ، جیسے تم نے انھیں چوما ہو۔

"آئی ایم سوری۔ مجھے کچھ دیر ہو گئی"، مس بروس بھی مجھے اس کرنٹ سے آزاد نہیں کرا سکی۔ اس چھوٹی سی ڈبیا نے میرا ہاتھ اور بھی جکڑ لیا ہے۔ لیکن مس بروس کی آنکھیں ایکس رے کا بلب نہیں ہیں۔ وہ میری جیب میں جھانک کر اس بات کا اندازہ نہیں لگا سکتی کہ ہم مرد ظالم نہیں ہوتے بلکہ جلا کر سیاہ کر دینے والی بجلی کی رَو سے زندگی حاصل کرتے ہیں اور درخت سے بندھے اپنے گرد ناچتے ہوئے حبشیوں سے بالکل خوفزدہ نہیں ہوتے۔

"چلیے"، مس بروس کی آواز املتاس میں ناچتے ہوئے حبشیوں کی چیخوں میں بس

ٹپکاتی ہے۔ ہوا نہ ہونے کے باوجود فانوس زور زور سے لرز رہے ہیں ——

مس بروس مجھے مقتل کی طرف لے جا رہی ہے۔

"یہ ہے وہ کمرہ"

مَیں بے دھڑک اس مقتل میں آ گیا ہُوں۔ میرے چہرے پر کوئی تاثر نہیں، مَیں خاموش ہُوں، البتہ میرا دل اب بے حد تھکے ہُوئے مسافر کی طرح لڑکھڑا رہا ہے۔ خالی بستر کو دیکھنے کے بعد مس بروس نے میری آنکھوں میں جانے کیا دیکھا ہے کہ وہ چھوٹا سا رومال اپنی آنکھوں پر رکھ کے چپکے سے باہر چلی گئی ہے —— میری آنکھوں میں اب بھی تھلوں کے سمندر ہیں۔ جانے مَیں بھی مس بروس کے پیچھے پیچھے باہر کیوں آ گیا ہُوں —— "مس بروس!" اس نے بھیگی آنکھوں سے مجھے حیرانی سے دیکھا ہے۔ جیسے مجھے باہر آنے کے بجائے تمہارے بستر پر پڑے ہُوئے شفاف تکیے کو سینے سے لگا کر رونا چاہیے تھا —— "مس بروس آپ باہر کیوں چلی آئی ہیں؟"

"تاکہ آپ ڈسٹرب نہ ہوں۔ لیکن آپ کیوں باہر آ گئے ہیں؟"

اب مَیں کیا بتاؤں کہ مَیں باہر کیوں آ گیا ہُوں۔ مَیں مس بروس کے چہرے سے نظریں ہٹا کر کمرے کی جالیوں سے جھانکتا ہُوا اس سوال کا جواب ڈھونڈتا ہُوں۔

"مَیں جانتی ہُوں۔ صدمہ بڑی عجیب چیز ہے۔ انسان سے آنسو تک چھین لیتا ہے۔"

جانے مجھے صدمہ ہُوا ہے یا نہیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ اس لیے مَیں بالکل خاموش ہُوں اور میری نگاہیں ٹھوکر لگی کنکریوں کی طرح تمہارے کمرے میں بھٹک رہی ہیں۔ تمہارے کمرے سے میرے باہر آنے کا جواز ڈھونڈ رہی ہیں۔ آسمان کا بدی نیل تمہارے آنسوؤں میں گھلتا ہُوا تمہارے جسم میں آہستہ آہستہ سرایت کر رہا ہے۔ بلڈ ٹرانس فیوژن سے بھی کوئی فرق نہیں پڑا —— آسمانی رنگ کچے نہیں ہوتے، میرے چہرے

کے پتھر پریشان ہو کر بھٹکتے ہوئے یونیورسٹی لان کے درمیان میں بنے مرمر کے بُت کے پاس آئے ہیں اور اُمید کی صرف ایک کرن کے لیے التجا کر رہے ہیں تاکہ تمہارے چہرے پر چھایا ہُوا آسمانی رنگ چھٹ جائے۔ مرمر کے بُت کا نام بنانے والے نے "زندگی" رکھا ہے۔ اس بُت نے اپنی تمام کرنیں سمیٹ کر ان پتھروں کو اس زور سے ٹھوکر لگائی ہے کہ یہ کرچی کرچی ہو کر ساری فضا میں پھیل گئے ہیں۔ مرمر کی "زندگی" ہنس رہی ہے اور اس کے مُنہ کے غار سے اُبلتے ہُوئے تاریک قہقہے بھیانک رات بن کر تمہارے کمرے میں چھا گئے ہیں، اگرچہ اس رات نے سورج کی لَو بھی چاٹ لی ہے۔ لیکن کہ جیبوں کی سِسکیاں آنسوؤں کی مشعلیں لیے اسے دوبارہ روشن کرنے کی کوشش کر رہی ہیں۔ شاید مَیں اسی لیے باہر آ گیا ہُوں کہ کمرے میں تاریکی ہے۔

"کیا بات ہے مسٹر رفیق! ارے آپ کی آنکھوں میں تو آنسو ہیں۔"

ان پتھروں میں پانی کہاں سے آ گیا۔ مَیں نے جلدی سے اس تیزاب کو پونچھا ہے "وہ نہیں مس بروس! آپ کو غلط فہمی ہُوئی ہے۔ مَیں رو تو نہیں رہا۔"

"اتنی اچھی، پیاری اور معصوم سی لڑکی کی وفات پر کون نہ روئے گا ـــــ بیچاری نے اپنے آپ پر بہت ظلم کیا ہے۔"

"ہوں" ـــــ مَیں چونک گیا ہوں۔ اپنے آپ پر ظلم کیا ہے ـــــ؟

مستقبل کا ایک ڈاکٹر بغل میں کتابیں دبائے، گلے میں سٹیتھوسکوپ کا ہار پہنے ہُوئے برآمدے کے آخری سرے کی روشنی سے برآمد ہُوا ہے۔ سارا برآمدہ سنسان پڑا ہے۔ ٹک ٹک ٹک ٹک ٹک ٹک۔ اس کی ایڑیوں کی آواز اونگھتے ہُوئے برآمدے کو جھنجھوڑ رہی ہے۔ نیم تاریک سا برآمدہ مس بروس کی مسکراہٹ سے جگمگا اٹھا ہے۔ ٹک ٹک۔ ٹک۔ ٹک۔ وہ مستقبل کا ڈاکٹر ہمارے قریب سے ہو کر ہلکا سا کھنکار کے دوسری طرف مُڑ گیا ہے۔ مس بروس نے فوراً اپنے ریڈیم ڈائل کی ننھی سی گھڑی دیکھی ہے لیکن اس

طرح وہ اپنے گالوں کی سرخی چھپانے میں کامیاب نہیں ہوئی" ارے ہاں یہ مسز اعظم نے ــ ’’میری تیز نظروں نے اس کی زبان کو مجروح کر دیا ہے۔ آئی ایم سوری۔ ــ نینو انھوں نے یہ چٹ مجھے لکھوائی تھی" اس نے الٹے پاؤں جاتے جاتے قمیض کے گریبان میں اڑھا ہوا ایک لفافہ نکال کر میرے ہاتھ میں تھما دیا ہے۔

"شکریہ"

مس بروس دیوار کے پیچھے اوجھل ہونے کے بعد ایک مرتبہ پھر آئی ہے "آپ اسی کمرے میں چلے جائیے۔ اور اطمینان سے خط پڑھیے۔ آپ کو کوئی ڈسٹرب نہیں کرے گا۔ میں دس پندرہ منٹ کے بعد دوبارہ آؤں گی۔ اور آپ کو ایک اور بات بتاؤں گی"

"کیا بات ہے۔؟" میں نے نینو کا خط مٹھی میں بھینچ لیا ہے۔ مس بروس کا آخری فقرہ سن کر میرا دل سینے کے پنجرے سے ٹکرا رہا ہے۔ دیوار کی اوٹ سے ٹک ٹک کی آواز پھر ابھری ہے۔ مس بروس نے بڑی تیزی سے اس طرف دیکھا ہے اور شرما سی گئی ہے۔ " ابھی نہیں"

"جلدی آئیے گا" جانے میں بھی کیوں مسکرا دیا ہوں۔

ٹک ٹک ٹک ٹک ایڑیوں کی آواز دیوار کی اوٹ میں دوسرے برآمدے میں آہستہ آہستہ پھسلتی خاموشی میں اتر گئی ہے۔ میں نینو کا خط ہاتھ میں تھامے روبوٹ کی طرح بڑے میکانکی انداز میں دروازہ کھول رہا ہوں۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ جوتوں کی ایڑیوں کی آواز جانے کنوئیں سے پھر برآمد ہو رہی ہے اور میرا ہاتھ دروازے کے ہینڈل پر جم کر رہ گیا ہے۔ ایڑیوں کی آواز رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی ہے ـــ اور قریب ـــ اور قریب ـــ میرا دل اس تال پر دھڑک رہا ہے اور میں دیکھ رہا ہوں کہ ایک اجنبی سا لڑکا جو بالکل میری ہی کاربن کاپی ہے اور میری ہی طرح

کندھے سکوڑے آہستہ آہستہ برآمدے کے آخر میں لگی نیم مردہ روشنی سے برآمد ہو رہا ہے۔ اسے سٹیتھوسکوپ پکڑنے کا ڈھنگ بھی نہیں آتا۔ مَیں اس لڑکے کو بالکل نہیں پہچانتا مجھے یہ بھی پتہ نہیں کہ وہ میڈیکل کالج کے کسی دوست سے ڈاکٹری کی ایک کتاب کاپی اور سٹیتھوسکوپ بڑی منتوں کے بعد مانگ کر لایا ہے تاکہ ہسپتال والوں کو رات گئے ہسپتال میں اس کی موجودگی پر اعتراض نہ ہو۔ اپنے آپ پر اعتماد کے باوجود اس کے قدموں میں ہلکی سی لغزش ہے۔ ٹک ٹک ٹک ٹک۔ وہ بڑی بے قراری سے اس کمرے کی طرف آ رہا ہے۔ جہاں ایک لڑکی کبھی کبھی بے چینی میں تکیے سے سر ٹکرا رہی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بالوں کو سمیٹ کر بنایا ہُوا جوڑا پریشان سا ہو کے بکھر گیا ہے۔ پاس ہی اس کی امّی نماز پڑھنے کے بعد رو رو کر اس کی صحت کے لیے دُعا کر رہی ہیں ـــــ اس لڑکے نے دیوار کی اوٹ میں کھڑکی کی جالی سے جھانکا ہے۔ لڑکی نے جلدی سے اپنے بال سمیٹ کر جوڑا بنانے کی کوشش کی ہے اور پھر نقاہت سے بے بس ہو کر اپنے دوپٹے سے مُنہ ڈھانپ لیا ہے۔ اس لڑکے نے اطمینان سے سانس لیتے ہُوئے پھر اپنے آپ کو یقین دلایا ہے کہ ماؤں کی دُعائیں رائیگاں نہیں جاتیں اور کچھ اس طرح پُر اُمید ہو کر لَوٹ آیا ہے کہ جیسے کوئی بچہ شوکیس پڑا ہُوا اپنا مرغوب کھلونا دیکھ کر لَوٹ آئے کہ ابھی بکا نہیں۔

اس لڑکی کا نام نینو ہے ـــــ اور اس لڑکے کو جو میری کاربن کاپی ہے مَیں نہیں جانتا۔ جتنا عرصہ نینو وہاں رہی وہ ہر رات اُسے دیکھنے کے لیے میڈیکل سٹوڈنٹ کا روپ بھر کر چوروں کی طرح ہسپتال میں دیکھنے آتا رہا تھا کیونکہ نینو کی اُمّی ایک لمحے کے لیے بھی تو وہاں سے نہیں جاتی تھیں۔

پھر جب تم ٹھیک ہو گئی تھیں اور تم نے پیچ بلوسم کے نیچے اس طرح رات کو آنے کا شکریہ ادا کیا تھا۔ تو مجھے بے حد غصّہ آیا تھا۔ مَیں اتنا دیوانہ نہیں تھا کہ اس طرح

چوروں کی طرح رات کو اُٹھ اُٹھ کر ہسپتال جاتا۔ مَیں بھی تمھاری سہیلیوں سے زیدی اور وقار کی طرح تمھاری صحت کے بارے میں پُوچھ سکتا تھا ـــــ لیکن تم مُسکراتی رہی تھیں تمھیں یقین تھا کہ وہ چُھی تُلی آواز میرے ہی قدموں کی تھی ٹک ٹک ٹک۔ میرے کان اس آواز سے مانوس ضرور ہیں۔ لیکن اسے بیان نہیں کر سکتے۔ مَیں نے اس لڑکے کو کہیں نہ کہیں دیکھا ضرور ہے لیکن مَیں اسے جانتا نہیں۔ اور اس وقت جب کہ مَیں پرائیویٹ وارڈ میں تمھارے کمرے کا دروازہ تھامے مس بروس والے ڈاکٹر کی ایڑیوں کی بازگشت بنا کھڑا ہُوں مجھے یقین ہے کہ ابھی مجھے کوئی آئینہ دکھائے تو مَیں آئینہ دیکھ کر یہی کہوں گا ـــــ ہیلو آپ کون ہیں ؟ اچھا ! مجھے آپ سے مل کر بڑی ـــــ لیکن مَیں اپنے احساس کا اظہار نہیں کروں گا۔ مبادا آئینے کا باسی بُرا مان جائے۔

مجھ میں کمرے کا دروازہ کھولنے کی ہمت نہیں ہے ممکن ہے وہاں کوئی آئینہ لیے کھڑا ہو مَیں یہاں سے بھاگ جانا چاہتا ہُوں ـــــ مَیں تو مسرّت کے سنہری پرندے کی تلاش میں یہاں تک نکل آیا ہُوں ـــــ سنسان راستوں پہ بڑی خوفناک آوازیں مجھے پکارتی رہی ہیں ـــــ نہ جانا ـــــ ان راستوں پہ نہ جانا ـــــ اب بھی یہ آوازیں چنگھاڑ رہی ہیں ـــــ نہ جانا ـــــ اس کمرے میں نہ جانا ـــــ ہماری طرف دیکھو ہم بہت خوبصورت ہیں ـــــ مسرّت کا سنہری پرندہ اس کمرے میں نہیں ہے۔ اُسے تو ہم اپنے پاس لے آئی ہیں۔ لیکن مَیں پیچھے مُڑ کر نہیں دیکھوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ اُن کے چہرے بھی اُن کی آوازوں کی طرح بھیانک ہوں گے۔ اور اگر مَیں نے مڑ کر دیکھا تو مَیں پتھّر بن جاؤں گا۔ مَیں پتھّر بننا نہیں چاہتا۔ ان آوازوں کے بچے وارڈ کے شب گزیدہ گوشوں سے نکل کر میری طرف بڑھ رہے ہیں ـــــ وہ پرندہ تو ہمارے پاس ہے۔ اس کمرے میں نہ جانا ـــــ کوئی بات نہیں اگر سنہری پرندہ مر چکا ہے۔ کوئی بات نہیں اگر کمرے میں کوئی آئینہ لیے کھڑا ہے۔ مَیں اس آئینے میں اُترتے ہوئے

پرندے کے سونے کی انگوٹھی بنا کر بائیں ہاتھ کی چھنگلی کے ساتھ والی انگلی میں پہنوں گا۔

میں سنہری پرندے کے پنجرے میں آ گیا ہوں، اور اندر سے چٹخنی لگالی ہے میں کرسی پر بالکل پلنگ کے ساتھ لگ کر بیٹھ گیا ہوں۔ اس پر اب سے پورے گیارہ گھنٹے پہلے تم نے آخری بار آنکھیں موندی تھیں۔ لیکن مجھے ابھی تک تمہارے سانسوں کی آواز سنائی دے رہی ہے جو ساری دنیا پر محیط ہے۔ اگر یہ سانس بھی مٹ جاتے دنیا دم گھٹ کے مر جاتی ——— (میں نادم ہوں کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ یہ دراصل میرے ان جذبات کا قصور ہے جو ماحول نے غالباً وقتی طور پر مجھ پہ طاری کر دیے ہیں۔)

میں نے تمہارا خط لاکھوں مرتبہ پڑھا ہے اور اب بے بس ہو کر بستر پر رکھ دیا ہے میری سمجھ میں خط کی سیدھی سادی زبان بھی نہیں آتی ——— میں اس کا مطلب کس سے پوچھوں؟ آؤ نا بینو، تم ہی سمجھاؤ، تمہارے لکھے ہوئے الفاظ کے معنی کسی لغت میں نہیں ہیں ——— جلدی آؤ، کیونکہ یہ خط میرے سامنے بستر پر پڑا تمہارے الفاظ کی آگ میں جل رہا ہے۔ جل جل کر راکھ ہو رہا ہے اور بستر کے صحرا میں ایک بہت بڑا بگولا جاگ رہا ہے اور چاروں اور اُٹھ کر تمہارے خط کے گرد ناچ رہا ہے۔ دھیرے دھیرے اس راکھ کا جنازہ کندھوں پر اُٹھا رہا ہے اور میرے سر پر افشاں کی بارش کرتا ہوا یونیورسٹی پہنچ کر فضا میں تحلیل ہو رہا ہے اور تمہارے خط کی راکھ ——— افشاں، بیچ بلوسم کی نرم و نازک پتیاں بن کر تم پر وارد ہو رہی ہیں اور میں دیکھ رہا ہوں کہ تم بیچ بلوسم کے ساتھ ٹیک لگائے گلابی پتیوں میں گھری ہوئی بیٹھی "بوٹل گرین کلر" کا سویٹر بُن رہی ہو، تمہارے سامنے گراؤنڈ پراکنامکس کی کتاب کھلی پڑی ہے مگر تم کیفے ٹیریا اور سٹوڈنٹس یونین کے دفتر کے مشترکہ دروازے کی طرف دیکھ رہی ہو جہاں وقار، زیدی اور میں خالی پیریڈ میں حسب معمول کھڑے مونگ پھلی کھاتے ہوئے سگریٹ پی

رہے ہیں۔ تینوں میں ہر ایک یہی سمجھ رہا ہے۔ کہ تم یہ بوٹل گرین سوئیٹر اسی کے لیے بنتی ہوئی اسی کی طرف دیکھ رہی ہو کیونکہ وقار نے اپنا رومال نکال کے مُنہ پر رکھ لیا ہے کہ لاتعداد الائچیاں اور مسن مسن کھانے کے باوجود کہیں تمہیں شراب کی بُو نہ آجائے زیدی انگلی پر چاہیوں کا گُچھا گھماتا ہُوا معمول سے زیادہ اُداس ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔ اور مَیں کبھی ان دونوں کو دیکھتا ہُوں، کبھی تمہیں۔ اور پھر اس لڑکے کو (جو سر سے لیکر پَیر تک میری کاربن کاپی ہے) جس کا ذہن محض اس لیے مونگ پھلی کا خول بن کر رہ گیا ہے۔ کہ تم اس کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ وقار اور زیدی کو بھی دیکھ رہی ہو مجھے ان تینوں پر ترس آتا ہے کیونکہ مَیں جانتا ہُوں کہ تم تمام لوگوں کے سامنے یہ سوئیٹر بُن رہی ہو اور جب ان تینوں میں سے کوئی یہ سوئیٹر پہنے گا تو تم اسکینڈلوں کو برداشت نہیں کر سکو گی۔ اسی لیے تم یہ سوئیٹر ان تینوں میں سے کسی کو دینے کے بجائے عید پر کسی یتیم خانے کو تحفہ دے دو گی۔ اور تم ان میں سے کسی ایک کو نہیں بلکہ بیک وقت تینوں کو دیکھ رہی ہو، کیونکہ تمہاری نگاہیں محدُود نہیں۔ جانے وقار کو کھڑے کھڑے کیا ہُوا ہے۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی کتاب کو زور سے اپنی ٹانگ پر مارا ہے ——

"لیکن مَیں بُزدل نہیں ہُوں"۔ اس کے الفاظ کتاب کی آواز میں دب کر رہ گئے ہیں اور وہ جسم کے سارے بال جلا دینے والی مسکراہٹ سے زیدی کو دیکھ کر تمہارے پاس چلا گیا ہے۔ تم سمٹ سمٹ کر پیچ بلوسم کی پتی بن گئی ہو۔ وہ بڑی ڈھٹائی سے تمہارے پاس زمین پر بیٹھ گیا ہے۔ رومال بدستور اس نے دانتوں میں دبایا ہُوا ہے۔ اس نے منہ نیچا کر کے کوئی بات کی ہے۔ تم ہنستی ہو اور میرے پاس کھڑا ہُوا زیدی اور بھی اُداس ہو گیا ہے۔ اس نے لمحہ بھر میری طرف دیکھنے کے بعد آہ بھری ہے اور مجھے چائے کی دعوت دے کر کیفے ٹیریا میں چلا گیا ہے۔ وہ وہاں جا کر سیاہ چائے پیئے گا۔ مَیں چائے پینے نہیں جاؤں گا کیونکہ مجھے آہ بھرنا نہیں آتی۔ مَیں یہیں دروازے میں

کھڑا ہو کر تمہیں اور وقار کو باتیں کرتا دیکھوں گا تاکہ جس وقت تم مجھے بتاؤ کہ وقار نے تم سے یہ یہ باتیں کی ہیں تو مَیں خود کو اجنبی محسوس نہ کروں مَیں دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے پیچ بلوسم کے نیچے جاگتا ہُوا خواب دیکھ رہا ہُوں۔ ڈیپارٹمنٹ سے آتی ہُوئی شمسہ وغیرہ کو دیکھ کر تمھاری رُوح فنا ہو گئی ہے۔ تمھاری بے چینی کے باوجود وقار وہیں بیٹھا ہے۔ وہ واقعی بزدل نہیں ہے اور اس دُنیا میں صرف تم ہی ایک بزدل ہو کیونکہ جب تم وقار کے ساتھ ہوتی ہو تو تمہیں یہ قطعاً یاد نہیں رہتا کہ کلاس کی باقی لڑکیاں بھی اپنے پسندیدہ لڑکوں کے ساتھ گھنٹوں تاریک غلام گردشوں، کیفے ٹیریا یا کیمپس کے کسی اچھے سے گوشے میں کھڑی رہتی ہیں اور شمسہ جس کی تنقید کا خوف تمہیں سب سے زیادہ ہے وہ خود امجد کے ساتھ باہر ریستورانوں میں اور سینماؤں میں جاتی ہے۔ اور جب زیدی تمھارے ساتھ باتیں کیا کرتا ہے اور شمسہ تم سے ذرا دور ہٹ کر اکنامکس کے نوٹس کھول کے بیٹھ جاتی ہے تو اس وقت تمھارے معصوم سے ذہن میں یہ خیال بھی نہیں آتا کہ زیدی، امجد کا کتنا گہرا دوست ہے۔

شمسہ اور دوسری لڑکیاں غالباً شمسہ کی کسی پھبتی پر ہنستی ہُوئی تمھارے بہت قریب آگئی ہیں اور تم لمحہ بھر کے لیے وقار کے اُٹھنے کا انتظار کرنے کے بعد خود اُن کے پاس چلی گئی ہو۔ پیچ بلوسم کے نیچے جاگتا ہوا خواب درہم برہم ہو گیا ہے۔ وقار شرمندہ سا ہو کر وہاں سے آرہا ہے۔ اس کا چہرہ غصّے میں تمتما رہا ہے۔ میرا جی چاہتا ہے کہ شمسہ کو قتل کر دوں۔ امجد، زیدی کے کان میں کھُسر پھُسر کرتا ہُوا کیفے ٹیریا سے آرہا ہے۔ زیدی کی آنکھوں میں چمک ہے۔ وہ دونوں پیچ بلوسم کی طرف جاتے ہُوئے وقار کے قریب سے گزرے ہیں۔ وقار نے بڑے زور سے زمین پر تھوکا ہے۔ کلاک نے دس بجائے ہیں۔ لڑکیاں وہاں سے کلاس کی طرف جا رہی ہیں۔ امجد اور زیدی بھی بور سے ہُوئے کلاس کی طرف مڑ گئے ہیں اور میرے منہ سے قہقہے اُبلتے اُبلتے گلے میں اٹک گئے ہیں کیونکہ مجھے تمھارا وہ فقرہ یاد آگیا ہے ——— "پلیز۔ آپ یُوں نہ ہنسا کریں۔ مجھ سے آپ کی ہنسی کا کھوکھلا پن برداشت نہیں ہوتا۔"

وقار میرے پاس آگیا ہے۔

وہ میری کمر میں بازو حمائل کر کے مجھے کینٹے ٹیریا میں لے گیا ہے۔ وہ ایسے حالات میں کلاس اٹینڈ نہیں کیا کرتا۔ کیونکہ ایسی صورت میں مجھے وقار کے ساتھ بیٹھنے میں مزہ آتا ہے۔ وہ کرسی پر بیٹھتے ہی دیوار کی طرف مُنہ کر کے کوٹ کی اندر کی جیب سے نشان زدہ ایک شیشی نکالے گا اور بے دھڑک ایک خوراک پئے گا۔ یہ ذہنی ہاضمے کی دوائی ہے اسے شراب کہتے ہیں۔ میرے حلق میں قہقہے اب بھی اٹکے ہوئے ہیں۔ وقار نے شیشی پر کارک لگا کر جیب میں رکھتے ہوئے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھا ہے۔ بالکل خالی، کھوکھلی سی، اس کی آنکھوں کے خلاؤں میں اپنی ہنسی کا عکس دیکھ کر میں بھی ان خلاؤں میں اُتر گیا ہوں۔

وہ میرے سامنے بالکل چُپ بیٹھا ہے۔ مجھے اس پر بے پناہ ترس آرہا ہے۔ لیکن میں اس کے لیے کیا کر سکتا جو میری کاربن کاپی ہے۔ وقار میرے لیے چائے بناتے ہوئے بڑی دھیمی آواز میں کہتا ہے۔ جائے جہنم میں ــــــ وہ خود ساتویں دوزخ میں اُتر گیا ہے اور ساتھ اسے بھی گھسیٹتا لے گیا ہے۔ دوزخ میں موت نہیں آتی، وہاں تو انسان بس جلتا رہتا ہے۔ لیکن جسے وہ اپنے ساتھ لے گیا ہے، وہ دوزخ کی آگ سے محفوظ ہے۔ راکھ اور کیا جلے گی! مجھے وقار کی اس حرکت پر ہنسی آتی ہے لیکن میں چُپ ہوں۔ وقار اپنی بائیں ہتھیلی سے چہرے کو سہارا دیے جانے کس سوچ میں بڑی تیزی سے اپنی کاپی پر پنسل سے چھوٹی چھوٹی تکونیں اور دائرے بنا رہا ہے۔ پھر اُس نے یکدم مایوسی، غصے اور الم کے ملے جلے جذبات سے ان تکونوں اور دائروں کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے اور میز پر بڑے زور سے مُکا مار کے اُٹھ کھڑا ہوا ہے۔ قریب ہی کھڑا ہوا بیرا چونک گیا ہے۔

"جی صاحب۔ اور چائے؟"

"دیکھتے نہیں اُلّو کے پٹھے، میں جا رہا ہوں،" وقار چیخا ہے۔ بیرے کا رنگ فق ہو گیا ہے۔ آس پاس بیٹھے لڑکے حیرانی سے وقار کو دیکھ رہے ہیں۔ وقار باری باری سب کو

دیکھنے کے بعد بڑی شرمندگی سے ہیرے کے کندھوں پر بازو رکھ کر اُسے باہر لے گیا ہے۔
"آئی ایم سوری" وقار، جو سٹوڈنٹس یونین کا صدر ہے۔ بچّوں کی طرح ہیرے سے معافی مانگ رہا ہے۔ ہیرا حیران کھڑا ہے، وقار چلا گیا ہے اور ہیرے نے باورچی خانے میں آکر کہا ہے:

"بڑا عجیب صاحب ہے۔"

عجیب صاحب کے قدموں میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ ہے۔ وہ بڑی احتیاط سے چلتا ہوا پیچ بلوسم کے نیچے جا کر بیٹھ گیا ہے۔ کیونکہ اُسے یقین ہے کہ پیریڈ کے ختم ہونے پر تم وہاں آؤ گی، مگر تم اپنی کار میں بیٹھ کر چلی گئی ہو۔ اس نے اپنی جیب سے شیشی نکال کر ایک اور خوراک پی ہے اور اب وہ دن ڈھلنے تک پیچ بلوسم کی گود میں بیٹھا سگریٹ پیتا رہے گا۔ اور جب شام درختوں سے اُتر کر دن کے جنازے کو کندھے پر اُٹھا لے گی تو وہ پیچ بلوسم کی پتّیاں مُنہ میں ڈال کر چُوستے ہُوئے سوچے گا ——— اچھا ہُوا آج کا دِن بھی مر گیا۔ یہ کل سے بھی زیادہ ظالم تھا۔ پھر وہ کلب جا کر جلدی جلدی ٹینس کے ایک دو سیٹ کھیلے گا، اور ہوسٹل آکر تمہارے پسندیدہ گراموفون ریکارڈ سُنے گا۔ اور آج سے زیادہ آنے والی کل کے ظلم کا مقابلہ کرنے کے لیے شراب کی نئی بوتل کی زبان کھول کر اکنامکس کی کتاب سینے پر رکھ کے لیٹ جائے گا۔

لیکن مَیں یہاں سے اُٹھنے کے بعد کہاں جاؤں گا۔ کیا کروں گا۔ مَیں پیچ بلوسم کے نیچے نہیں بیٹھ سکتا کیونکہ وہاں گراؤنڈ پہ بکھری ہوئی پتّیاں انگارے ہیں۔ مَیں وقار کی بوتل کا سہارا نہیں لے سکتا کیونکہ زندگی سے فرار تو مل جائے گی پر پھر فرار سے فرار حاصل کرنے کے لیے کیا کروں گا۔ بس زبیدی کی طرح کسی امجد کے ساتھ رات کی تاریکیوں کا لبادہ اوڑھ کر اور اپنے چہرے سے اُداسی اور معصومیت کا ماسک اُتار کے ریلوے کالونی کی اینگلو پاکستانی لڑکیوں کو چاہتا ہُوا اُن کے دوستوں کے ساتھ ساری رات فلاش نہیں کھیل سکتا کیونکہ یہ

سب کچھ کیڑے بن کر میری زندہ لاش کو چاٹ جائے گا۔ زندگی مردہ خانہ نہیں ہے۔ زیدی اور وقار کی لاشوں کو کیڑے چاٹ رہے ہیں اور مَیں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ اسی لیے مَیں کیفے ٹیریا سے اُٹھ کر لائبریری میں جاؤں گا۔ اور شام تک بیٹھا اکنامکس کی مختلف کتابیں پڑھوں گا۔ اور پھر دریا پر جا کے ڈوبتے سورج کو دیکھوں گا۔ دُور جاتی ہوئی کشتی کو دیکھ کر جب میرا یہ احساس پختہ ہو جائے گا کہ اس میں تم اور وہ لڑکا جس کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہے۔ بیٹھے ڈوبتے سورج کو سہارا دینے جا رہے ہیں تو مَیں اپنے کمرے میں آ کر خوبصورت سی نظمیں پڑھتا ہوا آنے والی رحمدل کل کے انتظار میں مُسکراتا ہوا سو جاؤں گا ـــــ
مروں گا نہیں، زیدی اور وقار کے لیے آج کے دن کے خُون کی چیلی کل کی طرح بہت زہریلی تھی اور مَیں یہ زہر چکھنے کے باوجود ان سب کے کفن روندتا ہوا بہہ رہا ہوں ـــــ آگے ـــــ اور آگے ـــــ یہ میرا اصلی رُوپ ہے لیکن مجھے اس رُوپ کی آنکھوں میں آنسو جھلملاتے نظر آ رہے ہیں۔ یہ آنسو میرے نہیں ہیں تو میرے اجنبی دوست کے ہیں، جس کی شکل مجھ ایسی ہے۔ اس نے میری آنکھیں اپنے آنسوؤں کے لیے مستعار لی ہیں۔

لیکن کبھی کبھی جب حالات سازگار ہوتے ہیں یعنی جب شمسہ اوپر غلام گردش کے نیم تاریک گوشے میں سیڑھیوں کے نیچے امجد کے سینے کے ساتھ سر لگا کر بیٹھی ہے اور زیدی غلام گردش کے سامنے چھوٹی سی بالکنی میں کھڑا ان دونوں کی حفاظت کرتا ہے تو تم بہت مہربان ہو کر بیچ بلوسم کے سلائے سے اُٹھ کر سیمینار میں آ جاتی ہو، مجھے الماری کے ساتھ کتابوں کے لگے ڈھیر سے نکال کے گرد وغیرہ صاف کر کے ان کی الماری میں سجا دیتی ہو، یا وقار کے پاس چلی جاتی ہو۔
ایک ایسے ہی دن حالات سازگار تھے، مَیں اسی طرح الماری کے پاس بیٹھا تھا اور وقار الماری کی دوسری طرف میز پر بیٹھا کسی کتاب سے نوٹس لے رہا تھا۔

"ہیلو ——"

"آپ مجھے جانتی ہیں" وقار کے گولی ایسے تیز الفاظ نے تمہارے نازک سے احساسات کو مجروح کر دیا تھا۔ اور مجھے وقار پہ بہت غصہ آیا تھا کہ کم بخت پہ آج خدا مہربان ہوا ہے اور وہ گزرتے ہوئے لمحوں کو اپنے اکھڑ پن کی بھینٹ چڑھا رہا ہے۔

"وِکی" تم قریباً رو دی تھیں۔

"او، خوب، تو آپ میرا نام بھی جانتی ہیں"

"او شٹ اپ —— تم سے باتیں کرنے کو جی چاہ رہا ہے"

"مس شمسہ نے آپ کو اجازت دے دی ہے؟"

یہ واقعی بہت بڑی ٹریجڈی تھی۔ شمسہ کا بھوت تمہارے دِل و دماغ پر اتنا حاوی تھا کہ تمھیں اس کے احکام ماننا ہی پڑتے تھے۔ تمہارے نزدیک وہ سمجھ بوجھ والی ایک ایسی خاتون تھی جسے تمہاری عزت کا بہت خیال تھا لیکن مَیں اور وقار جانتے تھے کہ جب بھی تم ہم سے ملتی ہو تو وہ زیدی اور امجد کو بتا دیتی ہے۔ وہ دونوں گھٹیا سے اسکینڈل بنا کر دوسرے لڑکوں کو بتاتے ہیں اور جب لڑکے معنی خیز نظروں سے تمہاری طرف دیکھتے اور دبی زبان سے ان اسکینڈلوں کا ذکر کرتے ہیں تو شمسہ تم سے فوراً کہتی ہے۔ "دیکھا مَیں نہ کہتی تھی" پھر تم کئی کئی دِن وقار سے نہ بولتیں۔ اور تو اور تم مجھ سے بھی جھگڑتیں کہ مَیں بھی تمہاری بدنامی میں شریک ہوں۔ جانے شمسہ کیا کیا مسالے لگا کر تمھیں ہمارے خلاف اُکساتی ہو گی۔ میری طرف سے تمہارے سب شکوک جلدی ہی دُور ہو جاتے تھے، کیونکہ تمھیں اعتماد تھا کہ مَیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مگر وقار کی بے گناہی پر تمھیں یقین نہیں آتا تھا کیونکہ شمسہ جھوٹ نہیں کہہ سکتی تھی۔ چنانچہ شمسہ کی ہدایات کے مطابق تم وقار سے نہ ملتیں۔

"مس شمسہ نے آپ کو اجازت دے دی ہے۔" وقار نے اتنا جل کر کہا تھا کہ میرا جی چاہا کہ اس کے جلے دل کو مرہم بنا کر اپنے اجنبی دوست کے دِل پر رکھ دوں "جانیے مس نینو! اگر آپ کو میرے پاس کسی نے دیکھ لیا تو آپ خواہ مخواہ بدنام ہو جائیں گی۔"

"تم مجھے سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آئی لائیک یُو سو مچ۔"

"اوہ —— واقعی —— مس نسرین عرفان علی، آپ پہلے فیصلہ کر لیجیے کہ آپ کو مجھ میں اور جناب زیدی صاحب میں کون زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

وہ یہ کہہ کر جانے کس طرح اپنے دِل پہ جبر کر کے وہاں سے چلا گیا تھا۔ اتنا خوبصورت لمحہ خود بخود زنجیر کے پاس آ گیا تھا جانے اس نے اسے باندھنا کیوں مناسب نہ سمجھا۔

مَیں بہت خوش تھا کہ وقار نے "زیادہ اچھا لگنے" کے سلسلے میں میرا نام نہیں لیا۔ یونیورسٹی میں سب یہی جانتے تھے کہ مَیں اور تم محض اچھے دوست ہیں ورنہ میری حالت بھی زیدی اور وقار کی طرح ہوتی۔ شمسہ جیسی چالاک خاتون بھی حقیقت کی تہ تک نہیں پہنچی تھی اور کسی لڑکے کی زبانی مجھے باتوں باتوں میں پتا چلا تھا کہ زیدی اور امجد کا خیال ہے کہ ایک ایسا لڑکا جس کے سر کے بال بہت پڑھنے کے باعث جھڑ رہے ہوں اور کوئی کوئی بال سفید بھی، موٹے شیشوں والی بھاری عینک لگاتا ہو اور ہر روز لائبریری سے اپنے وزن سے دوگنی کتابیں سائیکل کیریر پر رکھ کے لے جاتا ہو، اس کے ساتھ پروفیسروں کے سوا اور کسی کو محبت نہیں ہو سکتی۔ ایسے لڑکے محض لڑکیوں کو امتحان کے بارے میں ٹپس دینے اور دوستی کا دم بھرنے کے کام آتے ہیں —— لیکن وقار کو میرے بارے میں غلط فہمی ہو گئی تھی۔ شاید تم نے اس کے سامنے میری زیادہ تعریف کی ہو گی۔ وہ مجھے کہنی سے پکڑ کر سیدھا کیفے ٹیریا میں لے گیا تھا اور چائے کی پیالی پر اس سلسلے میں مجھ سے استفسار کیا تھا۔ مَیں نے مختلف انداز سے بڑے پُر زور الفاظ

میں کہا تھا کہ مَیں پڑھنے لکھنے والا آدمی ہُوں اور نینو ایسی معمولی لڑکی کے لیے میری دیوانگی ناممکن ہے تو اُسے یقین آگیا تھا۔ اور اس نے الفاظ کو پُوری طاقت سے چباتے ہُوئے کہا تھا۔

"مسٹر رفیق۔ نٹ اپ۔ وہ عام سی لڑکی نہیں ہے —— وہ تو —— وہ تو —— وہ تو زندگی ہے" —— "آئی ایم سوری۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔"

"تم بہت اچھے انسان ہو"۔ ہلکے سے نشے میں گھلا ہُوا فقرہ اس کی زبان سے پھسل گیا تھا۔ اس نے دیوار کی طرف مُنہ کر کے اطمینان کا ایک گھونٹ پیا۔ "وہ تو زندگی ہے۔"

اور اب جب کہ وقار زندگی سے رُوٹھ کر چلا گیا تھا تو تم اس کے "بہت اچھے انسان" کے پاس آگئی تھیں۔ تمہاری آنکھیں گیلی تھیں۔ مَیں نے نظروں ہی نظروں میں تمہاری آنکھیں خشک کرتے ہُوئے کہا تھا —— وقار بہت بُرا ہے۔ زیدی اس سے بھی زیادہ —— اور مَیں —— مَیں بھی تو اچھا نہیں ہُوں کیونکہ مَیں وقار کے جانے سے بہت خوش ہُوں۔

"کیا ہُوا ہے نینو؟" جیسے مجھے کچھ پتا ہی نہ تھا۔

"کچھ نہیں رفی —— اب اس میں میرا کیا قصور ہے؟" تم سر جھکا کے میرے پاس بیٹھ گئی تھیں۔

"نینو —— تم ایک بار فیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں کہ ——"

اگر مَیں تمہاری جگہ ہوتا تو میرے لیے بھی فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا ——

وقار ایک ایسا لڑکا تھا جسے اگر تم ستارے توڑ کر لے آنے کو کہتیں تو وہ اپنی قوّتِ ارادی سے یہ بات بھی کر دکھاتا۔ وہ انٹر یونیورسٹی ٹینس چیمپئن شپ محض اس لیے جیت گیا تھا کہ تم میچ میں موجود تھیں تمھیں یاد ہوگا کہ تم نے یہیں اسی میز پر بیٹھ کر میچ سے دو دِن پہلے کہا تھا کہ وکی اگر تم ٹینس جیت جاؤ تو کتنا مزہ آئے۔

اُس نے تم سے وعدہ لیا تھا کہ تم ضرور آؤ گی۔ اُس نے تینوں سیٹ سکس نا ٹ پر جیتے تھے۔
وہ اس لیے بے حد خوش تھا کہ تم بہت خوش تھیں۔ لیکن جب اس نے گورنر سے ٹرافی لا کر تمہارے پیروں میں رکھ دی تھی تو زیدی نے امجد کو کہنی ماری تھی۔ امجد نے معنی خیز نگاہوں سے شمسہ کو دیکھا تھا اور شمسہ نے جانے تمہارے کان میں کیا زہر گھولا تھا کہ تمہارے گال سُرخ ہو گئے تھے۔ تم وقار کی طرف دیکھے بغیر اُٹھ کر چلی گئی تھیں۔ اور وقار اس گیند کی طرح ہو گیا تھا جسے پُوری قوت سے کِک لگائی گئی ہو۔ اس نے میری طرف بڑی مظلوم نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو پھر بھی نہیں آئے تھے بلکہ ہلکے سے نشے میں گُھلے ہوئے غصّے کے سُرخ ڈورے تیر گئے تھے۔ وہ صرف گراؤنڈ پر پڑی ٹرافی کو گھور رہا تھا۔ اور جب گورنر چلا گیا تھا تو اس نے ریکٹ سے ٹرافی کو اس زور سے شاٹ لگائی تھی کہ ٹرافی کا ڈھکنا دیوار کے ساتھ ٹکرا کر ٹیڑھا ہو گیا تھا اور وہ سب کو حیران چھوڑ کر اپنی کار میں آ گیا تھا ——— اُس نے یہ کمائی تمہارے لیے کی تھی۔ مجھے بہت صدمہ ہُوا تھا۔ لیکن جب میں وقار کا یہ انعام اٹھا کر اُس کے ساتھ کار میں بیٹھ رہا تھا تو ایک اجنبی سی آواز میرے کانوں میں ہنس ہنس کر کہہ رہی تھی ——— بلڈی فراڈ ——— چار سو بیس ——— کیوں پوز کر رہے ہو ——— تم تو خوش ہو ——— بہت خوش ———

اور پھر یہی آواز میرے کانوں میں اس وقت بھی گونجی تھی جب وقار نے سٹوڈنٹس یونین کے افتتاحیہ ڈنر میں تمہیں خاص طور پر مدعو کیا تھا اور تم نہیں آئی تھیں۔ اُس نے محض تمہاری خواہش کو پُورا کرنے کے لیے انتخابات لڑے تھے۔ وہ زیدی اور امجد کی پُرزور مخالفت کے باوجود اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے تمہاری خواہش کو پُورا کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جب وہ پہلے اجلاس میں افتتاحیہ تقریر کر رہا تھا تو شمسہ کے ماتھے پر تیوریوں اور زیدی کی غیر حاضری کے باوجود تمہارا سر فخر سے اُونچا ہو گیا تھا۔ اور اس دن جب تم ڈنر پر نہیں آئی تھیں اور وقار کے لیے یہ تقریب محض تمہاری غیر موجودگی

کی وجہ سے ناکام تھی تو زیدی اور امجد بے حد مسرور چہکتے پھر رہے تھے۔ اور وقار کے چہرے کے اضطراب کو یوں دیکھ رہے تھے وہی اس کے تاگے ہلا رہے ہیں۔ وقار کی افسردگی مجھ پر بھی محیط تھی لیکن وہ اجنبی سی آواز پھر میرے کانوں میں سیندھ لگا رہی تھی —— بلڈی فراڈ —— بنو نہیں —— تم تو بہت خوش ہو، وقار رو رہا ہے اور تمہارا دل خوشی سے ناچ رہا ہے کہ ہنو کا چہرہ لاتعداد نگاہوں کی چیونٹیوں کا نوالہ نہیں بنے گا۔

وقار دوسرے روز تمہیں پیچ بلوسم کے نیچے بیٹھا دیکھ کر سیدھا تمہارے پاس گیا تھا ——

"تم کل شام کیوں نہیں آئیں"
تم کچھ خوف زدہ سی ہو گئی تھیں لیکن دنیا کی کوئی طاقت تمہیں سچ بولنے سے نہیں روک سکتی تھی ——

"شمسہ ..... شمسہ شمسہ ——"

وقار اس زور سے چیخا تھا کہ پیچ بلوسم کی کئی پتیاں کانپ کر ٹوٹ گئی تھیں۔ تم شرمندہ سی ہو کر فوراً وہاں سے چلی گئی تھیں اور وقار غصے میں کانپتا ہوا آندھی کی طرح میرے قریب سے ہو کر یونین کے دفتر میں چلا گیا تھا۔

اگلے روز ہمیں پتا چلا کہ وقار نے صدارت سے استعفیٰ دے دیا ہے۔ میرے اور تمہارے سوا باقی سب حیران تھے۔ تمہارا خیال تھا وہ پاگل ہے شاید اس کا یہی پاگل پن تمہیں اچھا لگتا تھا۔ شاید اسی لیے تم نے اُسے اپنے ذہن کے بندی گھر میں رکھا ہوا تھا۔ اسی لیے تم کلاس کے بعد خود اس کو لائبریری میں لے کر آئی تھیں اور جب وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد وہاں سے لوٹا تو اُسے اپنے استعفے کا کوئی صدمہ نہیں تھا۔ اس نے آ کر مجھ سے کہا تھا —— "یار دراصل اُسے مجھ سے محبت ہے" زیدی بھی اپنے بارے میں یہی سوچتا ہے —— مسٹر —— اور میرا اجنبی دوست بھی —— میرا جی چاہتا

تھا کہ وہ جیب سے دوائی کی شیشی نکال کر ایک ڈوز پیئے لیکن میں جانتا تھا کہ وہ نہیں پیئے گا۔ کیونکہ اس وقت اس کا خیال ہے کہ دراصل تمہیں اس سے محبت ہے اور اب شراب کا خیال آتے ہی اس کے سامنے دو چھوٹے چھوٹے ہاتھ جڑے ہوئے آئیں گے اور تم اس کے کان میں سرگوشی کرو گی —— "پلیز رُوکی —— شراب نہ پیا کرو — اب نہ سہی، کل سہی، پھر سہی۔ جب اس کے آج کے احساس کا نشہ اُتر جائے گا تب وہ اپنے خلاؤں کو شراب ہی سے پُر کرے گا نا —— اور تم ایک بار پھر مجھ سے کہو گی —— "رِفی، دِکی کی شراب چھڑا دو ——"

جانے لڑکیاں اپنے الیکٹرونز کے لیے رفاہِ عام کے کام کیوں کرنا شروع کر دیتی ہیں۔ تم نے مجھ سے بھی تو کہا تھا کہ رِفی سگریٹوں سے سرطان ہو جاتا ہے —— نہ پیا کرو —— اور میرے اجنبی دوست نے مجھ سے یہ کہہ کر نیا سگریٹ میرے ہونٹوں میں لگا دیا تھا کہ اگر انسان روز کے تئیس سگریٹ پیئے تو کہیں دس پندرہ سال تک یہ بیماری ہوتی ہے اور اتنی دیر تک تو نینو بھول بھی جائے گی کہ اُس نے کسی کو سگریٹ پینے سے منع کیا تھا اور مَیں نے ہنسی میں تم سے کہا تھا —— "اگر مَیں نے سگریٹ چھوڑ دیے تو صاف ہوا میرے پھیپھڑوں کے لیے اجنبی ہو گی اور مَیں سانس نہیں لے سکوں گا۔" اور جب تم نے شمسہ سے اطلاع ملنے پر وقار سے، دانتوں میں پکڑے ہوئے رومال اور بے پناہ سن سن کے استعمال کا حوالہ دے کر اُس کی شراب نوشی کی تردید چاہی تھی تو وہ صاف مان گیا تھا کہ ہاں وہ پیتا ہے۔ تم اس کی سچائی سے بہت متأثر ہوئی تھیں کہ تمہاری طرف سے ناپسندیدگی کے خطرے کے باوجود اُس نے تم سے کچھ نہیں چھپایا۔ تم نے ہاتھ جوڑ کر اس سے شراب چھوڑ دینے کی التجا کی تھی۔ لیکن اُس نے بہت ہی دھیمے لہجے میں کہا تھا: "مس نینو عرفان علی! انسان کی زندگی سے اگر کچھ نکل جائے تو وہاں ایک خلا سا پیدا ہو جاتا ہے۔ جو اگر پُر نہ ہو تو پھر کانٹا بن کر رُوح میں چبھتا رہتا ہے۔"

"آپ کی زندگی میں کونسا خلا ہے ؟"

آپ کو یہ پُوچھنے کا کوئی حق نہیں، کیونکہ آپ ددرا ہے پر کھڑی اس بات کا فیصلہ نہیں کر پائیں کہ آپ کو کس طرف جانا ہے ——— جس روز آپ کو یہ یقین ہو جائے گا کہ آپ شراب کی جگہ میری جیب میں آسکتی ہیں تو بخدا چھوڑ دوں گا - اور آپ کو یہ بھی بتا دوں گا کہ آپ نے کس خلا کو پُر کیا ہے -" اور تم روہانسی ہو کے ایک بار پھر اپنا مسئلہ مجھ سے حل کروانے آئی تھیں ——— رِنّی ——— وِکی سے شراب چھڑوا دو۔

کیوں بینو ——— تم کیوں چاہتی تھیں کہ وقار ایک بہت بڑا خلا بن کر رہ جائے۔

——— وقار کو اپنی اُمّی سے بے پناہ محبت تھی اور اس کی امّی اس کے ابا کے دیئے ہُوئے دُکھوں میں جل کر خاک ہو گئی تھیں اور اب اس کا اپنے گھر کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا - ایک سال سے اُس نے اپنے ابا کی شکل تک نہیں دیکھی تھی۔ اُسے اپنے نام کی زمینوں سے پیسے آجاتے ہیں اور وہ شراب کے ہلکے سے نشے میں مسرور ابا کا دیا ہُوا خلا پُر کرتا رہتا ہے ——— اِتم جو اس خلا کو پُر نہیں کر سکتیں کیونکہ اس کو اپنے ابا کے فریم میں جڑا ہُوا دیکھنا چاہتی ہو ——— اسے پینے دو نینو، حتیٰ کہ اس کا جگر چھلنی ہو جاتے اور اُسے دُنیا جہان کے خلاؤں سے نجات مِل جائے ——— اپنی زندگی میں تمہارے غیر واضح نقوش کو دیکھ کر اُس کا من بھی چاہتا ہے - اگر تمھیں اس کی یہ عادت اچھی نہیں لگتی تو اس سے راہ و رسم چھوڑ دو۔ لیکن تم یہ بھی تو نہیں چاہتی تھیں کہ اس کا تعلق تمہارے ساتھ نہ رہے - کیوں کہ زبدی میں وہ کچھ نہیں تھا جو وقار میں تھا - تم وقار کے ساتھ اپنی وابستگی سے آسمان میں پرواز کرنے لگتی تھیں، کیونکہ اس میں یونانی دیوتاؤں کے سے جسم سمیت وہ سب کچھ تھا جو طالب علمی کے زمانے میں ایک ذہین لڑکی تصوّر کر سکتی ہے - لیکن وہ زبدی کی طرح بال بکھرائے اداس اداس نہیں رہتا تھا۔

اُس کی آنکھوں میں غم نہیں تھا اور وہ مدبّر لوگوں کی طرح "سوبر" بھی نہیں تھا۔ اُس نے زیدی کی طرح کبھی تم سے نہیں کہا تھا کہ وہ تمھارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ اور تم جو اتنی بھولی سی لڑکی شمسہ کے کہنے میں آ گئی تھیں ——— "کیا تم وقار کے پاس کھڑی باتیں کرتی رہتی ہو۔ وہ دیکھو، وہ زیدی جا رہا ہے جو تمھاری بھڑکائی ہوئی آگ میں اندر ہی اندر جل رہا ہے ——— یہ اُداسیاں تم ہی نے اُسے دی ہیں۔" تم یہ سُن کر خود زیدی سے ملی تھیں۔

"آپ ہر وقت اداس کیوں رہتے ہیں۔ آپ کو کیا غم ہے؟"

زیدی کی آنکھوں میں اور بھی ویرانے پھیل گئے تھے۔ وہ صرف چُپ بیٹھا تھا۔ نظریں جھکائے ہُوئے۔

"اگر مَیں نے آپ کو کوئی دُکھ دیا ہے تو مجھے افسوس ہے۔"

جانے تمھیں اس شدّت سے کیوں احساس تھا کہ کسی کو تم سے دُکھ نہ پہنچے زیدی جانتا تھا کہ تم بہت حسّاس ہو۔ تم نے غلام گردش میں مری ہوئی چڑیا دیکھ کر سارا دِن اداسی میں گزارا تھا۔ انتہائی سردیوں کے موسم میں ایک بوڑھی فقیرنی کو تم نے اپنا سوئیٹر اسی وقت اتار کے دے دیا تھا۔ اسی طرح لوگوں کی مصیبتیں تمھارے اعصاب پر سوار ہو جاتی تھیں۔ تو پھر تم زیدی کو جو مجسم کشکول بن کر تمھارے سامنے بیٹھا تھا، کس طرح خالی ہاتھ جاتے دیکھ سکتی تھیں لیکن مَیں جانتا ہُوں کہ تم اسے صرف بھیک ہی نہیں دے رہی تھیں بلکہ جب وہ تمھارے پاس بیٹھ کر دُنیا کی خوبصورت ترین لڑکی ثابت کرتے ہوتے تمھیں اپنے الفاظ کی رتھ پر بٹھا کر دُور آسمان کی پہنائیوں میں لے جاتا تھا تو تمھارا جی انھی جالوں میں بندھے رہنے کو چاہتا۔ لیکن جب زیدی کچھ اس طرح تمھارے آنچل میں چھپنے کی کوشش کرتا جیسے چُوزہ مرغی کے پیروں میں چھُپ جاتا ہے تو تم اپنے دل کو دوبارہ ٹٹولتیں اور تمھیں وہاں زیدی بھی نظر نہ

آتا ـــــ وہاں تو کسی کا عجیب دھندلا سا خاکہ تھا جسے تم پہچاننے سے قاصر تھیں جس کے آنچل میں خود پناہ لینا چاہتی تھی۔

وقار تمہیں زیدی کے ساتھ باتیں کرتا دیکھ کر بہت کڑھا کرتا تھا اور ایک دن جب تم نے چھٹی کے بعد مسلسل دو گھنٹے زیدی سے باتیں کی تھیں تو اس کے جانے کے بعد وقار بڑے غصے میں تمہارے پاس گیا تھا۔ "مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم ایک عام فلرٹ سی لڑکی ہو۔"

"وہ کہتا ہے کہ ـــــ نینو میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ـــــ تو میں کیا کروں؟"

"نینو۔ نینو ـــــ اس کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ تمہیں نینو کہہ کر مخاطب کرے۔"

"ڈونٹ بی سلی ـــــ میں کسی کو تم اتنا پسند نہیں کرتی ـــــ"

"یونیورسٹی میں ایک سو ایک لڑکی مجھے پسند کرتی ہے ـــــ"

"مجھے زیدی اچھا لگتا ہے۔"

تب وہ تم سے بہت لڑا تھا، اور تمہیں بہت برا بھلا کہہ کر تمہارے سامنے اس نے جیب سے شیشی نکال کر خوراک پی تھی اور پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے کہا تھا ـــــ "پھر کہتی ہے، شراب نہ پیا کرو۔" اور اس کا قہقہہ حلق سے نکل کر بیچ ہلوسم میں غروب ہو گیا تھا اور تم میرے پاس آ کر اتنا روئی تھیں کہ تمہارا ننھا سا رومال بالکل بھیگ گیا تھا۔ "بی ـــــ یہ لوگ مجھے سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے۔ یہ وِکی اپنے آپ کو کیا سمجھتا ہے جیسے میں اس کی ملکیت ہوں۔"

"میں جانتا ہوں۔ یہ دونوں بالکل گدھے ہیں۔ اتنی اچھی لڑکی کو پریشان کرتے ہیں۔" پھر میں نے تمہارے اعصاب کو ہلکا کرنے کے لیے کہا۔ "اگر تم اپنی فارن پالیسی تبدیل کر دو تو تمہیں اتنی اذیت نہ ملے۔"

"میں کیا کروں۔"

"تم دونوں کو ہمدردی نہیں دے سکتیں اس طرح دونوں دکھی رہیں گے اور تم

کسی کو ناراض بھی کرنا نہیں چاہتیں۔ سب سے پہلے تو تم یہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ دُنیا میں انسان ہر ایک کو خوش نہیں رکھ سکتا۔ دُنیا میں کئی لوگ ہوں گے جنھیں تم سے محبت ہو گی۔ کیا تم ہر ایک کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر سکتی ہو جیسا کہ وہ چاہیں گے۔" تم نے بڑی معصومیت سے نفی میں سر ہلا دیا تھا۔ "پھر تمھیں ایک کو مایوس کرنا ہی پڑے گا۔"

"دراصل دونوں مجھے اچھے لگتے ہیں۔"

واقعی ان حالات میں اگر مَیں تمھاری جگہ ہوتا تو میرے لیے بھی فیصلہ کرنا ناممکن ہو جاتا، کیونکہ تمھیں زیدی کے ہاؤس ٹیسٹوں میں اوّل آنے کی تکنیک کا پتا نہیں تھا۔ وقار فیل ہوتے ہوتے بچا تھا کیونکہ وہ تمھاری طرف سے اپنے مستقبل کے بارے میں غیر متعین تھا۔ اور تمھیں یہ بھی پتہ نہیں تھا کہ رات کے تاریک لباس میں زیدی کا روپ کیا ہوتا ہے۔ مَیں نے بھی تمھیں یہ نہیں بتایا تھا کہ اُداس سی معصومیت لیے ہوئے عیسٰی کے ماسک کے پیچھے بہت بھیانک چہرہ ہے جو دن کے کھیل کے بعد رات کو اتر جاتا ہے۔ مَیں نے تم سے یہ بھی چھپایا تھا کہ وقار نے زیدی کی تم سے محبت پر بہت غور و خوض سے ریسرچ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ زیدی کی تم سے محبت دراصل امجد کا سیاسی سٹنٹ ہے۔ ورنہ کیا وجہ تھی کہ تم اسے وقار سے پہلی ملاقات کے پورے دو ماہ بعد زیدی کو کلاس میں تمھاری موجودگی کا پتا چلا تھا! امجد فسٹ ایئر میں وقار سے ہسٹاریکل سوسائٹی کا الیکشن ہارنے کے بعد اس بُری طرح سے اس کے پیچھے پڑا تھا کہ زندگی کے ہر راستے پر وقار کے راستے میں چٹان بن کر آجاتا تھا۔ وقار کو تمھارے ساتھ اتنا خوش دیکھ کر امجد نے یقیناً زیدی کو تمھاری موجودگی کا احساس دلایا ہو گا۔ اور اُسے یہ ثابت کر دیا ہو گا کہ زندگی میں تم سے بہتر ساتھی ملنا ناممکن ہے۔ جب وقار کے ہونٹوں پر مسکراہٹوں کی پتیاں مرجھاتی تھیں تو مَیں امجد کے ہونٹوں پہ پھول کھلتے دیکھتا تھا۔۔۔۔ لیکن تمھارے لیے تو وہ عیسٰی تھا۔

وقار سے تو تمھیں بعض وقت خود بھی خوف آتا تھا۔ اور تم نے مجھ سے کئی مرتبہ ذکر

کیا تھا کہ اس کی حرکات اور سکنات میں بے ساختگی تمھیں بہت پریشان کرتی ہے اس کے ساتھ بلندیوں میں اُڑتے ہوئے تمھیں ہر وقت یہی خدشہ رہتا تھا کہ جانے یکدم مُوڈ بدل جانے پر وہ تمھیں وہیں چھوڑ دے۔ زیدی کو خود بھی تمھاری طرح مرغی کے پروں کی ضرورت تھی اور وقار کی موجودگی میں تم خود کو بہت غیر محفوظ محسوس کرتی تھیں۔ اس لیے مَیں تمھارے انتخاب کے سلسلے میں مُسکراتا ہُوا اس شخص کے بارے میں سوچنے لگتا جس کی شکل اس سے ملتی جلتی تھی جو میرا اجنبی دوست تھا۔ اور جس کے ساتھ تم نے یونیورسٹی میں سب سے پہلے بات کی تھی۔

وہ دن مجھے کبھی نہیں بھولے گا کیونکہ ایک بہت بڑے شاعر کے بقول مَیں نے اس دن واقعی جنم لیا تھا۔ تم یونیورسٹی میں نئی نئی داخل ہُوئی تھیں اور بعض لڑکوں نے عادت سے مجبور ہو کر تمھیں ہر روز چھیڑنا شروع کر دیا تھا۔ مجھے تم پر اتنا رحم آیا تھا کہ مَیں نے ایک دن انھیں بہت شرمندہ کیا۔ لڑکوں نے اپنی توجہ رفتہ رفتہ دوسری لڑکیوں پر مرکوز کر دی تھی تو تم میرا شکریہ ادا کرنے آئی تھیں۔ اپنے آپ کو تمھارے اتنا قریب دیکھ کر مجھے اتنا عجیب سا احساس ہُوا کہ میرے جی نے ہر وقت تمھارے قریب رہنے کو چاہا۔ اور مَیں نے تم سے کہا تھا ——— مس نسرین! اگر آپ کو کسی قسم کی بھی دِقّت پیش آئے تو مجھ سے کہہ دیا کریں۔

پھر مَیں مس نسرین کہتا کہتا تمھیں نینو کہنے لگا کیونکہ تم نے مجھے بتایا تھا کہ حال ہی میں تمھارے ابّا کی وفات نے تمھیں دُنیا میں بالکل تنہا چھوڑ دیا ہے۔ اُمّی کا ساتھ بھی تمھارے ابّا کی جگہ نہیں لے سکا۔ اور تمھیں یُوں محسوس ہوتا ہے جیسے اتنے خوبصورت سے بنے ہُوئے مکان کی چھت بڑے پُراسرار طریقے سے غائب ہو گئی ہے ——— اُمّی کو ہر وقت تمھاری فکر رہتی ہے۔ تم پر اتنا اعتماد ہونے کے باوجود انھیں یونیورسٹی کی بوسیدہ دیواروں سے ڈر لگتا ہے ——— مَیں نے تمھیں یقین دلایا تھا کہ مَیں ان بوسیدہ دیواروں کو تمھاری اُمّی کے جذبات سے کبھی ٹکرانے نہیں دوں گا ——— ہم دونوں کبھی

کبھی پیچ بلوسم کے نیچے بیٹھے گھنٹوں گفتگو کیا کرتے۔ اکنامکس سمیت دنیا جہان کے ہر موضوع پر۔ جب لڑکے دبی زبان میں ایک دوسرے سے میرے اور تمھارے تعلقات کا ذکر کرنے لگے تو میں نے تم سے کہا تھا کہ ہمیں ایک دوسرے سے نہیں ملنا چاہیے۔ تمھاری سہیلیاں بھی تو تمھیں تنگ کرتی ہیں۔ لیکن تم نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ مجھے تو پتا ہے تاکہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہے۔ وقت ان لوگوں کو یقین دلا دے گا۔

پھر ایک دن تم نے مجھے بتایا تھا کہ اس اسمارٹ سے لڑکے نے جس کا نام وقار تھا تم سے اچانک آکر کہا تھا کہ اُسے تم سے محبت ہے۔ ہر روز پہلے سے زیادہ غور سے تمھیں دیکھتا رہا ہے اور اگر وہ اپنے اس جذبے کا اظہار نہ کرتا تو وہ اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا۔ یہ سنتے ہی میرے اتنے اچھے گزرے ہوئے چند لمحوں میں قیامت آگئی تھی۔ وقار نے تم سے یہ بھی کہا تھا کہ اگر تم اس سے ملتی رہو گی تو اس کی زندگی بہت اچھی گزرے گی ورنہ اس کی تباہی کی ساری ذمہ داری تم پر ہوگی۔ تم نہیں چاہتی تھیں کہ کسی کی بربادی کی ذمہ دار تم ہو، تم جو اتنی اچھی لڑکی تھیں تم نے وقار سے اکثر ملنا شروع کر دیا تھا تاکہ اس کے لیے ترتیب دن سنور جائیں۔ پھر جانے کس خوف سے مجبور ہو کر میں نے جلدی میں ایک حماقت کر دی تھی۔ میں اور تم پیچ بلوسم کے نیچے بیٹھے ہوئے تھے تم لان کے وسط میں مرمر کے اس بُت پر جس کا نام زندگی تھا، نظریں جمائے یہ کہہ کر کچھ سوچ رہی تھیں کہ وقار، تمھاری امّی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا رہا ہے۔ میں نے یونیورسٹی کی گرتی ہوئی بوسیدہ دیوار کو واحد سہارا دیتے ہوئے۔ بڑے سیدھے سادے الفاظ میں کہا تھا کہ اگرچہ مجھے تم سے محبت نہیں ہے لیکن پھر بھی مجھے محسوس ہوتا ہے کہ تم میری زندگی کو حسین تر بنا سکتی ہو۔ مجھ سے شادی کرو گی؟ تم نے بُرا مانے بغیر بڑے پیار سے کہا تھا کہ تمھارا میرے بارے میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں ہے اور تم نے مرمر کی زندگی

سے نظریں ہٹا کر اُمید ظاہر کی تھی کہ ہم دونوں پھر بھی بہت اچھے دوست رہیں گے ——
یہ سُن کر یونیورسٹی کی بوسیدہ دیواریں تم پر گرنے کے بجائے مجھ پر آن پڑی تھیں اور میں نے بے پناہ قہقہے لگاتے ہُوئے سوچا تھا کہ مَیں آئندہ کبھی تم سے ایسی بات نہیں کہوں گا۔ اپنی سوچ کا انداز بدل ڈالوں گا۔ بعض چیزیں بعض لوگوں کے لیے نہیں ہوتیں ——
تم میرے قہقہے سے پریشان ہو گئی تھیں ——

"رَنی —— یُوں نہ ہنسا کرو۔ پچھلے چند دِنوں سے تمھاری ہنسی اتنی عجیب......

...... کیوں ہو گئی ہے۔"

مَیں نے مرمر کی زندگی کو اپنی نگاہوں سے جلاتے ہُوئے کہا تھا۔ "میرا خیال تھا زندگی کا بُت بہت ٹھوس ہے۔ اسی لیے مَیں نے اپنی پُوری قوت سے اسے اُٹھانا چاہا تھا۔ لیکن یہ تو پیرس کا گھٹیا ماڈل ہے —— کھوکھلا —— بہت ہلکا —— مجھے اسی پر ہنسی آتی ہے۔"

"بہرحال یُوں نہ ہنسا کرو۔ مجھے تمھاری ہنسی کا کھوکھلا پن ہانٹ کرتا ہے۔"

میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ بات کس طرح ختم کروں۔ "اچھا ایک شرط پر —— مجھے تمھارے کٹے ہُوئے بال اچھے نہیں لگتے۔ تم انھیں بڑھا کر جوڑا بنایا کرو —— اور مَیں اس طرح ہنسنا چھوڑ دوں گا۔"

مَیں صحیح ہنسی کا ڈھنگ بھول گیا تھا۔ پھر بھی تمھارے بڑھتے ہُوئے بالوں کو دیکھ کر کبھی کبھی سچی ہنسی میرے مُنہ میں اُمنڈ آتی تھی۔ لیکن جب تمھارا یہ فقرہ میرے کانوں میں گونجنے لگتا —— "مجھے اُمید ہے کہ ہم دونوں بہت اچھے دوست بنے رہیں گے۔" تو یہ سچی ہنسی پھر چُپ کے غاروں میں اُتر جاتی۔

پھر جب زیدی بھی تمھاری زندگی کا کمزور دروازہ توڑ کر تمھیں اپنانے کے لیے آیا تو تمھاری اُلجھنوں میں اور بھی اضافہ ہو گیا کیونکہ اُس نے تم سے کہا تھا کہ

وہ تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تم بعض وقت بہت پریشان ہو جاتیں کہ اگر ان تمام حالات کا امّی کو پتا چل گیا تو کیا ہوگا۔ وہ تمہارے متعلق کیا سوچیں گی؟ جب تمھیں ان اُلجھنوں کا کوئی حل نہ ملتا تو تم اتنی اداس ہو جاتیں کہ مجھے محسوس ہوتا کہ تم میرے سینے پر سر رکھ کر رونے لگو گی۔ میرے مشوروں کے باوجود تم ان دونوں سے ملتی رہی تھیں ——— تمھیں بھیک دینے کی عادت تھی۔ وقار نے تم سے کئی مرتبہ کہا تھا اگر تم اسے اتنا ہی پسند کرتی ہو تو شمسہ اور زیدی وغیرہ سے ملنا چھوڑ دو۔ تمہارے پاس اس کا وہی ایک گھسا ہُوا جواب تھا۔ کہ وہ لوگ تمہارے دوست ہیں۔ اگر انھوں نے کبھی نہیں کہا کہ مَیں تم سے ملنا چھوڑ دوں تو پھر تم کیوں اصرار کرتے ہو ——— وقار بہت ہی جوش میں آکر کہتا ——— "بس ختم۔ اس لڑکی نے مجھے بے پناہ تنگ کیا ہے ——— اس کا خیال ہے کہ میں بھی زیدی کی طرح اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ——— ہُوں" اور میں اسے جیب سے شیشی نکالتے ہُوئے دیکھ کر سوچتا ——— تم واقعی زندہ نہیں رہ سکتے۔ شراب تمھاری جیب سے نکل کر تمہارے جگر کو ڈستی رہے گی۔ پہلے تم اپنی امّی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے اور اب نینو کے بغیر ——— فرق یہ ہے کہ تمھاری امّی تمھیں بھیک نہیں دیتی تھیں اور نینو دان دَاتا ہے ——— تم دونوں بھکاری ہو اور مَیں کشکول نہیں ہوں ———

تمھیں یہ جان کر بہت دُکھ ہوتا تھا کہ لوگ اتنے عجیب کیوں ہیں کہ کسی کے بارے میں سیدھی سادی سوچ نہیں رکھ سکتے۔ جب ایک لڑکی یا لڑکا ملتے ہیں تو وہ کیوں خواہ مخواہ سمجھ لیتے ہیں کہ بارود کے پاس آگ آگئی ہے۔ اور پھر ہر لڑکا کیوں آگ کی صورت میں بارود کے پاس آتا ہے۔ دُنیا میں لڑکوں کے ساتھ محض دوستی نہیں ہو سکتی؟ تمہارے ان شکووں کا میرے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ تمھاری اپنی باتوں نے میری زبان کاٹ دی تھی۔ جس دن سے تم نے اُمید ظاہر کی تھی کہ ہم دونوں دوست رہیں گے تو اس دن میری بھی آنکھوں میں ناچتے تمام خواب سینما سٹل بن کر رہ گئے تھے۔ مَیں

نے تمھیں اپنے ساتھ بڑے خوبصورت روپ میں دیکھا تھا ــــــ میں اور تم رُوح کو گھائل کر دینے والے ایک ویران سے جنگل میں بھٹک رہے ہیں۔ وہ ویرانہ ایک بھٹکتی ہوئی رُوح کی طرح ہولناک ہے۔ میرے ساتھ کے باوجود تم کبھی کبھی خوف سے لرز کر میرے سینے کی سِل پیچھے چھپ جاتی ہو۔ چلتے چلتے تمھارے پاؤں میں آبلوں کے پھول کھِل گئے۔ میں نے بڑی ضد کے بعد تمھیں گود میں اُٹھا لیا ہے۔ میں بھی بہت تھکا ہُوا ہوں لیکن پھر بھی میری یہی خواہش ہے کہ تمھارے اوپر سینے کی چھت بنائے اسی طرح لیے پھروں لیکن سنسان رات کو ایک بہت بڑا طوفان جھنجھوڑ رہا ہے اور تاریکی کو چاٹتی ہوئی بجلی کی زبانیں طوفان کی آرتی اُتار رہی ہیں۔ میں نے تمھیں اپنے جسم میں محفوظ کر لیا ہے۔ دُور ایک چراغ کی لَو سسکیاں لیتی نظر آتی ہے اور میں لوہے کے ٹکڑے کی طرح اس روشنی کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہوں۔ نزدیک جانے پر چراغ کی لَو میں وہ مکان واضح ہوتا جاتا ہے جس سے یہ روشنی آ رہی ہے۔ اس مکان کی شکل مجھ سے ملتی جلتی ہے۔ میرا اجنبی دوست ــــــ تم میرے بازو کی ڈھال میں محفوظ بے دھڑک اس مکان میں داخل ہو گئی ہو اور اس وقت جبکہ یہ لرزتا ہُوا مکان، طوفان اور بے پناہ بارش کے تیروں کو اپنے سینے پر سہہ رہا ہے! میں تمھاری پیشانی کے عین وسط کے تِل پر ہونٹ رکھ کے پوچھتا ہوں ــــــ اسے کبھی کسی نے چوما ہے؟ تم نظریں جھکا کے نفی میں سر ہلا کر بڑے پیار سے اپنا سر میرے سینے پر رکھ دیتی ہو۔ اور میں سوچتا ہُوں کہ کتنا اچھا ہو اگر تمھارے ماتھے کا تِل پھسل کے تمھارے بیچ بلوسم کی پنکھڑیوں ایسے ہونٹوں پر آ جاتے۔

اب میں نے ایسے خواب دیکھنے چھوڑ دیے ہیں ــــــ آخر ہم لوگ کیوں لڑکیوں کے ساتھ سیدھی سادی دوستی کے معنوں میں نہیں سوچ سکتے ــــــ لیکن میرا اجنبی دوست بہت ضدی ہے۔ وہ اب بھی ایسے ہی جاگتے ہُوئے خوابوں کے ویرانوں میں بھٹکا کرتا ہے۔

پھر ایک دِن یونیورسٹی میں اتنا شدید زلزلہ آیا کہ دیواریں دیمک زدہ کتابوں کی طرح بھر گئی تھیں۔ ییچ بلوسم کے درخت پر بجلی گر گئی تھی اور ایک مرتبہ تو مرمری زندگی بھی اپنے پیڈسٹل سے اُکھڑ گئی تھی۔

ہُوا یُوں تھا کہ تم شمسہ اور دوسری لڑکیوں کے مجبور کرنے پر اُن کے ساتھ پکنک پر چلی گئی تھیں۔ یہ محض اتفاق ہی تھا کہ اس پکنک کا انتظام زیدی اور امجد نے کیا تھا۔ دوسری صبح جب کیفے ٹیریا میں امجد اور زیدی ساتھ والی میز پر بیٹھے وقار کی طرف کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر اس پر کنایوں میں طنز کر کے کل کی پکنک کا ذکر کر رہے تھے تو وقار نے چند منٹ برداشت کرنے کے بعد زور سے کرسی پر گھوم کے کہا تھا ـــــ "شٹ اَپ"۔

زیدی کا رنگ زرد ہو گیا تھا۔ امجد اب بھی مُسکرا رہا تھا۔ وقار نے الفاظ کو دانتوں میں شدّت سے دباتے ہُوئے بڑی دھیمی آواز میں "زیدی صاحب ذرا میرے ساتھ باہر چلیے۔" اس کے کان سُرخ ہو گئے تھے۔ زیدی نے امجد کی طرف جیسے دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ـــــ تم بھی آؤ۔ "نہیں مسٹر امجد آپ کا آنا ضروری نہیں۔"

"جاؤ زیدی۔ یہ تمھیں کوئی ضرر نہیں پہنچائے گا۔"

"رُنی۔ تم ہمارے ساتھ آؤ۔ تم گواہ ہو گے۔"

ہم باہر آ رہے تھے تو پاس بیٹھے ہُوئے ایک لڑکے نے بڑی حیرانی سے امجد سے پُوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں ـــــ اُن کا کوئی آپس کا جھگڑا ہے۔"

میری سمجھ میں بالکل کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وقار کیا کرنا چاہتا ہے۔ تم اور دوسری لڑکیاں شاید لیڈیز روم میں تھیں۔ اسی لیے ہم ییچ بلوسم کے نیچے آ گئے۔ وقار نے اپنی کتاب سے بلیڈ نکالتے ہُوئے زیرِ لب کہا۔ "آج میں فیصلہ کر کے ہی چھوڑوں گا۔"

زیدی جیسے ہپناٹائز ہوا کھڑا تھا۔ "زیدی صاحب ہیں نے اور آپ نے ایک دوسرے کا سایوں کی طرح پیچھا کیا ہے۔" اُس نے سائے کی طرح سرگوشی کی۔ "آج ایک سائے کو ہٹ جانا چاہیے۔"

"کیا مطلب ؟" زیدی کی زبان کانپی۔

"مَیں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ مجھ سے کتنا زیادہ نیلو کو چاہتے ہیں۔" اُس نے مسکراتے ہوئے بلیڈ کی دھار اپنے رومال پر آزمائی اور پھر بلیڈ کو درمیان سے دو ٹکڑے کر کے ایک حصّہ زیدی کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ "مَیں اپنی نبض کاٹوں گا، آپ بھی کاٹیے، جو زندہ رہے گا جیت جائے گا۔"

زیدی کے ہاتھوں میں بلیڈ خشک پتی کی طرح کانپ رہا تھا۔

"کیا بیوقوفوں ایسی حرکت کر رہے ہو وقار —— یہ فلمی باتیں ہیں، اب شعولے کی کا زمانہ نہیں —— کیوں تماشا بنتے ہو۔"

"تم کچھ نہیں، تم خاموشی سے صرف دیکھتے رہو، تم گواہ ہو —— یہ منظر کچھ لمبا ہو کر بور ہو گیا ہے۔ آج ڈراپ سین ہو ہی جانا چاہیے —— زیدی۔ زیدی صاحب —— وَن۔ ٹو۔ تھری۔"

میرے اجنبی دوست، میری کاربن کاپی نے لپک کر وقار کے ہاتھوں سے بلیڈ چھین لیا ہے۔ اور اپنی شہ رگ کاٹنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مَیں نے اُس کا ہاتھ پکڑا ہُوا ہے اور اس سے بلیڈ چھین رہا ہوں —— پگلے جو زندہ رہے گا جیت جائے گا۔ زندگی کا نام جیت ہے۔ مَیں نے بہت مشکل سے اُس کے ہاتھ سے بلیڈ چھینا ہے اور وہ بڑی خونخوار نگاہوں سے مجھے دیکھ رہا ہے۔

"—— تھری۔" وقار کی کلائی سے خون کی دھار پھوٹ بہی تھی۔ اور اُس نے انگوٹھے سے فوراً نبض دبالی تھی۔ زیدی کے ہاتھ میں بلیڈ اب بھی کانپ رہا تھا۔ گو۔ آدن

زیدی۔!" وقار چیخا۔ زیدی نے لمحہ بھر کے لیے بلیڈ کو دیکھا، پھر مجھے اور پھر وقار کو، اور بلیڈ پیچ بلوسم کی جڑوں میں پھینک کر کیفے ٹیریا کی طرف بھاگ گیا۔ وقار دیوانوں کی طرح ہنستا ہوا چیخا۔ "باسٹرڈ۔ اتنے Guts نہیں ہیں۔"

"تم تو بالکل پاگل ہو۔"

"پاگل نہیں مسٹر —— تم نے کبھی محبت نہیں کی اور تمھاری زندگی میں کبھی خلا نہیں آئے ورنہ تم اب تک اپنے خون کو پانی کی طرح بہا چکے ہوتے۔"

وقار پھر ہنسا ہے۔ میرے اس اجنبی دوست نے جس نے وقار سے بلیڈ چھین کے اپنی شہ رگ کاٹ لی ہے —— اب یہ کمبخت میرے خون پر زندہ رہے گا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو —— میری زندگی میں کوئی خلا نہیں، ورنہ میں اب تک ——"

کوشش کے باوجود میں اپنے پھیپھڑوں کو آہ بھرنے سے نہیں روک سکا۔ میں نے رومال سے بغل کے بالکل قریب اس کا بازو کس کے باندھا اور اس کو بدستور کلائی کو دبائے رکھنے کی ہدایت دے کر اس کی کار میں ہسپتال لے گیا۔ رگ بالکل معمولی کٹی تھی اور خون بھی زیادہ نہیں بہا تھا۔ پٹی کروانے کے بعد وقار نے مجھ سے وعدہ لیا تھا کہ میں تم سے اس کا ذکر نہیں کروں گا۔

اس دوپہر کو تم نے جماعت میں وقار کو پٹی باندھے دیکھا تھا تو تم متفکر سی ہو گئی تھیں۔ کلاس کے فوراً بعد تم نے اس کی وجہ پوچھی تھی تو وہ تمھیں بُت کے پاس لے گیا کہ وہاں بتائے گا اور وہاں سے ایک گھنٹے کے بعد لوٹ کر تم نے مجھے بتایا کہ وہ حسبِ معمول لڑ کر چلا گیا ہے۔ تم اس کے ساتھ بالکل رُوٹھ گئی ہو۔ تم نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تم اب ساری زندگی اس سے نہیں بولو گی —— جلاپے میں کسی کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ وہ کسی کو بُرا کہے۔ اس نے پکنک کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اسے تمھارے ساتھ بالکل محبت نہیں۔ وہ اینگلو لڑکیوں کے ساتھ گھومتا ہے۔ فلاش کھیلتا ہے اور بہت بڑا ہپوکریٹ ہے۔ پھر وقار نے بڑی تیزی

سے کہا تھا ——— "تم سمجھتی کیوں نہیں ——— مَیں تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں"۔

"شادی اور تم ایسے جنونی سے ——— جو پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ——— جو بات بات پر چلتا ہے، جس پر کبھی اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ اگر زیدی دُنیا کا گھٹیا ترین انسان بھی ہو تو مَیں اس کو تم پر ترجیح دُوں گی"۔

یہ سُن کر وقار کے ہونٹ سِل گئے تھے اور وہ چُپ چاپ اُٹھ کر سر جُھکائے کچھ سوچتا ہُوا چلا گیا تھا۔ تمھیں حسبِ معمُول اس کے دُکھ کا باعث بننے کا بہت دُکھ تھا تم میری تسلیوں کے باوجود اپنے آپ کو بہت کوستی رہتی تھیں ——— "رَتی ——— مَیں کیا کروں۔ یہ لوگ مجھے کیوں نہیں سمجھتے ——— مَیں کیوں اُن کی پریشانیوں کا باعث بنتی ہوں"۔

——— اَن داتا، یہ بھکاری بہت لالچی ہیں۔ یہ اور مانگتے ہیں ——— اور ——— اور!

اس شام وقار میرے ہاں زندگی میں پہلی بار آیا تھا۔ اس سے پہلے اس نے یونیورسٹی سے باہر کبھی مجھ سے ملنے کی ضرورت محسوس کی تھی نہ مَیں نے ——— وہ اتنے بڑے واقعے کے بعد بھی مُسکراتا رہا۔

"چلو باہر چلیں"۔

"اونہہ ——— بھیا۔ ایک مہینے کے بعد امتحان ہیں اور مَیں ———"

"یہ میری پہلی اور آخری خواہش ہے"۔ اُس نے کچھ ایسی التجا بھری نظروں سے کہا کہ مجھ سے انکار نہ ہو سکا اور وہ تھوڑی سی، بے پناہ تیز ڈرائیونگ کے بعد مجھے "ہیپی سولز" ریستوران میں لے گیا جہاں وہ بہت ہی پینے کے بعد اجنبی لڑکیوں کے ساتھ ناچتا رہا۔ بے حد تیزی سے گزرتے ہُوئے اجنبی لمحوں کے سامنے آرکسٹرا کی چیخوں کی بنیادوں پر قہقہوں کے کچے بند باندھتا رہا۔ پھر وہ جھُومتا ہُوا میرے پاس آ کر بیٹھ گیا

تھا۔ اور اس کی تھکی ہوئی سُرخ آنکھیں گیلی ہوگئی تھیں اور شراب میں بھیگے ہوئے الفاظ رک رُک کر اس کی زبان سے بہہ رہے تھے ——— "امّی ——— یہ بینو بہت بُری لڑکی ہے۔ بہت ہی قابلِ نفرت۔ زیدی بہت کمینہ ہے۔ مجھے اس سے نفرت ہے۔ یہ رتی میرا دوست ہے۔ امّی آپ مجھے بلا لیجیے نا ——— میں بینو کی نگاہوں میں اپنی زندگی کی جسٹی فائی نہیں کرسکا۔ میں آپ کے پاس آنا چاہتا ہوں۔ مجھے ——— بلا ——— لیجیے ——— نا ———" اس کا سر آہستہ آہستہ جھکتا ہوا میری گود میں آگیا۔ وہ بچّوں کی طرح سِسک سِسک کر رو رہا تھا۔ اس کی سِسکیوں میں مجھے کبھی اپنے اجنبی دوست کی سِسکیوں کی آواز سُنائی دیتی تھی اور کبھی اپنے قہقہوں کی ——— مرمر کی "زندگی" پیپر پینٹنگ کی ہے ——— بالکل کھوکھلی ——— مجھے بے حد ہنسی آرہی ہے کیونکہ وقار نے مجھے اپنا دوست کہا ہے۔

اس سے اگلے دن اور اس کے بعد پھر کسی بھی دن وقار یونیورسٹی میں نہیں آیا۔ ہم سب بہت حیران تھے۔ زیدی کچھ مطمئن سا نظر آتا تھا۔ تم اس کی غیر موجودگی سے پریشان اور اداس سی تھیں۔ میرا خیال تھا کہ اُس نے خودکشی کرلی ہے۔ شکر ہے کہ میں نے اپنا یہ خیال کسی پر ظاہر نہ کیا۔ کیونکہ چند دنوں بعد زیدی کو وقار کا ایک خط ملا تھا جس میں صرف ایک لائن لکھی تھی ——— "آخر تم جیت ہی گئے۔" خط کے کاغذ پر ایئر فورس کی مُہر تھی۔ جب میں نے تمھیں بتایا کہ وقار ایئر فورس میں چلا گیا ہے تو تمھاری حالت بالکل ایسی ہوگئی تھی جیسے تم نے ایک بار پھر غلام گردش میں مری ہوئی چڑیا دیکھ لی تھی۔ مجھے بھی بہت افسوس ہُوا تھا جیسے وقار نے واقعی خودکشی کرلی ہے۔

امتحانوں کے آخری پرچے کے بعد جب سارے چلے گئے تھے تو میں نے اور تم نے بیج بلوسم کے پھولوں سے مبرّا سبز چمکیلے پتّوں کی چھاؤں میں بیٹھ کر پچھلے دو سالوں کا جائزہ لیا تھا ——— تمھیں صدمہ تھا کہ زیدی نے امتحان نہیں دیا اور دو سال کی اتنی اچھی دوستی کے بعد شمسہ کے ساتھ تمھاری لڑائی ہوگئی ہے۔ میرا خیال تھا کہ امجد کے بنائے ہوئے،

وقار کی راہوں میں دیواریں چننے کے کھیل میں زیدی تمہارے لیے اتنا سنجیدہ ہو جائے گا کہ وہ اینگلو لڑکیوں کے ساتھ گھومنا بھی چھوڑ دے گا۔ امتحانوں سے ایک دن پہلے تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے آنسو پیتے ہوئے زیدی کی درخواست سننے کے بعد کہا تھا کہ —— زیدی یہ ناممکن ہے۔ قطعی ناممکن ہے۔ تم مجھے بہت پسند ہو لیکن مجھے تم سے محبت نہیں ہے۔ یہ کہہ کر تم وہاں سے فوراً چلی آئی تھیں کیونکہ تم سے زیدی کا یتیموں ایسا چہرہ نہیں دیکھا جاتا تھا اسی لیے زیدی نے امتحان نہیں دیا تھا —— اور اسی لیے تمہاری شمسہ سے لڑائی بھی ہو گئی تھی۔ شمسہ نے تمہیں بہت کوسا تھا کیونکہ اس کا اور امجد کا پراجیکٹ فیل ہو گیا تھا۔

"رِفّی! تم ہی سوچو نا —— میں زیدی سے کیونکر شادی کر سکتی تھی —— اس کو تو اپنے لیے کوئی خاوند ڈھونڈنا چاہیے۔"

تمہیں خود حفاظت کی ضرورت ہے۔ تم اس پر کس طرح اپنے آنچل کا سایہ کر سکتی ہو۔ میں نے مرمر کی "زندگی" کو اپنی آنکھوں میں سمیٹتے ہوئے سوچا تھا ——

دراصل میں ہی بہت بُری ہوں —— وِکی بے چارا میری وجہ سے اتنی خطرناک زندگی گزارنے پر مجبور ہو گیا۔ زیدی نے امتحان نہیں دیا۔ اور جانے کب تک نہیں دے گا —— میں نے تو کسی کو دُکھ نہیں دینا چاہا تھا۔ پھر بتاؤ نا رِفّی یہ سب کچھ کیوں ہوا۔ —— میں تو صرف یہی چاہتی تھی تاکہ وہ میری وجہ سے غمگین نہ رہیں —— تو پھر ——"

تم بھی مرمر کی "زندگی" کو اپنی آنکھوں میں سمیٹنے لگی تھیں۔ قہقہے میرے گلے میں اٹک گئے تھے۔ کیونکہ تم نے بڑی کوشش سے اپنے چھوٹے چھوٹے بالوں کا جوڑا بنایا ہوا تھا۔ "اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں تھا —— وہ لوگ ناسمجھ تھے۔ انھوں نے تمہارے رویے سے غلط مطلب اخذ کیا تھا۔ تم خواہ مخواہ کیوں اپنے آپ کو قصوروار سمجھتی ہو تم

نے انھیں بار بار یہ کہا تھا کہ تمھیں ان سے محبت نہیں ہے۔ اور اگرچہ پسندیدگی اور محبت میں ایک سیڑھی کا فرق ہوتا ہے لیکن یہ سیڑھی پھلانگنا بہت کٹھن ہوتا ہے۔ اس میں تو ان کی اپنی سمجھ کا قصور تھا۔ مَیں نے اسی قسم کی اور کئی باتوں سے پچھلے دو سال کے واقعات کے حوالے دے دے کر تمھیں تمھاری بے گناہی کا یقین دلایا تھا۔ جانے میری باتیں تمھیں اپیل کی تھیں یا نہیں بہرحال تم نے میری طرف اتنی احسان مند نظروں سے دیکھا تھا جیسے مَیں نے تم پر پچھلے دو سالوں کی گرتی ہوئی چٹانوں کو اپنے سینے پر روک لیا ہو ـــــ ہم کئی منٹ صرف ایک دوسرے کو دیکھتے رہے تھے۔ پھر مَیں نے اپنی نگاہوں سے پیچ بلوسم کے قدموں میں اپنے سینے کی چٹانوں کو دفن کرتے ہوئے پوچھا تھا ـــــ "نینو، تم نے اپنے بارے میں کیا سوچا ہے"

"پتہ نہیں۔ مَیں نے تو اپنی زندگی امّی کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ مجھ میں کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ وہ شاید ٹھیک ہی کہتی ہیں" تمھاری آواز کی اداسی مجھ پر محیط ہو رہی تھی۔ میرا صحیح مشورہ بار بار میری زبان پہ آ رہا تھا۔ لیکن پھر یہ سوچ کر کہ تمھارا میرے بارے میں اس قسم کا کوئی خیال نہیں تھا مَیں نے اس مشورے کے زہر کو آخری بار نگل لیا تھا۔ پھر تم بے حد گہری سوچ میں ڈوبی اُٹھی تھیں اور مرمریں "زندگی" کے پیروں میں کھلے ہوئے سفید گلاب کے پودوں سے دو پھول لے آئی تھیں۔ تمھاری آنکھوں میں بہت بھیانک خلا تھے۔ شاید وہ میری ہی آنکھیں تھیں۔

"نینو ـــــ ہم نے بہت اچھے دن گزارے ہیں"

میری آنکھیں خشک تھیں۔ لیکن میرے اجنبی دوست کی آنکھوں میں آنسو تھے اور تم نے صرف خاموشی سے سر ہلا کر دونوں کی اچھائی کی تصدیق کی تھی۔ "نینو ـــــ ہمارے درمیان سے یونیورسٹی کی زنجیر ٹوٹ گئی ہے۔ اَب مَیں تم سے کبھی مل سکوں گا"

شادی سے پہلے کنواری لڑکیوں کا کنوارے لڑکوں سے کالج کے علاوہ ملنا، میری امّی

کے نزدیک قابلِ اعتراض ہے۔ رزلٹ کے فوراً بعد میری شادی ہو جائے گی کیونکہ امّی اپنے فرض سے جلد از جلد سبکدوش ہونا چاہتی ہیں۔ پھر مجھ سے تمہارا ملنا میرے خاوند کی مرضی پر ہے۔"

خاوند —— بتم یہ سب کچھ کتنی آسانی سے کہہ گئی تھیں۔ تمھیں کیا معلوم کہ اس وقت دُنیا اپنے محور کے گرد گھومتی ہوئی اچانک رُک گئی تھی۔ بینو —— اگر وہ اجنبی شخص جو تمھارا خاوند کہلائے گا تمھیں نہ سمجھ سکا تو۔؟ تم جو اتنی معصوم، حساس اور پگلی سی لڑکی ہو۔ اگر تمھارا دِل دِن میں کئی کئی بار ٹوٹتا رہا تو کیا ہو گا؟ تم ہمیشہ بغیر چھت کے مکان میں کھڑی طوفانوں اور بارشوں میں ٹھٹھرتی رہو گی۔؟ نہیں بینو ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ورنہ مَیں بھی ایک ہانٹِڈ مکان بن کر رہ جاؤں گا۔ تو پھر —— تو پھر ——

لیکن میرے ہونٹ تو پرندے کے ٹوٹے ہوئے بازوؤں کے پَر ہیں اور تم نے اپنی قسمت کا فیصلہ امّی کے ہاتھوں میں دے دیا ہے۔ وہ جو کچھ کریں گی تمھارے لیے مناسب ہی ہو گا۔ اُن کی سوچ اور اُن کا انتخاب تمھارے لیے بہترین ہو گا۔ اور مَیں اپنے مکان کو ہر وقت سجائے اس وقت کا انتظار کروں گا۔ جب تمھارا ناسمجھ خاوند تمھارے دِل کی کرچیاں کر دے گا۔ اور تم سے کہے گا کہ اسے ٹوٹا ہوا دل نہیں چاہیے۔ —— تم میرے پاس چلی آنا۔ مَیں تمھارے دِل کی جگہ اپنا دِل رکھ دُوں گا۔ تم ہر مشکل میں میرے پاس آئی ہو اور اب بھی اسی آس پر جیوؤں گا کہ تمھیں اپنے دِل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے میری ضرورت ہمیشہ رہے گی۔ اگر تمھاری شادی کسی اور سے ہو رہی ہے تو اس میں دُنیا کی گردش رُکنے کی کیا تُک ہے —— بینو جی۔ تم فکر نہ کرو، بیچ بلوسم میں کبھی خزاں نہیں آئے گی —— مرمری "زندگی" ہمیشہ زندہ رہے گی اور مَیں اپنے مکان کے دروازے میں کھڑا ہمیشہ تمھارا منتظر رہوں گا۔

"کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" مَیں نے اجنبی دوست کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا تھا۔
"مَیں سوچ رہا ہوں کہ لڑکیوں کے ساتھ دوستی کتنی عجیب ہوتی ہے۔ لڑکوں کو تو انسان زندگی کے کسی روپ میں بھی مِل سکتا ہے لیکن لڑکیاں —— نینو! آخر لوگ کیوں نہیں لڑکیوں کے ساتھ سیدھی سادی دوستی کے معنوں میں سوچ سکتے؟"

"اس لیے کہ لوگ ساری عمر اپنے آپ پر شک کرتے رہتے ہیں —— رَفی —— آج آخری دِن بہت اچھی اچھی باتیں کرو تاکہ ہمارے خوشگوار دِنوں پر آج کے دِن کی مُہر ثبت ہو جائے۔"

مَیں پُرانے دِنوں کی زبانیں نچوڑتا ہوا رفتہ رفتہ لڑکیوں کی میکے سے روانگی پر آگیا تھا۔ جس لڑکی کی شادی عنقریب ہونے والی ہو اُس کے لیے شادی کے علاوہ اور کونسا موضوع دلچسپ ہو سکتا تھا! اور مَیں محسوس کر رہا تھا کہ میری باتیں سُنتے سُنتے تمہارے کانوں میں رفتہ رفتہ ڈھولک کی ہلکی ہلکی آواز اُبھر رہی ہے —— اس کی تال پر تم گیتوں کو ناچتا ہوا سُن رہی ہو، تمہارے ہاتھوں کی مہندی زندگی کا نیا رنگ بن کر تم پہ چھا رہی ہے، پھر کلیوں کی بارش میں تم سُرخ لباس پہنے روتی ہوئی چادر کے نیچے سے گزر کے کار میں بیٹھ رہی ہو۔ تمہاری امّی کی آنکھوں میں بھی تمہاری طرح آنسو ہیں۔ خوشی کے آنسو، جُدائی کے آنسو ——

تم یک لخت اُداس ہو گئی تھیں —— "نینو۔ نینو۔" یکدم خدا معلوم مجھے کیا ہُوا تھا کہ مَیں نے بے پناہ ضبط کے باوجود اپنی انگلی سے تمہاری ٹھوڑی کو سہارا دے کر تمہارا جُھکا ہُوا چہرہ اُٹھایا تھا اور یکدم جانے تمہیں کیا ہوا تھا کہ تم واقعی میرے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔ یہ خواب نہیں تھا، اسی لیے مَیں نے تمہارے سر کے گُنبَد کو اپنے سینے کی قبر سے فوراً علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا تھا —— "کیا بات ہے نینو۔؟"

"کچھ نہیں۔"

تم نے اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسو خشک کیے تھے اور پھر اپنے ہاتھ والے گلاب کے دونوں پھول مجھے پکڑا کے فوراً چلی گئی تھیں۔ تم نے کار کی طرف جاتے ہوئے پیچھے مڑ کر دیکھا بھی نہ تھا۔

اور پھر جب پیچ بلوسم کے درخت کے نیچے میری آنکھوں نے ان دونوں پھولوں کو سرخی دی تھی تو سورج مہندی کے لہو سے چہرہ سُرخ کیے فوراً غروب ہو گیا تھا کیونکہ میری مردہ انگلی میں تمھاری ٹھوڑی کی زندگی تھی۔ قحط زدہ سینے کے ساتھ تم چمٹی ہوئی تھیں اور میرے ہاتھوں کے کشکول میں گلاب کے دو پھول تھے۔

میں نے رزلٹ تک کے دِن گزرے ہوئے دِنوں کی لاشوں کو حنوط کرنے میں گزارے تھے نتیجے کے تیسرے دن مجھے دو خط ملے۔ ایک تو میرے یونیورسٹی میں نئے ریکارڈ سیٹ کرنے پر مُبارکباد کا خط اور دوسرا تمھاری شادی کا، جو کہ دوسرے مہینے کے تیسرے ہفتے میں ہو رہی تھی۔

میرے اچھے نتیجے کی وجہ سے مجھے فوراً ہی مرکزی حکومت میں نوکری مل گئی تھی کیونکہ دانشوروں کا خیال تھا کہ معاشیات کے معاملے میں میرا ذہن غیر معمولی ہے اور میں اپنی تمام کامیابیوں کو تمھارے نام معنون کر کے وہاں سے چلا آتا تھا۔

اگرچہ مصروفیت کی وجہ سے میں تمھاری شادی میں نہیں آسکا تھا لیکن میں نے تحفے کی صورت میں اپنا نمائندہ بھیج دیا تھا جو میں نے بڑی مشکل سے مرمر کی "زندگی" کی تصویروں کی مدد سے ملک کے بہترین بُت تراش سے بنوایا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے احتیاطاً ایک چٹ لکھ دی تھی ——— "اگرچہ یہ کھوکھلا نہیں ہے لیکن پھر بھی اگر تمھیں اس میں سے کبھی کبھی کھوکھلے قہقہوں کی آواز آئے تو اسے اپنے ڈرائنگ روم سے بن باس نہ دے دینا۔"

مجھے یقین ہے کہ جس وقت شہنائیوں کی چیخوں میں یہ بُت مُسکراتا ہوا تمھارے پاس آیا ہوگا تو تم نے یقیناً اس کے ساتھ کی چٹ پڑھ کر اپنے آنسوؤں سے اپنا سنگھار دھونے

کی کوشش کی ہوگی —— اس دن کی صبح بھی میرے لیے ہمیشہ کی طرح بڑی عام سی تھی۔ اور آج شام کی طرح خزاؤں کا زرد جھولا ساکن تھا، شوریدہ ہوائیں گنگ تھیں اور میں منسٹری آف اکنامک ایفئرز کے کمیٹی روم میں بیٹھا ایک بڑی اہم میٹنگ اٹینڈ کر رہا تھا۔

اب جبکہ وارڈ میں نیند کی دیوی دبے پاؤں گھوم رہی ہے اور میں تمہارے خط کو ہزارویں مرتبہ پڑھنے کے بعد بھی کسی نتیجے پر نہیں پہنچا کیونکہ میری سمجھ میں اس کا ایک حرف بھی نہیں آیا۔ اور مس بروس میری درخواست پر دوسری مرتبہ مجھے بتا رہی ہے کہ تمہارا خاوند سرمائے کے تمام لوازمات میں رچا ہوا ایک ایسا سوداگر تھا جو احساسات کی بھی قیمت مقرر کرتا تھا تم اس سے بہت مایوس تھیں۔ اس نے تمہارے دل کے کتنی کتنی ٹکڑے کر دیئے تھے۔ ہر نئی چھٹیں کے بعد تمہیں اپنا سب سے زیادہ عزیز دوست رفی تمہیں اور بھی شدت سے یاد آتا تھا لیکن تمہیں خط لکھنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی، مبادا تمہارا شوہر برا مان جائے —— تم نے اس کی ڈگر کی کٹھالی میں اپنے قدموں کو ڈھالنے کی بہت کوشش کی تھی مگر جسموں کے باوجود تم دونوں کی روحیں مخالف سمتوں میں پرواز کرتی رہی تھیں اور پھر جب تمہارے جسم میں نئی زندگی کروٹ لینے کی کوشش کر رہی تھی اور تمہیں ڈرائنگ روم میں پڑے بت سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی آوازیں سنائی دینے لگی تھیں تو تم اس کے سامنے گھنٹوں بیٹھ کر رویا کرتی تھیں۔ تمہارے خاوند کو اتنی فرصت نہیں تھی کہ وہ تمہاری آنکھوں کے چشمے تک پہنچ سکتا۔ اس کے بہنے کا راز سمجھ سکتا اسے خشک کر سکتا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ تمہیں وہ کچھ دے سکتا جو تمہیں زیبری اور وقار بھی نہ دے سکے تھے۔

اس کا خیال تھا کہ بیویوں کو پیسے کے سوا اور کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ تمہاری اداسی کو دیکھ کر وہ ہمیشہ تمہارے لیے کوئی قیمتی تحفہ لے آتا یا بینک کا چیک لکھ دیتا۔ اسے یہ احساس نہیں ہو سکتا تھا کہ تمہاری اداسی کی یہ قیمت نہیں بلکہ تمہیں اپنے اتنے سندر مکان کے اوپر ایک بہت مضبوط چھت چاہیے۔ جو تجارت کے سلسلے میں آج یہاں ہوتی

ہے اور کل وہاں —— اور میں بہت دُور تھا بہت دُور —— میرا رومال تمہاری آنکھوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا —— ہر نئے لمحے جب تمہارے آنسو ڈرائنگ روم میں پڑی مرمر کی "زندگی" کے پیروں کو چومنے لگتے تو تم میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے رومال کا تصور کرتی تھیں، یہ رومال پھیلتا ہوا سفید چادر بن کے تمہیں اپنی لپیٹ میں لے لیتا، تمہارے جسم میں جاگتی ہوئی نئی زندگی تڑپنے لگتی، مرمر کے قہقہے اور بھی بلند ہو جاتے۔ تم اس طوفان سے بچنے کے لیے اپنے اُوپر چھت تلاش کرتیں لیکن چھت بہت دُور ہوتی —— تجارت —— سوداگری۔ اور تم سوچتیں کہ جب تمہارا خاوند آ کر تمہیں اداس دیکھے گا تو وہ پھر ایک بنارسی ساڑھی کے بدلے تمہاری اداسی خریدنے کی کوشش کرے گا۔

پھر ایک روز تم نے ان تمام اذیتوں کا حل تلاش کرتے ہوئے سوچا تھا کاش تم شروع شروع میں میرا ہاتھ تھام کر مجھے اتنے ہی پیار سے کہہ دیتیں "ہاں رتی! میرا بھی یہی خیال ہے آؤ ہم دونوں مل کر زندگی کو دلہن بنائیں"، تم نے آنسوؤں کے سیلاب سے مرمر کی "زندگی" پر اس پچھتاوے کا داغ دھونے کی کوشش کی تھی۔ جب تمہارے جسم میں بیدار ہوتی ہوئی زندگی نے تڑپ تڑپ کر تمہاری وہی حالت کر دی تھی جو تمہارے خاوند نے کی تھی اور اس کے لیے بھی تمہارے دل میں وہی جذبات پیدا ہو گئے تھے جیسے کہ اپنے خاوند کے لیے تو مرمر کی "زندگی" اتنا ہنسی تھی کہ میرے پھیلتے ہوئے رومال کا کفن تم نے واقعی اوڑھ لیا تھا۔ چنانچہ تم نے بے پناہ گرم چیزیں کھانا شروع کر دیں۔ یونہی بے وجہ اُچھلنا کودنا شروع کر دیا اور پھر جب تم ایک روز چھ سیڑھیوں سے چھلانگ لگائی تھی تو تڑپتی ہوئی دوسری زندگی بے پناہ خون میں بہہ گئی تھی۔ اور تم نے اس خون کے دریا میں ڈوبتے ہوئے میرے رومال کا سہارا لیا ہوا تھا۔ مس بروس چوبیس گھنٹے تمہارے پاس رہی تھی۔ بلڈ ٹرانسفیوژن کے بعد تمہیں تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا تھا اور مس بروس تمہاری زندگی کے بارے میں بہت پُر امید ہو گئی تھیں۔ لیکن تمہیں یہ منظور نہ تھا۔ تم نے اس کے منع کرنے کے

باوجود یہ کہہ کر کہ آپ جانتی ہیں، مَیں نے اپنی یہ حالت جان بوجھ کر کی ہے . . . . . .

اُسے اپنے ماضی کی کتاب پڑھ کے سنانا شروع کر دی تھی۔ اُس نے تمہیں کئی بار منع کیا تھا "جب آپ ٹھیک ہو جائیں گی تو مَیں سب سنوں گی" مگر تم نے اپنی نقاہت کے باوجود اُسے میرے نام خط تک لکھ دیا تھا۔ وہ لمحہ بھر کے لیے وارڈ سے تمہاری دوائی لینے کے لیے گئی اور جب لوٹ کے آگئی تو اس کی سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ تم نے اُسے یہ سب کچھ بتانے میں اتنی جلدی کیوں تھی۔ تم پلنگ سے کچھ فاصلے پر گری ہوئی تھیں —— اور ——

کیا بکتی ہو مس بروس! یہ سراسر الزام ہے۔ بہتان ہے۔ زندگی اتنی ظالم نہیں ہو سکتی۔ نینو تو اتنی پیاری اور معصوم سی لڑکی ہے۔ اس پر اتنا ظلم کرنے کو کس کا جی چاہے گا؟ تم اپنے ڈاکٹر سے ملنے کے بعد سوڈو رومانٹک ہو گئی ہو اور خواہ مخواہ زندگی پر الزام لگا رہی ہو —" اوہ تو —— نہیں مس بروس۔ یہ ناممکن ہے۔"

"سچ مسٹر رفیق" مس بروس نے میرے چہرے پر بے یقینی پڑھ کر کہا ہے "یہ دیکھیے اس خط میں بھی تو نینو نے لکھا ہے ——" مس بروس بے حد دھیمی آواز میں خط پڑھتی ہے جیسے خدا کی عدالت میں کھڑی کسی ڈاکٹر کو مریض کی موت کا فیصلہ سنا رہی ہو۔

"—— اس بُت کے بے پناہ قہقہوں کے باوجود مَیں نے اُسے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔ میری زندگی میں یہی کچھ لکھا تھا۔ جو کچھ ہوا ہے ٹھیک ہوا ہے۔ مجھے صرف ایک بات کا صدمہ ہوا ہے اور وہ یہ کہ میرے دل میں اس دھندلی سی تصویر کے نقوش اب صاف طور پر اُبھر آئے ہیں۔ کاش مَیں نے تب اپنے آپ کو سمجھ لیا ہوتا اور تم سے کہہ دیتی —— آؤ رفیق ہم دونوں مل کر "زندگی" کا شنگھار کریں۔ دُلہن بنائیں۔ تم ٹھیک ہی کہتے تھے۔ جب مَیں اپنے آپ کو نہ سمجھ سکی تو اور کوئی مجھے کیا سمجھتا۔ امّی کا خیال بھی

صحیح تھا کہ مجھ میں کوئی فیصلہ کرنے کی صلاحیت ابھی پیدا نہیں ہوئی۔ اگرچہ میں نے تم سے رائے نہیں لی لیکن میرا یہ آخری فیصلہ غلط نہیں ہے۔ تم مانو گے کہ یہ میری کہانی کا بہت نیچرل اختتام ہے ——

نینو —— نینو —— میں نے بھی اپنی کہانی کے فطری انجام کو دوسرا روپ دیا تھا۔ میرا خیال نہیں تھا کہ تم میں بھی وقار اور زیدی کی طرح زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں —— میں جو اپنے گھر کو ہر روز صاف کر کے تمہارے انتظار میں کھڑا رہتا ہوں، میرا کیا بنے گا۔ اس مکان کا کیا بنے گا۔ اگرچہ آج کی شام بالکل ایسی ہی تھی جیسی کل کی —— آج کی اس تاریک رات میں اس وقت مجھے املتاس میں تمہارا زرد چہرہ سورج کے گھونگھٹ کی آگ میں خاک ہوتا نظر آ رہا ہے۔ رافیل کی میڈونا کا گھونگھٹ پر سجا ہوا تاج مٹی میں مل گیا ہے۔ املتاس میں سوئے ہوئے جلبشی پھر چیخنے لگے ہیں۔ پاگلوں کی طرح ناچنے لگے ہیں۔ اُن کے [illegible] سے سُرخ ہیں۔ اور فضا سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی ہے۔ دُور خوفناک آندھیوں کے دوش پر زرد پتے خزاں کے جھولے میں اُڑتے ہوئے آ رہے ہیں۔ رات کی تاریکی کو چاٹتی ہوئی بجلی کی لہریں طوفان کی آرتی اُتار رہی ہیں اور چنگھاڑتے ہوئے بادلوں سے مجھے ایک ہوائی جہاز کے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ اس جہاز میں وِکی بیٹھا ہے۔ وہ اخبار میں ملک کے بہت بڑے سوداگر کی بیوی کی موت کی خبر پڑھ کر طوفان میں اُڑ آیا ہے۔ کل ایئر فورس کے افسران حادثے کی تحقیقات میں مصروف ہو جائیں گے۔ اور زیدی جو امجد کے اکسانے پر تم سے محبت کرتا کرتا سنجیدہ ہو گیا تھا۔ اس دیوانے کے اداس رومانوی چہرے پر عیسیٰ کا ماسک پھر سے پھٹ کر تار تار ہو گیا ہے اور وہ محبت میں اینگلو لڑکیوں کے ہونٹوں کا زخم بنا طوفان کی بجلیوں کے کوڑے کھا کھا کر چیخ رہا ہے اور زندگی کی قبر میں آہستہ آہستہ اتر رہا ہے۔ ان سب سے آگے تمہارا خط اڑتا ہوا آ رہا ہے، جس سے بے حد سُرخ دو گلاب کے پھول چمٹے ہوئے ہیں۔ یہ خط اور پھول طوفان کو گھسیٹتے ہوئے یونیورسٹی

کی طرف لے جا رہے ہیں ــــــ نینو ــــــ نینو ــــــ تم کہاں ہو نینو ــــــ طوفان بہت قریب آگیا ہے ــــــ دیکھو پیچ بلوسم کا درخت جڑوں سے اکھڑ رہا ہے ، اور میرا مکان تمہارے انتظار میں طوفان کے تھپیڑے سہہ سہہ کر خستہ سا ہو گیا ہے ۔ مرمر کی ہوزندگی" کو طوفان اپنے ہاتھوں میں اُٹھا کر یونیورسٹی کی دیوار سے ٹکرانا چاہتا ہے ــــــ آؤ نا نینو تم بھی اُسے میرے ساتھ سہارا دو ــــــ طوفان کی طرح ــــــ اس سے کہو ــــــ ڈونٹ بی سلی ــــــ دیکھو نا میں کس طرح اس ہٹ سے چمٹا ہوا طوفان کے تھپیڑوں کو سہہ رہا ہوں ۔ تمہارا سہارا نہ ہونے کے باوجود میں اُسے اکھڑنے نہیں دوں گا کیوں کہ زندگی زندگی ہے اور زندگی کو بہر حال پیڈسٹل پر ہی رہنا چاہیے ــــــ میں اس کی کرچیاں نہیں ہونے دوں گا ــــــ اور اپنے ویران سے گھر میں کھڑا تمہارا ہمیشہ منتظر رہوں گا ۔ اب دیر نہ کرنا ــــــ اب دیر نہ کرنا ۔

چھیری

ثمینہ نے گرم پانی والے نلکے کو بند کر کے ٹب سے باہر نکلتے ہوئے سوچا کہ آخر جلیل
اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے ——— ہونہہ اوتھیلو کہیں کا،
اس کا تو ہے ایسا چیچک زدہ چہرہ تو یوں ہے جیسے جلا ہوا رس بسکٹ۔
اور وہ اپنی اس تشبیہہ پر مسکراتی ہوئی تولیے سے جسم خشک کرنے لگی۔
لیکن جب سنگھار میز میں لگے ہوئے آئینے کے فریم میں اسے ایک ایسی تصویر
نظر آئی جس کے انتہائی سفید چہرے پر کثرت سے سنہرے تل تھے اور سر کے سرخی مائل
سنہرے بال، کچھ اس طرح تھے جیسے اس نے ایک امریکی سرکس فلم کے مسخرے کے سر
پر دیکھے تھے۔ تو اس کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ یکدم یوں غائب ہو گئی....
جیسے آگ کے لپکتے ہوئے شعلے فضا میں۔ اس کو محسوس ہوا کہ یہ سنہری تل، سنہری
چیونٹیاں ہیں، جو دھیرے دھیرے اس کی مٹھاس چرا رہی ہیں۔
اس کے جسم پر چیونٹیاں رینگنے لگیں۔ اس کا جی چاہا کہ اپنی کھال ادھیڑ دے اور

سُرخ بالوں کو وِگ کی طرح اتار پھینکے۔ لیکن اس نے ہمیشہ کی طرح بے بس ہو کر سگریٹ سُلگایا اور سامنے کی کھڑکی کھول کر دُور نیچے پہاڑیوں کے ساتھ لپٹی ہوئی سڑک پر رینگتی ہُوئی لاریوں کی رُوں رُوں سُننے لگی۔ اس کے بالائی ہونٹ پر سنہری غبار میں پسینے کے قطرے چمکنے لگے اور اس نے سوچا —— خدا نے دُنیا جہان کی بدصورتی عنایت فرمانے کے لیے آخر مجھے ہی کیوں چُنا ہے۔

اپنے ڈیڈی کی نصیحت کے مطابق اس نے اپنی قسمت پر شاکر ہونے کی معمولی کوشش بھی کی تھی مگر مختلف قسم کی کریمیں اور دوائیاں اسے ہمیشہ پُر اُمید رکھتیں۔ اس کی جتنی رقم اپنے جسم کی چیونٹیوں کو اتارنے کی کوشش میں صرف ہوئی تھی، اس سے کسی کنواری لڑکی کی شادی بآسانی ہو سکتی تھی۔

کلب میں یا سوشل کاموں میں وہ لڑکے لڑکیوں کو آپس میں ایک پُرسکون انداز سے باتیں کرتے ہُوئے دیکھتی تو اس کے اپنے سُرخ بالوں سے اٹھتے ہُوئے ذہن میں طوفان سا آجاتا۔ سنہری تل اس کی رُوح اور جسم کو ڈسنے لگتے اور وہ سنہری غبار میں ابھرتے ہُوئے قطروں کو سینٹ کی خوشبو میں ڈوبے ہُوئے رومال سے پونچھتی اور اپنی کسی سہیلی کے بتائے ہُوئے نئے نسخے کے بارے میں سوچتی کسی بوڑھے خان بہادر، سر یا کرنل کے پاس بیٹھ کر مُسکراتی ہُوئی باتیں کرنے لگتی اور وہ اپنی گچھے دار مونچھوں میں اٹکی ہُوئی بیئر کی جھاگ ہاتھ سے صاف کرتے ہُوئے دوسرے ہاتھ سے اس کا ہاتھ پکڑ لیتا۔ وہ لڑکے اور لڑکیوں کے جھرمٹ کی طرف دیکھتی ہُوئی اس سے اپنا ہاتھ چھڑا لیتی، بوڑھا اپنے ہونٹوں پر بڑی پُرشفقت مُسکراہٹ گھسیٹ کے کھسیانا ہو کر کہتا —— معاف کیجیے گا۔ مجھے ذرا بیگم محمود سے کام ہے۔" اور وہ بیگم محمود یا بیگم احمد یا کسی بھی بیگم کے پاس چلا جاتا۔

ثمینہ بور ہو کر اسی تازہ نسخے کے متعلق سوچتی ہُوئی اپنے ڈیڈی کے پاس چلی جاتی

جو فلاش کھیل رہے ہوتے۔ وہ ان کے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے کھلاڑیوں سے ہنس ہنس کر باتیں کر کے بڑا سکون محسوس کرتی۔ مگر پھر بھی سامنے ہال میں، مدھم روشنی کے سائے میں رقص کرتے ہوئے نوجوان جوڑوں کو دیکھ کر اس کے دماغ میں اُبلتے ہوئے پانی کی طرح چھوٹے چھوٹے بلبلے پھوٹنے لگتے۔ اور وہ جوڑوں کی ایک دوسرے کے تنفس کی گھلتی ہوئی بھاپ میں جلنے لگتی۔ اس کی نگاہیں کسی کو ناچ کی دعوت دیتیں۔ وہ دوسری لڑکی کی طرف دیکھ کر آنکھوں ہی آنکھوں میں معذرت طلب کر کے چلا جاتا —— اور وہ ایک طرف بیٹھ کر سگریٹ پینے لگتی۔

یہ نہیں کہ اس کے ساتھ کوئی رقص نہیں کرتا تھا۔ جب بھی کوئی بڑی ترنگ میں ہوتا تو اسے اپنے بانہوں میں لے لیتا لیکن ایسے مواقع بہت کم آتے تھے یا بیگمات میں سے کوئی نہ آتی، یا پھر شراب، ماضی کی سنہری دھوپ میں اونگھنے والوں کی رگوں میں چنگاریاں بھر دیتی تو وہ اس کے کندھے پر جھک کر خمار میں اس کے سارے چہرے کو نظر انداز کر کے صرف اس کے ہونٹوں کی تعریف کیا کرتے۔

Your lips are like Cupid's Bow; Sweet Cherries

صرف ہونٹ —— جن کی خوبصورتی کا احساس وہ اپنے آپ کو نہیں ہونے دیتی تھی کیونکہ یہ کمان کیوپڈ کی بجائے رام چندر جی کی تھی، جس کے اوپر سنہری کائی میں جمی شبنم کی ٹھنڈک بڑی شدت سے محسوس ہونے لگتی تھی۔ اس کے لیے یہ ہونٹ بے کار تھے۔ چیری کی طرح "سویٹ" نہیں بلکہ نیم کی طرح کڑوے۔ ناچتے ہوئے جب بھی کوئی اس کے چہرے کے اس حصے کی تعریف کرتا تو وہ سوچتی کہ یہ ہونٹ اس کے چہرے پر طنز ہیں۔ خدا نے یہ بھی اسے کیوں عطا فرمائے —— اے ناچ کے رفیق، تم مجھ سے یہ چیری لے کر ڈبیا میں بند کر لو اور اس کے بدلے مجھے ایسی دوا لا دو، جو مجھے اس قابل بنا دے کہ میں بھی شہلا، بینا یا روبی کی طرح بادر، شمشاد یا اسی قسم کے کسی اپنے ہم عمر کے پُرخلوص

بازوؤں میں موسیقی کی لہروں میں بہہ سکوں ــــــ زندگی کے خوش گوار نغموں کو اپنا سکوں۔

"ہیلو سیمی ــــــ" باقر، شمشاد یا کوئی اور اپنی زندگی کا ہاتھ تھامے میز کی طرف بڑھتا ہُوا مسکرا کر اسے "وِش" کرتا۔

"ہیلو باقر ــــــ ہیلو شمشاد"

"سیمی ــــــ آؤ ہمارے ساتھ بیٹھو"

اُں ــــــ تمہارے ساتھ بیٹھوں ــــــ؟ اونہوں ــــــ مجھے پتہ ہے کہ تم اپنے پاس بٹھا کر مجھ سے اس قسم کی باتیں نہیں کرو گے جیسی تم شہلا کے ساتھ کرتے ہو ــــــ مَیں اور بھی پیاسی ہو جاؤں گی ــــــ مَیں پنّا کے ساتھ نہیں بیٹھ سکتی۔ مَیں تمہاری موجودگی میں روبی کی خوبصورتی برداشت نہیں کر سکتی۔ ان لوگوں کی زندگیاں بڑی شان دار سی ہیں۔ مجھے پتہ ہے کہ مَیں ان کی طرح تمہارے ساتھ محبت کرنے کے بعد کسی رنڈوے، بوڑھے لینڈلارڈ کے ساتھ شادی کر کے تمہارے ساتھ اور کا ہے گاہے اس کے ساتھ ریس کورس نہیں جا سکتی۔ کیوں کہ تمہیں مجھ سے پہلے محبت ہو گی نہ بعد میں اور یہ کہ تم اپنے خاندان کی کسی لڑکی کے ساتھ شادی کر کے بعد میں بھی مجھ سے ملتے رہو گے ــــــ اونہوں۔ میرا مستقبل متعین نہیں ہے۔ مَیں، مَیں ــــــ باقر تم میری ساری جائداد لے لو ــــــ نہیں شمشاد مَیں جانتی ہُوں کہ تم میری زمینوں اور کارخانوں کے ساتھ شادی کراؤ گے۔ اور مَیں اس کار کے مالک کی طرح ہو جاؤں گی جس کے حادثے کے بعد انشورنس والے ایک پائی نہیں دیتے ــــــ لیکن ــــــ لیکن ــــــ

لیکن ثمینہ ان کے پاس بیٹھ جاتی کیوں کہ اسے اپنے جسم پر جلتے ہُوئے تلوں کا احساس اور بھی زیادہ ہو جاتا۔ جیسے وہ آبلے بننے جا رہے ہوں ــــــ وہ ان آبلوں پر ان کی باتوں اور مسکراہٹوں کا مرہم لگانے لگتی ــــــ اس لیے کہ بات، باتوں سے کبھی آگے بڑھتی نظر نہ آتی تھی۔

اس کے ڈیڈی فلاش ختم کر کے اپنی سمی بیٹی کو ڈھونڈتے ہوئے ہال میں آتے اور دروازے میں کھڑے ہو کر اسے باتوں میں مصروف دیکھ کے بڑے اطمینان سے —— لوٹ جاتے۔ ان کی جھریوں میں چھپی ہوئی آنکھوں میں اُمید جگمگانے لگتی وہ جانتے تھے کہ روشنی کا منبع ختم ہو جائے تو اندھیرے چھا جاتے ہیں۔ اس لیے وہ اس روشنی کی بقا کے لیے کسی بیگم کو لے کر باہر باغیچے میں ٹہلنے لگتے۔ اُسے مختلف باتوں سے متاثر کرنے کے بعد اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہتے —— "ثمینہ اب ماشاءاللہ جوان ہو گئی ہے —— اس کا بندوبست کرنا چاہیے۔" اور بیگم کی آنکھیں کہتیں "ایسی باتیں تو دقیانوسی لوگ کیا کرتے ہیں"

ڈیڈی اس کی آنکھوں کو پڑھ کر فوراً اُس کے بازو میں بازو ڈال کر کہتے —— "تم جانتی ہو کہ ......"

"میں جانتی ہوں —— میں پوری کوشش کروں گی۔"

کلب کی بجلیاں ایک ایک کر کے بجھنے لگتیں۔ اور اُبلتے ہوئے قہقہے رفتہ رفتہ ختم ہو جاتے تو ثمینہ اکتا کے اٹھ کھڑی ہوتی۔ نوجوان لڑکیاں اپنے ڈیڈیوں اور ممیوں کے ساتھ چلی جاتیں۔ اور اس کے ڈیڈی اس کے کندھے کو پیار سے تھپکاتے ہوئے کار میں آ جاتے۔

پھر ہر روز، ہر روز اسی طرح ہوتا۔ کلب کے تمام باسی دُنیا سے منقطع اپنی زندگی کے اس محور سے کبھی نہ اکتاتے۔ لیکن ثمینہ اس محور کے گرد گھومتی گھومتی چکرا گئی تھی، اسے اپنا سارا ماحول اتنا خود غرض سا دکھائی دینے لگا تھا کہ وہ گھبرا گئی۔ اسے اس ماحول میں رہتے ہوئے بھی تنہائی کا احساس ہونے لگا تھا، اس لیے نہیں کہ وہ اس ماحول کی تہ تک پہنچ گئی تھی بلکہ اس لیے کہ وہ شہلا، پینا یا روبی نہیں تھی —— اس نے خود سے کئی مرتبہ وعدہ کیا، کہ وہ اب کلب نہیں آئے گی۔ کبھی ہوٹلوں میں نہیں جائے گی۔ اور سارے دن کی طرح شام کو بھی سویٹر بنا کرے گی، ناول یا کاپک پڑھا کرے گی، یا کوٹھی کے وسیع لان میں ٹینس کورٹ بنوا کر سہیلیوں کو وہیں مدعو کیا کرے گی۔ اور اگر کچھ نہیں تو صرف سگریٹ پیا کرے گی۔

کلب کی نسبت اسے گھر میں تنہائی کا احساس کم ہوتا تھا۔ لیکن جانے کیوں وہ ہر شام اپنے ڈیڈی کے ساتھ کچھ اسی طرح کھنچی چلی آتی، جیسے چڑیاں اژدہے کی طرف۔ شاید کلب کی ٹینس میں اور ہی لطف تھا ـــــ ثمینہ خود اس اژدھے کی خوراک بننا چاہتی تھی جو اسے نگلنے کے بعد غیر ہاضم سمجھ کر اُگل دیتا تھا ـــــ وہ کبھی اتنی مایوس نہیں ہوئی تھی کہ وہ اپنے ڈیڈی کی نصیحت کے مطابق اپنی قسمت پر شاکر ہو جاتی ـــــ

کریمیں، دوائیاں ـــــ اُمید ـــــ چیونٹیاں ـــــ مسخرے کی وِگ ـــــ امریکہ ـــــ اُمید ـــــ کیوپڈ کی کمان ـــــ سنہری کائی ـــــ کلب! اور سب کچھ ـــــ اسے خدا! کیوں ـــــ آخر کیوں۔ دُنیا جہان کی بدصورتی عنایت کرنے کے لیے صرف مجھے چنا ہے ـــــ میرے چہرے لے لو اور مجھے ـــــ مجھے ـــــ بھاگ جاؤ جلیل کے بچے ـــــ دفع ہو جاؤ او تھبیلو ـــــ مَیں تم سے تو بہتر ہوں ـــــ میری طرف یوں نہ دیکھو، یہ ناممکن ہے ـــــ تم اس قابل نہیں کہ یہ چہرے ڈبیاں بند کرنے کے لیے تمہیں دے دیے جائیں ـــــ میرا رنگ سیاہ نہیں، میرے چہرے پر چیچک کے گڑھے بھی نہیں اور میری دونوں آنکھیں سیدھی ہیں ـــــ آئندہ کبھی میری طرف اس طرح دیکھا تو مَیں ـــــ ہنہ جلا ہوا رس بسکٹ۔

یہ سوچ کر ایک مرتبہ پھر اس کے ہونٹ مُسکراہٹ سے پھیل گئے۔ سنہری غبار بھی خشک ہو گیا۔

"دِستمی بیٹی ـــــ کھڑکی میں اس طرح بغیر شال کے کھڑی نہ ہو۔ ابھی نہا کر آئی ہو۔"

"اوہ ـــــ اچھا۔" اس کو ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے جھرجھری آگئی۔ اُس نے آٹھویں سگریٹ کے آخری کش لے کر کھڑکی سے سگریٹ پھینک دیا، اور جلیل کی صورت آنکھوں میں لیے مُسکراتی ہوئی بالوں میں بُرش پھیرنے لگی ـــــ آئینے کے سامنے نہیں۔

"دِسمی بیٹی ـــــ آج شام تمہیں چیریٹی بال میں جانا ہے۔ کون سا لباس پہنو گی؟"

"کوئی سا بھی نکال دو"

"سیاہ، میسور سلک کی تاروں والی ساڑھی اور سفید بلاؤز نکال دوں۔ خوب جچے گی" گورنس نے بڑی شفقت سے اپنے لہجے میں سارا پیار سمیٹتے ہوئے کہا "ہاں بیٹیا ——— وہ جلیل میاں کا سکارف . . . . . "

ثمینہ نے تیزی سے کہا "ان کے گھر پہنچا دو"

اور گورنس اس کے کپڑے نکالنے کے لیے چلی گئی۔

اب اُسے اپنی تنہائی کا احساس شدید سے شدید تر ہونے لگا، وہ کچھ چپ چپ سی رہنے لگی۔ اور اس کے ڈیڈی کو ثمینہ کے رشتے کے بارے میں تمام بیگمات نے مایوس کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ سوچتے ہوئے کہ کاش ثمینہ کی ممی زندہ ہوتی تو رشتے کے لیے اتنی مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑتا، اپنی جان سے عزیز بیٹی کو پہاڑ پر گرمیاں گزارنے کا مشورہ دیا تاکہ ماحول کی تبدیلی سے ثمینہ کے رویے میں تبدیلی آجائے اور ڈیڈی کے سوچے ہوئے مستقبل کو قبول کر سکے۔ ان کا خیال تھا اس کا اس طرح گم سُم رہنے کا علاج صرف ایک ہے کہ اب وہ ان ہی کے کسی ہم عمر کے ساتھ شادی کر لے، انھوں نے اشاروں اور کنایوں پر یہ بات اُسے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن اس وقت اس کے جسم کی تمام سنہری شہد کی مکھیاں اڑ گئی تھیں، اس کے بال ان کے سوچے ہوئے مستقبل کی تاریکیوں سے سیاہ ہو گئے تھے اور اس نے صاف الفاظ میں ڈیڈی سے کہہ دیا تھا کہ وہ تمام عمر کنواری رہ سکتی ہے لیکن اپنے آپ کو ریفریجریٹر میں منجمد ہونے کے لیے نہیں رکھ سکتی۔ اس کا جی پہاڑ پر جانے کو نہیں چاہتا تھا کیونکہ وہاں نئے لوگوں سے مانوس ہونا بہت مشکل تھا، اس کے دوستوں اور سہیلیوں میں سے بہت کم لوگ وہاں جا رہے تھے اور جو جا رہے تھے، انھیں اس کی رفاقت کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ تو پھر خواہ مخواہ اور سہیلیاں بنانے سے فائدہ؟ سہیلیاں تو اس کی یہاں بھی بہت تھیں اور ان کے ساتھ اس کے تعلقات کشیدہ ہونے کی بجائے بہت اچھے

تھے، لیکن وہ ان کے ساتھ زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتی تھی۔ کیونکہ وہ ان کی موجودگی میں اور بھی تنہا ہو جاتی۔ اگرچہ لڑکیوں نے اس کی شکل و صورت کے بارے میں کبھی کچھ نہیں کہا تھا، اور اس کو اپنی بڑی عزیز دوست سمجھتی تھیں اور اس سے ہر وہ بات کہہ دیتی تھیں جو کسی سے کہنے والی نہیں ہوتی تھی۔ مگر پھر بھی ان کی باتوں سے اپنے احساسات پر سپرٹ لگانے کے بعد اسے جلن سی ہونے لگتی اور وہ باتوں کا رُخ بدل کر ہالی وڈ سے امپورٹ کیے ہوئے میک اَپ کے جدید طریقوں کے متعلق گفتگو کرنے لگتی۔

تب وہ اپنی گورنس کے ساتھ پہاڑ پر آگئی —— جلیل، اس کی امّی اور دو بہنیں اس کے ساتھ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔

یہاں آنے کے دو ایک دِن ہی بعد جلیل کی دونوں بہنیں اس کی سہیلیاں بن گئی تھیں۔ اس نے ان لوگوں کے ساتھ پندرہ دِن کی دوستی میں کلب وغیرہ جانے کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی۔ وادیوں سے اُٹھتے ہوئے بادل —— خنک ہوائیں —— پکنک —— فلم —— ہر روز کوئی نہ کوئی پروگرام —— اتنی مصروفیت۔ وہ بڑے پُرخلوص اور ملنسار لوگ تھے۔ ان کے نزدیک ثمینہ بڑی اچھی لڑکی تھی، کیوں کہ اس کے اپنے برتاؤ کے علاوہ جلیل نے اس چیز کا احساس اپنی امّی اور بہنوں کو دلا دیا تھا کہ اس سے بہتر ساتھی اُسے نہیں مل سکتی۔ جانے کیوں، جلیل اپنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے اسے گھورتا رہتا —— شاید اس لیے کہ ثمینہ کے ہونٹ بڑھتے بڑھتے اس کے سارے وجود پر چھا جاتے۔ شاید اس لیے کہ اپنی آنکھوں کو سیدھا کرنا اس کے بس میں نہ تھا، اور یا شاید اس لیے کہ وہ اپنے لیے خوبصورت بیوی خریدنے کا قائل نہیں تھا۔ خدا جانے تھوڑی ہی مدّت بعد یہ خیال اس کے دل و دماغ پر کیوں چھا گیا تھا کہ جو لڑکی اس سے شادی کرے گی وہ اس کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتی اور محبت کے بجائے اسے رحم کی نظروں سے دیکھے گی۔ وہ شادی کرے گا تو ثمینہ سے ورنہ کسی سے نہیں۔ لیکن اس نے اپنے ان جذبات کا اظہار

ثمینہ سے نہیں کیا تھا۔

ثمینہ کو دیکھ کر اسے انجانی مسرت محسوس ہوتی جیسے وہ اس کی التجاؤں بھری آنکھوں کو روند کر اپنی آنکھوں کے لیے روشنی حاصل کر رہی ہو اس کے ساتھ تنہا رائیڈنگ کے لیے اور سینما بھی چلی جاتی، محض اپنی آنکھوں کی روشنی کے لیے۔

وہ اتنی قربت کے باوجود اس سے بے حد دُور رہنا چاہتی تھی، لیکن جلیل اپنے بارے میں ثمینہ سے بھی زیادہ پُراُمید تھا، اس نے ثمینہ کی، دِل چُور چُور کر دینے والی باتوں کا کبھی بُرا نہیں مانا تھا۔ وہ ہر روز اس کے ہاں اس سے ملنے کے لیے آتا۔ اس کی بے رخی کو عورت کی مخصوص ضد پر محمول کرتا۔ جب وہ ہنسی ہنسی میں اس سے کہہ دیتی کہ وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ تو وہ اپنے سیاہ چشموں کے پیچھے آنکھوں پر پلکوں کے پردے ڈال کر چلا جاتا اور ثمینہ کے ہونٹوں پر جلیل کے لیے مخصوص مسکراہٹ جنم لے لیتی ——— "ایڈیٹ نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟"

اور آج صبح وہ اتنے خوشگوار موسم میں اس کے ساتھ گھوڑ سواری کے لیے گئی تھی۔

واپسی پر راستے میں اس نے ثمینہ سے کہا۔

"ثمینہ ——— انسان کی رُوح کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے"

ثمینہ نے دُور میدانوں میں اترتی ہوئی پہاڑیوں کو گھورتے ہوئے لمبا سانس لے کر عجیب انداز میں کہا ——— "میرا بھی یہی خیال ہے ——— اگر رُوح گھناؤنی ہو تو جسم کی خوبصورتی کس کام کی ———" اور جلیل سمجھا کہ اس کے سینے میں پڑا ہوا لوہے کا ٹکڑا پگھل گیا ہے ———

"تمہاری رُوح تمہارے ہونٹوں کی طرح خوبصورت ہے"

ثمینہ کو جھرجھری آگئی جلیل نے آج تک اتنی صاف بات نہیں کہی تھی ثمینہ کو یُوں محسوس ہُوا، جیسے اس نے بڑی فحش سی گالی دی ہے ——— اس نے دِل ہی دِل میں کہا ———

—— تم بھینگے ہی نہیں اندھے بھی ہو —— بیوقوف تم سنہری غبار کو نہیں دیکھتے جس سے میرے ہونٹ اَٹے ہُوئے ہیں —— تم نے میرا دل دکھایا ہے —— جلیل نے اس کی خاموشی کو نیم رضا سمجھتے ہُوتے کہا ”میری رُوح بھی بُری نہیں ہے —— ثمی مجھ سے شادی کرو گی —— ؟“

اس کے بالائی ہونٹ پر پسینے کے ننھّے ننھّے قطرے اُبھر آئے۔ اس نے چڑ کر بڑے غصّے سے انگریزی میں کہا —— ”رُوح —— ؟ مَیں رُوح کو چاٹوں گی —؟ تم نے میری ہتک کی ہے —— ہنچ بیک آف ناتردیم کے ساتھ زندگی نباہ سکتی ہوں، تمھارے ساتھ نہیں ——“ اس نے خشک گلے کو لعاب سے تر کرتے ہوئے گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ جلیل نے آہستہ سے کہا —— ”میری رُوح کے راستے تمھارے لیے ہمیشہ صاف رہیں گے“

گھر جا کر اس نے جلیل کا سکارف اتار کر پرے پھینک دیا۔ جو اس نے ٹھنڈ کے پیشِ نظر اُسے دیا تھا اور اپنے ساتھ عہد کر لیا، کہ دوبارہ اس سے نہیں ملے گی۔ جس چکّی میں وہ خود پِس رہی ہے اس میں جلیل کو بھی پسنا چاہیے۔

شام دھیرے دھیرے بادلوں کے دوش پر مشرقی پہاڑیوں سے کمرے میں سرکنے لگی۔ اس نے اپنا منک کوٹ گورنس کے ہاتھوں سے لیتے ہُوئے کہا ”ڈنر رینو کے ہاں کھاؤں گی“

اور کھانے کے بعد وہ رینو کے ساتھ ”مرینا“ میں آگئی۔ زندگی کی تمام مشکلیں، مسرّتوں کا لبادہ اوڑھے روشنیوں میں جگمگا رہی تھیں اور لوگ ہال میں لٹکے ہُوئے غباروں کے مانند ان مسرّتوں میں ڈول رہے تھے، رینو کا دوست آگیا اور وہ اس کے ساتھ فلور پر چلی گئی۔ ثمینہ نے اپنے پرس سے سگریٹ نکالے اور پینے لگی۔

ناچ —— تالیاں —— قہقہے —— چیریٹی بال —— سیلاب زدہ

لوگوں کو، مد چاہیے ___ سگرٹوں کا دھواں ___ ناچ ___ تالیاں ___

اس کا جسم اس کے دماغ کی طرح ٹوٹ رہا تھا۔ وہ میز پر اکیلی بیٹھی کوفی پی رہی تھی اور دُور ڈِنر سوٹ میں ملبوس وہ سمارٹ سا شخص اُسے گھُور رہا تھا جس نے وِسکی کی دوسری بوتل منگوائی تھی۔ ثمینہ اس کی طرف دیکھ کر بار بار نظریں جھکا لیتی اور اس کی انگلیاں بھری کا سل کی ڈبیا کے ساتھ کھیلنے لگتیں ___ اسے وِسکی میں ڈوبتے ہوئے انسان تمہیں میری طرح تنہا ہونے کا حق حاصل نہیں ہونا چاہیے۔ تم ناچتے کیوں نہیں ___ تم مجھے یُوں گھُور گھُور کے نہ دیکھو ___ تمہاری نگاہوں میں بڑی تپش ہے ___ وہ ڈولتا ہُوا اُس کے پاس آیا۔ "میرا نام اسد ہے۔"

"ہاؤ ڈُو یو ڈُو۔"

"اتنی اچھی رات میں آپ تنہا کیوں ہیں؟" اسد نے وِسکی گلاس میں انڈیلتے ہوئے کہا۔ اس کے الفاظ وِسکی میں گھُلے ہُوئے تھے۔ تالیاں ___ قہقہے ___ ثمینہ کو اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ "میرا نام ثمینہ ہے۔"

"یُو آر سو سویٹ، آپ کا کوئی پارٹنر نہیں ہے؟"

"جی ___ جی ___ اُن کی طبیعت آج ٹھیک نہیں تھی۔"

"عجیب اتفاق ہے۔ میری پارٹنر بھی نہیں آئیں۔" شراب کا ایک اور گلاس ___ باہر درختوں میں دھند اُلجھ اُلجھ کے قطرے بن کر ٹپک رہی تھی۔ اس نے ثمینہ کے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لیتے ہُوئے کہا۔ "آپ کی انگلیاں بڑی خوبصورت ہیں۔"

ثمینہ کے کان سنسنانے لگے۔ جانے کیوں اُسے اسد کی باتیں بڑی پُرخلوص معلوم ہُوئیں۔ شاید اس لیے کہ وہ جلیل نہیں تھا، اس نے جھُوٹ اور سچ پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہ سمجھی ___ وہ ان تمام باتوں کو سچ سمجھنا چاہتی تھی۔ رینو اور اس کا دوست ناچ ختم ہونے پر تالیاں بجاتے ہُوئے آ گئے۔ رینو کا دوست اسد کا

واقف تھا یہ ہیلو، ڈان جوآن "ثمینہ مال پر جاتے ہوئے اکا دکا لوگوں کو دیکھ رہی تھی۔

"آں — ہیلو —" اسد نے نظریں اٹھائیں۔

"ثمینہ از اے نائس گرل۔ میں جانتا ہوں تم تنہا نہیں رہ سکتے۔"

"او شٹ اپ۔"

"ثمینہ حیران ہو رہی تھی کہ پل بھر میں دنیا اتنی بدل کیوں گئی ہے۔

"تم ناچو گے نہیں —؟"

"اوں — ہوں — میں کسی کے ساتھ — باتیں — کرنا چاہتا ہوں۔"

"او کے۔"

"آپ وسکی پئیں گی —؟"

"میں نے کبھی نہیں پی۔"

"ایک پیگ — میری خاطر۔"

ثمینہ نے پھر کئی پیگ اس کی خاطر پیئے۔ اسد، اس کے بالوں اور اس کے چہرے کے نقوش کی تعریف کرتا رہا۔ اپنی پارٹنر کی بد تعریفی کرتا رہا جو اپنی کزن کے ساتھ کہیں چلی گئی تھی۔ اور اپنے متعلق بہت کچھ بتاتا رہا۔ مصری کے کوزے کے ساتھ چمٹی ہوئی چیونٹیاں ایک ایک کر کے غائب ہو گئیں اور اسد کی باتیں سن کر اُسے یقین آ گیا کہ پہلی نظر میں صرف سیلولائیڈ پر ہی نہیں بلکہ عام زندگی میں بھی محبت ہو سکتی ہے — اور دنیا اسے ایک دم بڑی حسین نظر آنے لگی "میں بہت دکھی ہوں — تم مجھے چھوڑ کر تو نہ جاؤ گی" ثمینہ کے کانوں نے یہ فقرہ پہلی مرتبہ سنا تھا۔ اسد یہ فقرہ کئی کانوں سے اتار چکا تھا۔

اس کی درخواست پر جب وہ بادلوں کے دوش پہ اڑنے لگی تو اس نے آنکھیں

بند کر کے آسمان کی نیلاہٹوں میں گھلتے ہوئے دیکھا کہ جلیل مایوسی کے اندھیرے غاروں میں لڑھک رہا ہے۔ آج اُسے وہ انسان مِل گیا تھا، جس کی تلاش اسے تمام عمر رہی تھی، بالکل اچانک، جیسے پہاڑوں کی بارش ـــــ جلیل صاحب! میرے چچیرے اسد کے رلیے تھے۔ سمجھے

شراب آہستہ آہستہ ثمینہ کے رُوئیں رُوئیں میں سرایت کر رہی تھی۔ سارا ماحول اس کے ذہن میں گھومنے لگا۔ جیسے فلم سے بھرے مووی کیمرے کو سٹینڈ پہ گھمایا جا رہا ہو۔ اس نے ناچتے ناچتے سر تھام کر اسد سے معذرت چاہی۔ اور دونوں ایک دوسرے کو تھامے لڑکھڑاتے ہوئے ہال سے باہر آ کر اپنی جگہ پہ بیٹھ گئے۔ ثمینہ نے کھڑکی کھول کر باہر جھانک کر دیکھا۔ سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے رکشا والے بارش سے بچنے کے لیے بوریئے اوڑھے، دھند میں پھیلی پھیلی روشنی کو آنکھوں میں سموئے اپنی جیبیں گرم کرنے کی فکر میں لگے ہوئے تھے۔

نم آلود ہوائیں اُسے تھپکی دینے لگیں اور اس کا سر اسد کے کندھے کے ساتھ لگ گیا۔ اسد نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر خمار میں کہا۔ "آپ ـــــ یہیں سو ـــ جائیے۔"

اس کی آواز یوں اکھڑی اکھڑی تھی جیسے خراب لاؤڈ سپیکر میں ٹرک ٹرک کر آواز آتی، بالکل بے ربط سی، مگر دونوں ایک دوسرے کا مفہوم سمجھ رہے تھے۔

"آں ـــــ" ثمینہ نے جمائی لے کر اُٹھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "میرا خیال ـــــ مجھے ـــ جانا ـــ۔"

اس کی سہیلی رینو اور اس کا دوست اپنے عضو عضو میں تھکاوٹ رچائے ہال سے آ گئے۔ رینو نے ثمینہ سے کہا۔

"تم تو بالکل آؤٹ ہو گئی ہو۔ آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔"

اسد نے کہا ـــــ "پھر کب ـــــ؟"

"کل صبح ـــــ آیئے ـــــ رائیڈنگ ـــــ۔"

"کہاں — ؟"

رینو نے اپنے دوست سے قلم لے کر سگریٹ کی ڈبیا پر اس کا پتہ لکھ دیا اور معنی خیز مسکراہٹ سے کہا — "مسٹر اسد — ! میں صبح فون پر بھی آپ کو یاد دلا دوں گی۔"

"گڈ بائی — "، ثمینہ نے رینو کا ہاتھ تھامتے ہوئے کہا۔

اب — ہمیشہ — ملتے رہیں گے —" اور

وہ میز پر لڑھک گیا۔

دوسری صبح وہ باہر چھوٹے سے باغیچے میں — اسد کے انتظار میں پھول چُن رہی تھی۔ دُور موڑ پر اسد بر جس پہنے ہاتھ میں چھڑی لیے نظر آیا۔ پھولوں کی پتیاں ہاتھ میں مسلی جانے لگیں۔ اور پھر ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں الجھنے لگیں — اسد آگیا تھا۔

ثمینہ کے ہونٹوں پر ساری کائنات کی مسکراہٹیں پھیل گئیں "ہیلو۔"

"جی — مجھے ثمینہ سے ملنا ہے۔"

ثمینہ سمجھ گئی کہ شرارتی لڑکا مذاق کر رہا ہے۔ گورنس نے آکر کہا۔

"ثمینہ بٹیا — کوفی تیار ہے، میز پر لگا دوں — ؟"

"تم چلو، میں خود آکر لگاؤں گی۔" ثمینہ نے کمرے کی طرف مڑ کر جاتے ہوئے کہا "آئیے۔ آپ کو ثمینہ سے ملاؤں۔"

"آں —"، شراب کے ذریعے آنکھوں میں اُتری ہوئی ثمینہ اب تک اس کے ذہن میں تھی۔ مگر اب وہ نشے میں نہیں تھا، اُسے یُوں محسوس ہوا جیسے اُسے مونٹ ایورسٹ سے دھکیل دیا گیا ہے۔ اس کے دماغ پر سے لاتعداد گھوڑے گزرنے لگے۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ کیا کرے۔ ثمینہ نے کمرے کے دروازے سے پکارا "آئیے نا —"، یہ کہہ کر وہ باورچی خانے سے کوفی لانے چلی گئی۔

جب وہ کوفی لے کر آئی، تو اسد کمرے میں نہیں تھا "اسد —"، اس نے کانپتے

ہاتھوں سے ٹرے میز پر رکھ دی، وہ بھاگ کر دروازے میں آئی۔ سڑک پر کوئی تیز تیز قدموں سے سڑک پر پڑے چھوٹے چھوٹے پتھروں کو چھڑی سے اُڑاتا ہوا جا رہا تھا —— وہ اسد تھا۔

اس کے جسم کی سنہری چونٹیاں اس کی کھال نوچ نوچ کھانے لگیں۔ اس کے سُرخی مائل سنہری بال پھندا بن کر گلے میں آن پڑے۔ ہونٹوں کے چھیریوں سے اُسے سڑاند آنے لگی۔ پہاڑیوں سے بڑے بڑے پتھر لڑھک کر اُسے روندنے لگے اور وہ پسینے کے ابلتے ہُوتے چشموں میں ڈوب گئی۔ گورنس نے آکر کہا۔

"ثمینہ بٹیا —— ! جلیل میاں کا سکارف کہاں ہے —— ؟ میں کام میں انھیں لوٹانا بھول گئی تھی۔ وہ لینے آئے ہیں —— !"

وہ خالی الذہن ہو کر رہ گئی، اور سگریٹ کا دھواں اس کے منہ سے ہو کر اس کے دِل و دماغ پر چھا گیا۔ جس کے پیچھے اسے کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ پھر اس کے قدم خود بخود جانے کیوں، باہر کے دروازے کی طرف اُٹھنے لگے جلیل نے سیاہ چشمے کے پیچھے آنکھیں جھکا کر بُوٹ کی نوک سے زمین کریدتے ہُوئے کہا "میں رائیڈنگ کے لیے ——"

ثمینہ کے ہونٹ لرزنے لگے —— "ہیلو جلی —— ! مجھے پتہ تھا کہ تم ضرور آؤ گے —— آؤ، میں نے تمھارے لیے کوفی بنائی ہے —— آؤ نا" اور اس نے خشک چیری، ہونٹوں کی ڈبیا میں بند کرنے کے لیے اسے دے دیے۔

منوجی

آج ابھی بارسیلونا ریستوران کی چُندھیا دینے والی فضا میں رات کی دیوی نہیں اتری اور خان بیرا ایبن کو ریستوران میں آتے دیکھ کر ٹھٹھک گیا ہے کیونکہ ابھی ڈانس کے کونے میں پڑی ہوئی ٹرمپٹ کی چابیاں مینزی کی انگلیوں کی منتظر ہیں۔ مینزی، جو ایبن کو رات کے پورے نو بجے ہال میں داخل ہوتے دیکھ کر مُسکرائے گا، سر کو ذرا سا جھکائے گا اور پھر اپنے نغمے کو جلدی جلدی ختم کر کے سپیل باؤنڈ بجانے لگے گا۔ وہ اس دھن کو اتنی بار بجائے گا کہ لوگوں میں سے کوئی اسے چِٹ لکھ کر بھیجے گا کہ وہ اس دھن پر ناچتے ناچتے بور ہو گئے ہیں —— لیکن آج ابھی تک سپیل باؤنڈ ٹرمپٹ میں مسحور بند پڑا ہے، کیونکہ ابھی صرف پانچ بجے ہیں ہیتول کے جھروکے شام کے لیے ابھی وا نہیں ہوئے۔ مینزی ابھی نہیں آیا اور ایبن نو بجے سے چار گھنٹے پہلے ہی آگیا ہے۔

خان بغیر کچھ کہے سُنے اس کو جُھک کر سلام کر کے چائے اور سگریٹ لینے چلا

گیا اور ابین جیب سے لائٹر نکال کر سگریٹ سلگانے لگا ہے ـــــ تم میرے دوست نہیں ہو، میاں کے بچے، تم نے دوستی کے سارے عہد و پیمان توڑ دیے ہیں!" اور یہ سب عہد و پیمان اس وقت ٹوٹے تھے جب پلازا میں فلم کا انٹرول ہوا تھا اور ابین نے حسبِ عادت سرسری نظر سے ہال میں بیٹھی ہوئی مخلوق کا جائزہ لیا تھا کہ ان میں سے کتنے لوگ اسے دیکھ کر کھسر پھسر کرتے ہیں۔ سب سے پچھلی قطار میں آخری سیٹ پر میاں کو بیٹھے دیکھ کر اسے یوں محسوس ہوا جیسے ہال میں بیٹھی ہوئی تمام لڑکیاں اسے دیکھ کر قہقہے لگا رہی ہیں اور اس کے چہرے کی طرف اشارہ کر کے مختلف قسم کی باتیں بنا رہی ہیں۔

اس نے بجلی کی سی تیزی کے ساتھ جیب سے رومال نکال کر اپنا چہرہ چھپا لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہیں بیٹھا بیٹھا ہوا میں تحلیل ہو جائے، لیکن جب وہ ہوا میں تحلیل نہ ہو سکا اور لڑکیوں کے قہقہے رومال بن کر اس کے چہرے کے ساتھ چپک گئے تو اس وقت وہ میاں پر رنج و افسوس میں گھلی نظریں ڈالتا ہوا اُٹھ کر بارسیلونا میں چلا آیا تھا ـــــ میاں کے ساتھ ایک لڑکی بیٹھی تھی۔ "میاں، تم نے دو سال کی اتنی گہری دوستی پر لڑکی کی لعنت کیوں بھیج دی ہے؟ ـــــ میاں، تم جو شکل و صورت سے اتنے چغد دکھائی دیتے ہو اور تمہارا پیشہ سوائے کتابوں کو چاٹنے کے اور کوئی نہیں، تمہارے پاس اتنی خوبصورت لڑکی کہاں سے آئی ـــــ میاں کے بچے، تم چغد ہو ـــــ اور میں، میں تم سے بھی زیادہ ـــــ" کشور نے شاید یہی کہا تھا، ـــــ کشی، او کشی: تم اچھی طرح جانتی ہو کہ تم میری محبت کے قابل نہیں، ـــــ کشی تم نے میری ہتک کی ہے ـــــ!

اس نے رومال کی نقاب کو چہرے پر درست کیا جہاں اس کی ناک کشور کی ہتک کی چغلی کھا رہی تھی!

"صاب ـــــ دو دن سے زکام نے میرے بچوں کو بھی نہیں چھوڑا۔"

خان نے میز پر چائے رکھتے ہوئے کہا۔

مسٹر خان، یہ زکام بڑا پرانا ہے، میں اس کا عادی ہو گیا تھا، لیکن آج اس کا حملہ بڑا شدید ہے کیونکہ کشی زکام کی بڑی مہلک جراثیم ہے۔ میاں سینما میں بیٹھا اپنے زکام کا علاج کر رہا ہے اور منیزہ ابھی تک نہیں آیا۔ بیبل باؤنڈ ٹرمپیٹ میں بند پڑا ہے —— میں ابھی چائے اور سگریٹ پیوں گا، جس سے میرا زکام کچھ کم ہو جائے گا —— دراصل موسم ہی کچھ ایسا ہے اور میری لمبی ناک بڑی حساس ہے —— زکام کے جراثیم سے لے کر بہار کے عطر تک یہ ہر چیز سے متاثر ہو جاتی ہے۔ ہاتھی کی ناک بھی بڑی لمبی ہوتی ہے، شاید اسی لیے بہار سے متاثر ہو کر چڑیا گھر کا ہاتھی بھی مست ہو گیا ہے —— یہ سامنے جو لڑکیاں بیٹھی ہیں ان سے کہو کہ مجھے گھور گھور کے نہ دیکھیں اور —— مسٹر خان، یہ لڑکیاں ہنس کیوں رہی ہیں، خان اپنے بچوں کے زکام کے بارے میں امین کی رائے کا انتظار کیے بغیر چلا گیا —— اور امین نے سوچا یہ کیا بکواس ہے۔ آج میرا ذہن اتنا آوارہ کیوں ہو گیا ہے؟ —— یہ بار بار ناک کو روند کر بھٹکتا ہوا اس شارع پر کیوں جا نکلتا ہے اور جس کے دونوں طرف لگی ہوئی کیاریوں میں پھولوں کو توڑنے کی کوشش کرنے والوں کو طنز کے قید خانے میں ڈال کر قہقہوں کے کوڑے لگائے جاتے ہیں ——!

آج اس تمام صورتِ حال میں اس کے ذہن کا کوئی قصور نہیں تھا۔ آج صبح کشور نے اس کے دماغ کی صحیح سوچنے کی قوت کو بالکل مفلوج کر دیا تھا۔ اور اس وقت میاں پلازہ میں ایک لڑکی لیے بیٹھا تھا۔ اس نے دو سال کی دوستی کے باوجود اس سے یہ لڑکی چھپائے رکھی تھی۔ تعارف تو ایک طرف کبھی اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا۔ میاں بھی بے قصور تھا —— کیونکہ اگر وہ اس لڑکی کا ذکر کر دیتا تو یہ دو سال کی دوستی آناً فاناً ختم ہو جاتی اور پھر تعارف کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ امین کے متعلق کالج میں یہ

بات مشہور تھی کہ وہ مجسم نقش اعظم بن کر رہ گیا ہے۔ اس پر رشک کرنے والی اکثریت کا خیال تھا کہ وہ خود کو ان سب سے بلند تصور کرتا ہے، لیکن اتنا عجیب صورت ہونے کے باوجود وہ اتنا مغرور کیوں ہے؟ آخر وہ اپنی اس ناک کی دیوار کو کیوں نہیں دیکھتا جو اس کے اور کالج کے دوسرے افراد کے درمیان حائل ہے اور جسے دیکھتے ہی متین سے متین طالب علم کے ہونٹوں پر بھی شریر سا تبسم کھیلنے لگتا ہے۔ اور پھر لڑکیاں ——— ؟ لڑکیاں تو اس مضحکہ خیز حد تک بڑھی ہوئی ناک کو دیکھتے ہی بس قہقہے لگانے لگتی ہیں۔ امین ان قہقہوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ وہ بوکھلا جاتا ہے، گھبرا جاتا ہے، خود سے نفرت کرنے لگتا ہے، لیکن پھر نہ جانے کیسے اس کے دل کے نہاں خانے سے کوئی جذبہ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا برآمد ہوتا ہے اور وہ ان سب پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈالتا ہوا زندگی کے اتنے اونچے سنگھاسن پر جا بیٹھتا ہے جہاں تک کسی ذی رُوح کے قدم نہیں پہنچ سکتے۔ امین لڑکیوں سے نفرت کرتا تھا۔ جس طرح ہر انسان کو کبوتر پالنے کا شوق نہیں ہوتا اسی طرح ہر انسان کو لڑکیوں کا شوق نہیں ہوتا۔ امین کو اس قوم کے وجود سے بہت الجھن ہوتی تھی۔ وہ بہترین ٹینس پلیئر، بہترین تیراک اور بہترین اداکار تھا۔ یہ باتیں اسے لڑکیوں میں مقبول کرنے کے لیے کافی تھیں لیکن ان کے اور امین کے درمیان اس کی ناک کا فاصلہ ہمیشہ قائم رہتا۔ تقریبات کے علاوہ باہر کہیں یہ فاصلہ اتنا زیادہ ہو جاتا کہ وہ اسے پہچان بھی نہ سکتیں۔ شروع شروع میں امین نے لڑکیوں کے اس رویّے سے پریشان ہو کر بہت کچھ سوچا تھا مگر اُسے محسوس ہُوا کہ یہ سوچ اس کی شخصیت کو گھنا رہی ہے اور بیروں میں بہتے ہوئے دریا سے کٹتے ہُوئے پہاڑ کی طرح وہ رفتہ رفتہ گل رہا ہے تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ان کے بارے میں کبھی نہیں سوچے گا۔ حتی الوسع ان سے بہت کم ملے گا اور ان کے ساتھ گزرے ہُوئے وقت کو انھی کے آنچل میں باندھ کر لوٹ آیا کرے گا۔

اور پھر اس دن کے بعد تو اس کے دل پر بے رُخی کا میل بہت زیادہ جم گیا تھا جب

اس نے قریب سے گزرتی ہوئی ایک لڑکی پر جملہ کسا تھا۔ پاس ہی کھڑے ہوتے لڑکے کے ساتھ شاید اس لڑکی کے تعلقات تھے۔ اس نے بڑے غصے سے کہا تھا "مسٹر کسی پر ریمارک پاس کرنے سے پہلے اپنے چہرے کو ٹٹول لیا کرو۔" امین کے کان غصے سے سرخ ہو گئے تھے اور اس نے اس لڑکے کو اتنا پیٹا تھا کہ دوبارہ کسی کو امین کی ناک کے بارے میں کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ پرنسپل نے اس کو پچیس روپے جرمانہ کیا تھا۔ لڑکے کو پیٹنے اور پرنسپل کی ناراضی کا امین کو بے حد افسوس تھا اور یہ سب کچھ صرف ایک لڑکی کے باعث ہوا تھا۔

اس روز سے اس نے اپنی زندگی کی سلیٹ سے لڑکی کے وجود کو بالکل مٹا دیا تھا اور اپنے آپ کو کچھوے کی طرح کھیلوں اور ڈراموں کے خول میں بند کر لیا تھا۔ لڑکیاں اس قابل نہیں تھیں کہ وہ ان میں الجھ کر خواہ مخواہ اپنا وقت ضائع کرتا۔ پروفیسروں سمیت کالج کے سبھی لوگ حیران تھے کہ اتنے بڑے جسمانی عیب کے باوجود امین کو احساس کمتری نہیں ہے۔ بڑا خوش و خرم رہتا ہے اور بالکل نارمل لڑکا ہے۔ لڑکیوں کے نزدیک وہ انٹر یونیورسٹی چمپئن شپ جیتنے کے باعث اب کچھ مغرور سا ہو گیا تھا۔ کالج میں امین کے بہت کم دوست تھے لیکن میاں اس کے بہت قریب تھا۔ وہ دونوں ہوسٹل کی ایک ڈارمیٹری میں اکٹھے رہتے تھے اور میاں اس کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر تھا۔ اس کا اپنا پیشہ صرف پڑھائی تھا۔ شام کو سیر کرتے وقت بھی اس کے پاس چھوٹے چھوٹے کاغذوں پر نوٹس لکھے ہوتے جنھیں وہ راستہ بھر یاد کرتا۔ واپسی پر وہ نہانے کے تالاب سے امین کو ساتھ لے کر ٹک شاپ میں دودھ پینے کے لیے آجاتا اور بے حد مایوس ہو کر کہتا: "کچھ نہیں یار مینو، ہمارا تو مردہ خراب ہوگا ——— !" "دیکھو میاں! تم ان خرافات میں نہ الجھو، تمھارا کام جماعت میں اول آنا ہے سو آتے رہو، اگر ان جھگڑوں میں پھنس گئے تو مردہ اور بھی خراب ہوگا۔"

"اگر کوئی بات بن جاتے تو ———" میاں جانے کسے اپنے ذہن کے ساتویں

پردے میں چھپا کر کہتا، "صاف صاف بات کرو۔ کہنا کیا چاہتے ہو؟" میاں، جواب دیے بغیر شرما کر دودھ کا گلاس منہ کو لگا لیتا۔ وہ امین کے سامنے دل کی بات کو زبان پر لاتے ہوئے جھجکتا تھا۔ میاں کا خیال تھا کہ جس طرح سوگ میں حسن نکھر آتا ہے اسی طرح پڑھائی اس کی شخصیت پر پالش کا کام دیتی ہے۔ وہ اپنی شخصیت پر اس وقت بھی ٹک شاپ میں بیٹھا پالش کر رہا ہوتا جب امین بڑے زور شور کے ساتھ فرائڈ کے حوالے سے محبت کو جنس کے تیزاب میں حل کر دیتا اور کہتا "جنسی تشنگی کا شکار صرف بے کار لوگ ہوا کرتے ہیں، تم اچھے خاصے پڑھاکو ہو تمھیں لڑکیوں سے کیا واسطہ اور میں سپورٹس مین ہوں مجھے ان سے کیا سروکار؟" "اور اتنی ساری لڑکیاں ——— ہینو" ——— میاں نوٹس کے ٹکڑوں کے انبار سے یک لخت برآمد ہوتا۔ امین یک لخت چپ ہو جاتا اور منہ اونچا کر کے آسمان کی پہنائیوں کو اپنی نظروں سے ٹٹولنے لگتا۔

میاں نے ابھی تک خود کو لڑکیوں سے محفوظ رکھا تھا کیوں کہ ایک تو اپنی خالہ کی لڑکی سے اس کے بچپن کی وابستگی جوان ہو چکی تھی اور دوسرے جب بھی اس قسم کا کوئی خیال اس کے ذہن میں آتا تو اس کے باپ کی آواز اس کے کانوں میں گونجنے لگتی "بیٹا اگر لائق ہو جاؤ گے تو دنیا تمھارے قدموں میں ہو گی ورنہ کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔" میاں نے آج تک امین سے اس کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اپنے اتنے ذاتی معاملات کا اشتہار دے اور پھر امین تو یقیناً اس کا معاشقہ سننے کے بعد اس کا مذاق اڑاتا۔ شاید اسی لیے وہ امین سے اکثر دوسری لڑکیوں کی گفتگو کیا کرتا اور اپنی خالہ کی لڑکی کو ذہن کے کولڈ اسٹوریج میں چھپائے رکھتا۔ ٹک شاپ سے لوٹتے ہوئے جب امین کو یہ خیال آتا کہ رات کو پڑھتے وقت میاں کی کتابوں پر لڑکیاں ناچیں گی تو وہ کچھ اور بھی سنجیدہ ہو جاتا۔ "میاں اس قسم کے خیالات کو سنسر کرنا چاہیے۔ جنس کو اہمیت دینا ایک حیوانی حیات ہے، اگر تم اسے اہمیت دو گے تو میں انسان کی

یہ توہین ہرگز برداشت نہیں کروں گا۔ قدیم ہندوؤں کی منوسمرتی کی طرف دیکھو۔ اتنا قدیم ہونے کے باوجود منوجی کا فلسفہ کس قدر ماڈرن ہے ــــــ پچیس سال تک برہمچریہ آشرم ــــــ پھر گرہست آشرم ــــــ اور پھر سنیاس۔ سبحان اللہ! اگر منوجی سے لے کر آج تک انسان کو کم از کم اتنی ترقی کر لینی چاہیے تھی کہ گرہست آشرم کو اڑا سکتا۔" اور میاں شرارت سے مُسکرا کر کہتا "رشی جی! اپنی اس بکواس کو بند کرو۔ دیکھو گرہست آشرم کے خلاف کچھ کہو گے تو مجھ سے بُرا اور کوئی نہ ہو گا۔" اور پھر دونوں ہنسنے لگتے۔ ایبن کی باتیں میاں کی سمجھ میں بہت کم آتیں۔ کمرے میں پہنچنے تک۔ اس کی خالہ کی لڑکی اس کے ذہن پر بُری طرح سوار ہو جاتی، وہ بوکھلا جاتا اور خود کو طفل تسلیاں دیتا ہُوا کتابوں کی دنیا میں کھو جاتا۔ اور ایبن اسے کمرے میں چھوڑ کر بار سیلونا کو ممنون کرنے کے لیے اپنی سپورٹس کار میں دھیرے دھیرے بہتا ہُوا سپیل باؤنڈ کی آبشار میں جا اترتا جہاں کاسترو میں ڈوبی ہوئی مینرہی کی مخمور آنکھیں مُسکرا کر اس کا استقبال کرتیں اور اس کی انگلیاں بجتے ہُوئے نغمے سے پھسل کر سپیل باؤنڈ کی لہروں پر تیرتی ہُوئی کسی کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے خود کہیں کھو جاتیں۔

شاید یوکلپٹس کے پتّوں میں شام اُلجھ کر رہ گئی ہے۔ سامنے بیٹھی ہُوئی لڑکیوں کو ہنستے دیکھ کر ایبن کی آنکھوں میں ناقابلِ عبور خلا ابھر آئے ہیں۔ اور وہ کچھ اس طرح پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے جیسے پہلے انسان نے آسمان میں بجلی کو ہنستے دیکھا تھا۔ اس کی وحشیانہ نظروں کے سامنے لڑکیوں کی ہنستی ہُوئی بجلیاں ماند نہیں ہُوتیں بلکہ ایبن کو اور بھی چمکتی ہُوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ اس کا رومال جیب سے نکل کر خود بخود اس کی ناک پر آ گیا ہے ــــــ خان تیسری مرتبہ اس کے سامنے چائے رکھ کر زکام کے سلسلے میں دیسی ٹوٹکوں کی اہمیت سمجھا رہا ہے ــــــ اور مینرہی ابھی تک نہیں آیا ــــــ!

اس روز کالج کے ڈرامے میں ایبن نے اعلیٰ اداکاری کے جوہر دکھلائے تھے۔

جب کھیل ختم ہوگیا اور وہ میک اپ روم میں واپس آگیا تو سٹیورڈ نے آکر اُسے بتایا کہ ایک لڑکی اس سے ملنا چاہتی ہے۔ ایمن نے یہ سوچ کر کہ اس کی اداکاری کی داد دینا چاہتی ہوگی، سٹیورڈ کی زبانی ہی شکریہ کہلا بھیجا ــــــ لڑکی خود ہی میک اپ روم میں آگئی۔ ایمن نے آج تک ایسی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب طرح کی شفاف معصومیت تھی۔ ان دو آئینوں میں ایمن کو اپنی شخصیت ایک تصویر کی طرح اُبھرتی ہوئی نظر آئی۔ خوبصورت، بے عیب اور دلکش ــــــ اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا ــــــ لڑکی اس کی اداکاری کی تعریف کر رہی تھی اور وہ اس کی آنکھوں کی گہرائیوں میں ڈوب گیا تھا۔ یکایک اسے محسوس ہوا کہ اندھیرا چھا گیا ہے۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا ــــــ لڑکی جا چکی تھی۔ معاً اسے خیال آیا کہ اس نے لڑکی سے کل شام بیچ لگژری میں ملنے کا وعدہ کر لیا تھا۔ بغیر سمجھے، بغیر جانے ــــــ!

زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ کسی لڑکی نے اس سے ملنے کی درخواست کی تھی اور زندگی میں یہی پہلا موقع تھا کہ وہ عمر کی تقسیم کے پرانے ہندوانہ فلسفے کو بھول گیا تھا۔ اس نے تمام رات بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزاری ــــــ کہیں وہ لڑکی اس کا مذاق اڑانے تو نہیں آئی تھی ؟ ــــــ نہیں، اس کی پیاری سی معصوم آنکھوں میں اس قسم کی کوئی چیز نہیں تھی ــــــ ! تو پھر ــــــ تو پھر اس کا مطلب یہ ہے کہ ــــــ وہ مسکرا دیا ــــــ لڑکیاں لارڈ بائرن کی ٹانگ ہی پر فدا ہوئی تھیں ورنہ ــــــ لیکن رکسان کو سیرانو سے محبت نہیں تھی۔ ہاں مگر اس وقت تک جب تک کہ اس کو سیرانو کی اصلیت کا پتہ نہیں چلا تھا ــــــ تو ــــــ تو پھر ــــــ اے پیاری سی معصوم لڑکی میں تیری پرستش کروں گا۔ لیکن ــــــ!

دوسرے دن کالج میں اس نے اپنی مسکراہٹوں کو بمشکل ہونٹوں کی قبر میں بند رکھا اور کسی کو احساس تک نہ ہونے دیا کہ آج شام یہ زنجیریں بیچ لگژری میں کھل کھلا کر

ہنس دیں گی۔ اس کا رویہ لڑکیوں کے ساتھ اس دن بھی ایسا ہی تھا ——
اسی قسم کا کھنچا کھنچا سا جیسے لڑکیاں سرکس میں دو بانسوں پر تنے ہوئے اس رسے کی طرح ضروری سمجھتی ہیں جس پر مداری چل کر کرتب دکھاتا ہے۔

"ہیلو —— !" وہ دو منٹ دیر سے آئی تھی۔ اور ابین کو وہاں بیٹھے دو صدیاں گزر چکی تھیں "میرا نام کشور ہے" ابین اس کی آنکھوں کی معصومیت کو سمیٹتا ہوا اس کے دل میں اتر گیا —— اس نے جھکی ہوئی نظروں سے کہا "لڑکیوں کو ساڑھی پہنے اور جوڑے میں کلیاں سجائے دیکھ کر ان میں دیویوں کے تقدس کا احساس ہوتا ہے —— آپ بڑی اچھی لگ رہی ہیں"۔ کشور کے گالوں سے ہلکی ہلکی سرخیاں چھلکنے لگیں "آپ پہلی لڑکی ہیں جسے دیکھ کر محسوس ہوا ہے کہ آپ لڑکی نہیں ہیں" "جی —— !" "بلکہ دیوی ہیں —— !"

ابین کو ابھی پوری طرح نظریں اٹھانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی کشی کی بڑی عجیب سی نگاہیں اس کے چہرے پر ٹھوکریں کھا رہی تھیں "ارے، آپ ابھی تک سیرالو کے میک اپ میں ہیں؟" ابین ناک کے ہمالہ تلے پس گیا، اس کے کان سرخ ہو گئے، اس کی سکڑتی ہوئی کھوپڑی اس کے دماغ کو نچوڑنے لگی اور اگر وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے خالی گلاس کو اور بھینچتا تو اس کے ہاتھ میں چھوٹے چھوٹے یاقوت ابھر آتے —— سب دیویاں پتھر کی ہوتی ہیں اور ان کے دل —— ؟ اگر ہوتے ہیں تو صرف پتھر کے —— !

کشی کے پتھر دل میں اترا ہوا ابین بیچ لگڑری میں زخمی پڑا تھا۔ "آئی ایم سوری، میں نے تو یونہی مذاق کیا تھا ——" اس نے ابین کے زخموں پر جوڑے کی کلیوں کی بارش کرتے ہوئے کہا۔ ابین خاموش تھا —— !

"میں سچ کہتی ہوں —— !" ابین کی نظریں اس کے چہرے پر گڑی تھیں۔ لڑکی باتیں کر رہی تھی اور ابین کچھ بھی نہیں سن رہا تھا۔ وہ کچھ سوچ بھی نہیں رہا تھا —— اس کے ذہن میں صرف ایک شکوہ تھا "کشی —— ! تم نے صرف یہی کہنے کے لیے

مجھے یہاں بُلایا تھا؟ کشی، کشی!" "مینو! مینو۔" لیکن پگھلی ہوئی پتھر کی دیوی نے اسے اور بھی چٹان بنا دیا تھا۔ "اگر آپ کی جگہ کوئی اور لڑکا ہوتا تو ——؟" جیسے اس نے صرف اپنے آپ سے کہا امین کی آنکھوں کی ویران رُوح بیچ لگزری ہیں بھٹک رہی تھی —— "دیکھیے، مَیں نادم ہُوں۔ میرا دل نہ توڑیئے!" اس کا جی چاہا کہ اس فقرے پر اتنے قہقہے لگائے کہ کشی پاگل ہو جائے —— ہونہہ! میرا دل نہ توڑیئے۔ یہ تمھاری جنس کا عجیب حربہ ہے۔ —— دِل، دِل کیا ہوتا ہے؟ ہر چیز ناک ہوتی ہے ناک! سمجھیں —— ! جو دِل کو کاٹ کے سارے جذبات و احساسات بہا دیتی ہے —— امین نے اس کا پرس اٹھاتے ہُوئے دھیمی آواز میں کہا۔ "چلیے، آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔" وہ اپنے خشک حلق کو آنسوؤں سے تر کرتے ہُوئے کار میں آکر بیٹھ گیا۔ کشی نے سیٹ پر سے پرس اُٹھاتے ہوئے کہا —— "تھینک یو، مَیں خود ہی چلی جاؤں گی۔" "جاؤ جہنّم میں —— جس طرح مرضی ہو کرو —— مجھے کچھ پروا نہیں —— !" لیکن الفاظ اس کی زبان پر آکر اٹک گئے۔

اس نے کشی سے پرس چھین کر دوبارہ سیٹ پر پھینکتے ہُوئے کہا "بابا مَیں نے بُرا نہیں مانا آپ بیٹھ جایئے۔" اس کی بھاری گھٹی ہوئی آواز میں تحکّم تھا اور کشی جیسے کسی بہانے کی منتظر تھی۔ "آپ کہاں رہتی ہیں؟" "گرلز ہوسٹل" "مَیں جانتی ہُوں کہ آپ بُرا مان گئے ہیں" —— وہ راستہ بھر اس سے معافیاں مانگتی رہی لیکن اس کی آواز تیز چلتے ہُوئے انجن کی گڑگڑاہٹ سے اوپر نہ اٹھ سکی۔ ہوسٹل آ گیا اور کار رُک گئی۔ اس پگلی سی معصوم لڑکی نے روہانسی ہو کر بہت آہستہ سے کہا "مَیں جانتی ہُوں آپ کو مجھ سے نفرت ہے۔" "معاف کیجیے، مجھے سب لڑکیوں سے نفرت ہے، مَیں نے آپ لوگوں کو کبھی بھی اس قابل نہیں سمجھا اور آپ نے مجھے یہاں بلا کر میرا ایک اصول توڑا ہے، جس کے لیے مَیں آپ کو معاف نہیں کروں گا۔" وہ ہوسٹل پہنچ گئے تھے —— "اتنی اچھی شام کا بے حد شکریہ ——"

مینزی اپنی تھکی ہوئی انگلیوں کو سہلاتا ہوا آرکسٹرا کے پاس دوسرے لوگوں کے ساتھ بیٹھا کانٹرو پی رہا تھا۔ اتنا چھپانے کے باوجود مینزی کو امین کا چہرہ آنسوؤں میں رچا ہوا محسوس ہوا۔ اس شام جب مینزی نے پہلی مرتبہ اس سے گفتگو کی تھی اور بہت جلد بے تکلف ہوتے ہوئے کہا تھا "او مینو، تم اکیلے کیوں آتے ہو——؟" تو امین کو اس شام دوسری بار اپنے چہرے کی کوہان کا احساس ہوا تھا اور مینزی کی جہاں دیدہ نگاہوں نے اس کی آنکھوں سے صاف پڑھ لیا تھا کہ امین بکواس کر رہا ہے کہ اس کو لڑکیوں سے کوئی دلچسپی نہیں "مسٹر یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے، یہ حیوانی فطرت ہے اور میں انسان ہوں تمہیں صرف اپنی بیوی سے دلچسپی ہوگی، تمہارا ٹائم ٹیبل بہت اچھا ہے—— تم مافوق البشر ہو" مینزی کا قہقہہ کانٹرو کے گھونٹ میں غرغرا گیا۔ یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تمہیں گھٹیا چیزوں سے دلچسپی نہیں—— تمہیں معلوم ہے میں آدم ہوں۔ میں نے یہ بات آج تک کسی کو نہیں بتائی۔ مسٹر مینو، تم جو گذشتہ چھ ماہ سے اتنی اچھی شامیں یونہی باربیلونا کی قبر میں اتار دیتے ہو، اس کی وجہ میں سمجھ گیا ہوں تم بے شک نہ بتاؤ—— بعض لوگوں کے دل سیف ڈیپازٹ والٹ ہوتے ہیں۔" "او مینزی کے بچے——، یہاں سے دفع ہو جاؤ—— تم مجھے کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے ہو اور میں ہمیشہ کی طرح کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتا۔ آرکسٹرا کے دوسرے لوگ مینزی کا اشارہ سمجھ کر ڈانس پر چلے گئے تھے۔ مینزی دفع نہیں ہوا تھا۔ اس نے گلاس کو کانٹرو سے بھرتے ہوئے کہا "آج یہ صرف سیکسو فون بجائیں گے۔ سیکسو فون—— مائی گڈنس—— سیکس کہیں بھی پیچھا نہیں چھوڑتی" امین قطعاً نہ سمجھ سکا کہ مینزی کی آواز میں طنز تھی کہ یاسیت۔ اس نے امین کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "او مین! ان اداسیوں کا کوئی فائدہ نہیں—— ٹریجڈیاں ہوتی ہی ایسی ہیں لیکن زندہ رہنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر خواہش کی متعفن لاش پہ مسکراہٹ کا کفن ڈال دیا جائے۔ تم نے کبھی سپیل باؤنڈ سنا ہے؟—— نہیں—— میں نے آج تک یہاں نہیں بجایا—— یہ نغمہ ایک بھرپور مسکراہٹ ہے، ایک قیمتی کفن ہے، جسے میں

اپنے گھر میں تنہا بیٹھ کر اوڑھا کرتا ہوں، لیکن آج سے تمھیں یہاں دیکھتے ہی میری انگلیاں ٹرمپٹ پر مُسکرایا کریں گی۔ کتنی بیہودہ سی خواہش ہے ــــــ لیکن بخدا بعض وقت میں بڑے خلوصِ دِل سے دُعا کیا کرتا ہوں کہ میرا آخری سانس ٹرمپٹ پر سپیل باؤنڈ کے نغمے میں نکلے ــــــ میں نے آج تک اتنی بکواس کبھی نہیں کی ــــــ جانتے ہو آج میری شادی کی سالگرہ ہے ــــــ اور ــــــ اور تم مجھے بہت اچھے لگتے ہو۔"

ایبن نے آج تک مینزی کو خمار ہی میں دیکھا تھا ــــــ آہستہ آہستہ اس کو مینزی کی نشے میں ڈوبی ہوئی آواز میں بھی زخم نظر آنے لگے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ ساری عمر اس سے باتیں کرتا رہے ــــــ اس نے بڑے ہی رازدارانہ لہجے میں کہا "او مین ــــــ میں آدم ہوں ــــــ کوئی نہیں جانتا ــــــ کانترو بہترین فرانسیسی شراب ہے ــــــ حوا نے آدم کو جنت میں پھل کھلا کر دوزخ میں دھکیل دیا تھا نا ــــــ اور مجھے حوا نے کانترو پلا کر سپیل باؤنڈ میں دھکیل دیا ہے ــــــ دونوں چیزیں اس کی پسندیدہ تھیں جنگ نے میرا تمام پھل چھین لیا اور مسز مینزی پھل کے بغیر آدم کو دیکھتے ہی ایک پھل دار آدم کے ساتھ بھاگ گئی ــــــ ہاہا ــــــ ہاہا۔ سیکسوفون ــــــ بڑا ہی عجیب ساز ہے۔

مینزی کا ہلکا سا طنزیہ قہقہہ اپنے المیئے سمیت ایبن پو چھا گیا۔ "مینزی، میں بھی کانترو پینا چاہتا ہوں۔" "شراب اور عورت، سپورٹس مین کو چاٹ جاتی ہے ــــــ تم جس طرح عورت سے دُور رہتے ہو، اسی طرح شراب سے بھی دُور رہو اور پھر شراب پینے کے لیے تو ایک بہت بڑا المیہ چاہیے۔" ایبن جھینپ کر چائے پینے لگا، جیسے مینزی عرش پر کھڑا اسے فرش پر رینگتا دیکھ رہا ہو۔ "فی الحال تم صرف سپیل باؤنڈ سنو ــــــ لوگ کہتے ہیں یہ نغمہ صرف ٹرمپٹ اور ڈرم پر اچھا لگتا ہے۔ لیکن میں ٹرمپٹ پر سولو بجاؤں گا۔"

مینزی ڈولتا ہوا ڈائس پر چلا گیا۔ نغمہ اس کی رُوح کو چیرتا ہوا اس کے دِل میں

اترنے لگا اور مینزی کو مُسکراتے ہُوئے دیکھ کر امین کا رونے کو اتنا جی چاہا کہ اس نے رومال سے اپنی آنکھیں ڈھانپ لیں اور اس نے عہد کر لیا کہ اب وہ ہمیشہ اس نغمے کی روتی ہوئی مُسکراہٹوں کا کفن پہنا کرے گا۔ اپنے چھوٹے سے الیبے کو مینزی کی اتنی بڑی ٹریجڈی ہیں دھکیل کر پہلے سے بھی زیادہ خوش رہا کرے گا۔ دُنیا میں اس سے بھی زیادہ دُکھی لوگ بستے ہیں، اور پھر اس کو تو کوئی دُکھ نہیں تھا، کوئی بھی تو نہیں۔

اس شام کے بعد امین میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ وہ پہلے کی طرح خوش و خرم رہتا تھا، فرق تھا تو صرف اتنا کہ وہ کھیلوں میں اور بھی زیادہ مصروف رہنے لگا تھا۔ بات بات پر اس کے منہ سے قہقہوں کے فوّارے ابلنے لگتے تھے (جن کی کھوکھلاہٹ کا کسی کو احساس نہیں ہوتا تھا ـــــ اسے خود بھی نہیں) اور اس نے میاں سے اس سنجیدگی سے گفتگو کی تھی کہ میاں کو اس کی عقل پر شبہ سا ہونے لگا تھا۔ "میاں ـــــ! تم میرے ساتھ وعدہ کرو کہ تم زندگی کے کسی دور میں بھی کسی لڑکی سے میل جول نہیں رکھو گے۔" "آخر تمھیں ہو کیا گیا ہے، بینو؟" "کچھ نہیں ـــــ یونہی ـــــ بس تم وعدہ کرو۔" "بھائی ـــــ لڑکی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ـــــ" اس نے اپنی خالہ کی لڑکی کو ذہن کی تجوری میں چھپاتے ہُوئے کہا ـــــ "ورنہ میری اور تمھاری دوستی ختم۔" "میں ـــــ میں ـــــ وعدہ کرتا ہُوں ـــــ لیکن مجھے وجہ تو بتاؤ ـــــ" "سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مَیں نہیں چاہتا کہ تمھارے دل میں میری محبت کا کوئی حصّہ دار بنے ـــــ دوسرے یہ کہ ـــــ" اس نے سب سے بڑی وجہ چھپا کر مینزی کا قصّہ بڑے بھیانک انداز میں سناتے ہُوئے کہا: "مَیں نہیں چاہتا کہ میرا واحد دوست بھی ایسے ہی کسی حادثے کا شکار ہو جائے۔" "ناراض کیوں ہوتے ہو ـــــ مَیں نے وعدہ کر تو لیا ہے ـــــ مگر لڑکیوں کی باتوں کے بغیر زندگی کس طرح گزرے گی؟" آخر میاں نے اسے منا ہی لیا کہ لڑکیاں صرف باتوں تک محدود رہیں گی۔

یہ اسی سال کا ذکر ہے جس سال ایبن نے دوسری مرتبہ ٹینس اور نیرا کی کی انٹر یونیورسٹی چیمپئن شپس جیتی تھیں، تھیٹر آرٹس کا سیکرٹری منتخب ہُوا تھا اور زندگی میں پہلی اور آخری لڑکی نے اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔ اس سال کے پھول دان میں سجے ہُوئے تین سو پینسٹھ، اتنے خوشبودار پھولوں سے جانے کیوں اسے بعض اوقات تعفن کا بھبکا آجاتا تھا۔ وہ اس تقریب میں کبھی نہ جاتا جس میں کشور موجود ہوتی —— وہ اسے کئی بار ٹیلیفون کر چکی تھی لیکن ایبن کے رویے میں کوئی تبدیلی نہ ہُوئی۔

امتحانات ختم ہو گئے تھے — کشی نے آج آخری مرتبہ فون پر اسے بلایا تھا۔ اور جب وہ ایبن کے کرخت لہجے سے تنگ آگئی تھی تو اس نے کہا تھا "مینو —— تم بڑے ناک والے بنتے ہو! بخدا کہیں کے —— مَیں اب تم سے کبھی بات نہیں کروں گی ——" اور کشی نے دھڑاک سے فون بند کر دیا تھا۔ اور ایبن بالکل اُلو کی طرح اپنی جیگر میں سڑکوں پر مارا مارا پھرنے کے بعد پلازا میں آگیا تھا۔ جہاں ریل میں ریزرویشن کرانے کے بہانے سے آیا ہُوا میاں دو سال کی دوستی پر لڑکی کی لعنت بھیجے بیٹھا تھا۔

بارسیلونا میں مینزی ابھی تک نہیں آیا —— ایبن بھیگے ہُوئے اُلو کی طرح سر جھکائے بیٹھا ہے —— سامنے بیٹھی ہُوئی لڑکیاں شاید اپنی ہی کسی بات پر ہنس رہی ہیں —— ایبن کو اتنا غصہ آیا ہے کہ اس کا جی چاہا ہے سب کو قتل کر دے —— مینزی کو بھی — کم بخت ابھی تک نہیں آیا —— "خان کانترولاؤ ——!" "صاب یہ مَیں بھول ہی گیا تھا —— یہ تو زکام کا بہترین علاج ہے ——" "وو تھینک یو خان۔" مینزی کہتا ہے کہ کانترو بڑی اچھی ٹانک ہے —— لیکن یہ نہیں جانتا کہ اس سے جو روح میں کلیوں کی اڑتی ہوتی راکھ نہیں دھوئی جاسکتی —— مینزی ابھی بچہ ہے —— اور مَیں اُلّو ہوں —— "ہیلو —— مینو —— تم اتنی جلدی آ گئے ——!" یوکلپٹس کے

جڑے ہوئے پتوں کے پٹ کھول کر چاندنی کی رتھ پر اب شام اُتر رہی تھی۔

"یس ——، کانترو! —— او مین —— مَیں نے پہلے ہی کہا تھا کہ لڑکی کا چکر ہے —— مجھ سے کچھ نہیں چھپایا جا سکتا!" اور مینزی نے شراب میں اڑتے ہوئے ایمن سے سب کچھ اگلوا لیا —— !"مینزی —— بہار کے دن ہیں نا —— ؟"ہاں —— آخری دن ——" "چڑیا گھر کا ہاتھی مست ہو گیا ہے نا —— ؟"بہت ——" "اور میری ناک پر اُلّو بیٹھا ہے!" "ہاں —— ! تم کشتی کے کمرے میں جا کر اس اُلّو کو اڑا دو تمہیں اس سے ضرور بدلہ لینا چاہیے۔"

جیسے مینزی نے اپنے آپ کو مسز مینزی سے بدلہ لینے کا مشورہ دیا ہو۔ یقیناً —— مَیں اس حرام الدہر سے بھی بدلہ لوں گا —— وہ جس کا نام میاں ہے —— میاں! تم چغد ہو۔ ہاہا، ہاہا جانے کس فاحشہ کو لیے بیٹھے ہو —— کوئی بات نہیں —— مجھے تمہاری کوئی ضرورت نہیں —— مجھ ایسا شاندار سٹوڈنٹ کیریئر کسی کا نہیں ہو گا —— مَیں بہت عظیم ہوں —— ہاہا —— ہاہا —— اور میری ناک پر اُلّو بیٹھا پھڑپھڑا رہا ہے —— دیکھو مینزی —— ان لڑکی لوگ سے بولو کہ ہم ان کی بتیسی باہر نکال دے گا —— ایک دم باہر —— یہ سب لوگ کشور ہے —— ہنستا ہے اور تم —— تم ابھی بچے ہو —— کانترو کو ہاتھ نہ لگانا —— جاؤ سپیل باؤنڈ بجاؤ —— یہ تمہارا نغمہ ہے —— یہ میرا نغمہ ہے۔ اور آج تم سولو نہیں بجاؤ گے بلکہ ڈرم بھی اس کا ساتھ دے گا۔ مینزی کی انگلیاں ٹرمپٹ میں مسحور، بند پڑے نغمے کو کھولنے لگی ہیں —— وہ حسبِ معمول سولو بجانے لگا ہے۔

بند کر دو —— بند کر دو یہ بکواس، یہ نغمہ سن کر میں دیوانہ ہو جاتا ہوں، یہ بھٹکتی ہوئی روح کی طرح میرا پیچھا کرتا ہے —— یہ تمہاری بیوی کا تحفہ ہے، یہ کشتی کا تحفہ ہے —— اور مجھے اس سے نفرت ہے —— اُس نے میرا مذاق اُڑایا

ہے ـــــ میاں پلازا میں بیٹھا مجھ پر قہقہے لگا رہا ہے ـــــ اور یہ سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیاں مجھ پر ہنس رہی ہیں ـــــ اور میں اُلو ہوں ـــــ مینزی میں تمہاری انگلیاں کاٹ دوں گا ـــــ تم بیکسوفون کیوں نہیں بجاتے ـــــ؟ لاؤ یہ مجھے دے دو ـــــ میں کشی کے کمرے میں جا کر اپنی ناک پر بیٹھے ہوئے اُلو کو بیکسوفون سے بجتے ہوئے نغمے پر نچاؤں گا ـــــ مجھے اس سے بدلہ لینا ہے ـــــ

"بھاگ جاؤ یہاں سے مینو ـــــ بارسیلونا میں بھونچال آگیا ہے اور لاتعداد لڑکے لڑکیاں افراتفری میں سپیل باؤنڈ ناچ رہے ہیں ـــــ بہت سی دیویاں بہت سے دیوتاؤں پر کلیوں کی بارش کر رہی ہیں ـــــ اور دیوتاؤں کے جوڑوں میں پڑی ہوئی راکھ کو چاٹ رہی ہیں ـــــ مگر آج سپیل باؤنڈ کی مسکراہٹوں کے کفن پھٹ گئے ہیں ـــــ اس لیے تم بھاگ جاؤ ـــــ تم بھی دیوتا ہو ـــــ ان سب سے بڑے دیوتا ـــــ اور کشی نے بڑے دیوتا کا مذاق اُڑایا ہے" اور مینزی نے امین کو کٹی ہوئی پتنگ کی طرح بڑی تیزی سے ڈولتا ہوا جاتے دیکھا اور وہ صرف اتنا ہی کہہ سکا "امین"۔ رات کے پسینے میں بھیگی ہوئی چاندنی فضا میں تھرک رہی تھی اور اپنے پسینے میں ڈوبے ہوئے امین کا دماغ ماضی یا مستقبل کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ اسے حال کا بھی صرف اتنا ہی پتا تھا کہ اس کے تنفس میں غرق ہوتا ہوا ناچتی ہوئی چاندنی کا تنفس اسے ڈس رہا ہے۔ اس کے پسینے میں رات کا پسینہ گھل رہا ہے ـــــ اس نے بڑے ہی عجیب سے جذبات کے ساتھ کار اسٹارٹ کی ہے اور آواز سے بھی زیادہ تیز رفتاری سے سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کو نظر انداز کرتا ہوا چاندنی کے زہر کے گھونٹ پیتا اڑا چلا جا رہا ہے ـــــ کہاں ـــــ؟ کشی کے ہاں ـــــ کشی سے باتیں کرنے کے لیے۔ کشی کے آگے اپنے دل کو

پھیر کر رکھ دینے کے لیے، کشی ——

چپڑاسی سے کشور کو بلانے کے لیے کہہ کر کار میں بیٹھا وہ بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہا تھا، اس کے ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے آبشار کا رُوپ دھار رہے تھے۔ سپیل باؤنڈ اس کے ذہن میں ادھم مچا رہا تھا۔ اس نے بڑی بے قراری سے ہوسٹل کے دروازے سے دیکھا —— دُور کشور اور چوکیدار آرہے تھے —— یکایک امین کے کانوں کے پردے بجنے لگے —— تم یہاں سے بھاگ جاؤ، مینو، کشی آرہی ہے —— تم منوجی سے زیادہ عظیم ہو۔ کیونکہ تم نے اپنی منوسمرتی میں سے گرہستھ آشرم اڑا دیا ہے —— تم دیوتا ہو —— مہا دیوتا —— تمھیں سیکسوفون بجانے سے کیا غرض، تم یہاں سے چلے جاؤ —— تم حیوان نہیں ہو —— اور انسان بھی نہیں ہو —— سپیل باؤنڈ وہ سانپ ہے جس نے حوّا کو ورغلایا تھا، حوّا آرہی ہے —— نغمے نے چاندنی کے ساتھ مشورہ کرکے تمھیں ڈس لیا ہے —— اور اب زہر آہستہ آہستہ تم میں سرایت کر رہا ہے۔ اگر کشی تمھارے پاس آگئی تو کشی کو اپنی طرف بڑھتے دیکھ کر اس نے جانے کیوں اپنے پھیپھڑوں کی اس قوت سے قہقہہ لگایا کہ اس کی ناک پر بیٹھا ہُوا اُلو خوف زدہ ہو کر اُڑ گیا —— میں یقیناً دیوتا ہُوں اور منوسمرتی میری الہامی کتاب ہے —— اس کے کان سپیل باؤنڈ کی دُھن سے بجنے لگے —— اس نے کار کے ایکسلریٹر پر پیر رکھا اور کشی کو وہیں حیران چھوڑ کر پھر سڑک پر اُڑنے لگا۔

وہ کانتر و میں ڈوبا ویرانے کے بھنور میں آگیا۔ وہ چاندنی اور نغمے کے زہر سے اپنی رُوح کو پاک کرکے گیان حاصل کرنے کے لیے بان آشرم میں داخل ہو رہا تھا —— لیکن سپیل باؤنڈ پھر شکاری کُتّے کی طرح اس کا پیچھا کرتا ہُوا اُسے گھیر کے سمندر کے کنارے لے آیا جہاں چاندنی کی آنچ سے اُبلتا ہُوا سمندر اس

کی رُوح میں اترتے ہوئے زہر کو چھونے کے لیے بے قرار تھا۔ وہ سمندر کے لاتعداد بازوؤں کو گھورتا ہوا دھیرے دھیرے کار سے اُترا اور پھر پاگلوں کی بھاگتا ہوا گیلی گیلی ریت پر لیٹ گیا۔

مینوسمرتی ——— مینوسمرتی ——— مینورشی ——— مینورشی ——— وہ لہروں کے ہونٹوں سے گیان چوسنے لگا ——— اور سمرتیوں کے سارے آشرم نمکین پانی سے بالکل گل گئے۔

کاکا

رات بڑی تیزی سے سورج کو اُفق کی قبر میں دھکیلتی ہوئی مشرق کی کوکھ سے برآمد ہو رہی تھی اور ریل گاڑی بھی کچھ ایسی ہی تیز رفتاری سے بھاگی جا رہی تھی جیسے سورج کی قبر میں مٹی کی پہلی مُٹھی ڈالنا چاہتی ہو۔

انٹر کے زنانہ ڈبے میں حسبِ معمول بے پناہ شور تھا۔ اور حسبِ عادت ہر عورت دوسری کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے پہلے ہی موقع میں، اپنے چُپ عرصے کے دوران سوچی ہوئی بات اُگل دیتی تھی۔ ہر زنانہ ڈبے میں ایک ہی قسم کی باتیں ہوتی ہیں۔

"ہاں بہن آپ کی بات سے یاد آیا ——— میرے مُنّے کو بالکل یہی تکلیف ہوگئی تھی۔ آپ بھی اس کا یہی علاج کریں ——— صبح صبح دودھ پلانے سے پہلے۔"

"علاج تو مَیں نے بہت کیے ہیں۔ ہمارے بہنوئی کی خالہ کے لڑکے بہت اچھے ڈاکٹر ہیں ——— وہ ———"

"آپ کے بُندے بہت اچھے ہیں۔ میرے دیور بالکل ایسے ہی بُندے امریکہ سے بنوا کر لائے تھے۔"

"اے مُنّے ڈھیٹ کہیں کے ٹیں ٹیں کیے جاتا ہے۔ دو منٹ آرام سے بات بھی نہیں کرنے دیتا۔"

"پان کھائیے گا؟"

"اے بہن یہاں پان کہاں —— اچھے پانوں کو تو زبان ترس گئی۔"

"میرے یہ ——"

"میرے وہ ——"

وغیرہ۔ وغیرہ۔

کونے میں ایک بزرگ خاتون آنکھیں موندے بیٹھی تسبیح پر وظیفہ کر رہی تھی۔ وہ جب سے سوار ہوئی تھی، سیٹ پر نماز کی جگہ بنا کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ بڑھاپے میں انسان دور اندیش ہو جاتا ہے۔ اگر انسان گاڑی میں سوار ہو کر قضا یا ادا نماز پڑھنے کے بعد وظیفہ کرنے لگے۔ اور وقتاً فوقتاً سجدہ دیتا رہے تو عشاء کے بعد سونے کے لیے جگہ اچھی مل جاتی ہے۔

وہ ان بزرگ خاتون کے سامنے بیٹھی کھڑکی سے اپنی آنکھوں کی جِلا کے لیے سورج کی آخری کرنیں سمیٹ رہی تھی۔ وہ اس سارے ڈبے میں، ساری دُنیا میں تنہا تھی۔ ساتھ بیٹھی دو ایک عورتوں نے گفتگو کی کوشش کی تھی لیکن وہ چپ چاپ، اپنے دِل کے اندھے غاروں میں کرنوں کے جگنو سجاتی رہی۔

"بے چاری بہری ہو گی۔"

"اور گونگی بھی۔"

اور وہ دونوں آپس میں مصروفِ گفتگو ہو گئیں۔

بند کانوں اور سِلے ہُوئے ہونٹوں والی لڑکی کے قریب سے درخت بھاگتے ہُوئے اندھیروں کی سُرنگ میں اُتر رہے تھے۔ لیکن اس کی جامد آنکھوں کی سُرنگوں میں ہر چیز ساکت تھی۔ سوائے سُورج کے، جو آہستہ آہستہ اس کی نگاہوں سے پھسل رہا تھا —— ڈوبتے انسان کے ہاتھوں سے لائف لائن کے مانند۔

سُورج کی آخری کرن ٹوٹ گئی اور اس نے اپنے جسم سے نکلتی ہُوئی جان کے سامنے مُردہ اُمیدوں کے ہاتھ جوڑتے ہُوئے اپنے سامنے والی بزرگ خاتون کی طرف دیکھا، وہ مغرب کی نماز پڑھ رہی تھی۔ ورنہ اسے اپنی طرف دیکھتے ہی ان کے ہونٹوں پر بڑی پُر شفقت سی مُسکراہٹ پھیل جاتی، جیسے یہ اپنی ماں کی قبر سے اُترے ہُوئے پھُول سمجھ کر چُن لیتی۔ دوسری عورتیں حسبِ معمول ایک دوسری پر بھنبھنا رہی تھیں۔ اُس کے ساتھ والی دو عورتوں میں سے ایک جانے کس وقت اور کہاں اتری تھی۔ اس کی جگہ کوئی صحت مند سی عورت بالکل اسی طرح آکے بیٹھ گئی تھی جیسے کرکٹ کے کھیل میں آؤٹ ہونے کے بعد دوسرا کھلاڑی آجاتا ہے۔

وہ صحت مند عورت بات بات پر کھل کھلا کے ہنس دیتی تھی۔ ہنستے وقت اس کے بھرے بھرے گالوں میں آنکھیں چھُپ جاتی۔ ساتھ والی نے بڑے رشک سے کہا —— "اچھا —— تو آپ کے میاں سپرنٹنڈنٹ ہیں"۔ اُس کے اپنے میاں غالباً کلرک تھے۔

"جی ہاں —— کاکے کے ابّا تو مجھ سے ایک سیکنڈ بھی علیحدہ نہیں ہوتے۔ آج بڑی مدت کے بعد میکے جا رہی ہُوں —— میری ماں، باپ، اور سارے بہن بھائیوں کے مسلسل خطوں نے ——"

—— ماں باپ، بہن بھائی —— میرا کوئی بہن بھائی نہیں —— میری امی بھی نہیں —— اور میرے ابّا نے مجھے ڈولی میں سوار کرتے ہُوئے

کہا تھا۔ اب سسرال ہی تمہارا گھر ہے۔ اب مڑ کر پیچھے نہ دیکھنا۔ وہاں کسی کو نہیں پاؤگی —
اب سسرال میرا گھر ہے، لیکن میں پیچھے مڑ کر دیکھ رہی ہوں — وہاں میرا کوئی نہیں
ہے — کوئی نہیں ہے — امّی — اس لڑکی نے صحت مند خاتون سے
فوراً نظریں ہٹا کر سامنے دیکھا۔ بزرگ خاتون نے ابھی سلام نہیں پھیرا تھا۔ اور کاکا کے ابّا
نے اس وعدے پر مجھے میکے جانے کی اجازت دی ہے کہ میں وہاں دو دن سے زیادہ
نہیں رہوں گی۔ اور میرا کاکا بھی تو — کاکا؟ — کاکا — ہائے میں مر گئی"
صحت مند عورت نے اپنے سینے پر دو ہتڑ مار کے، کھڑکی کا سہارا لے کر کھڑے ہوتے بچے
کو فوراً اٹھا لیا۔

"ہائے بہن — کھڑا رہنے دیجیے نا — چاند نکلتا دیکھ رہا ہے بے چارہ —
آپ پیچھے سے اس کی قمیض پکڑ لیجیے"

"بہت مہنگا ہے میرا بچہ — اس کے ابّا —"

— اور بکواس بند کرو، کاکے کی اماں — اس لڑکی نے لفظوں کے
زہر کو حلق میں اتارتے ہوئے سوچا — میں گونگی ہوں۔ کچھ کہہ نہیں سکتی۔ میں بہری
بھی ہوں، لیکن تم کیوں مجھے اپنی بکواس سننے پر مجبور کر رہی ہو — کاش تمہارے
قہقہے میری سننے کی حس کو نہ جگاتے — تم — اس نے بے بسی میں اپنا بجھتا
ہوا چہرہ کھڑکی میں رکھ دیا۔

چاند، چاندنی — روشنی — لیکن جگنو سے شمع روشن نہیں کی جا سکتی۔ سیاہ
رات کے طوفان میں چاندنی کی لائف لائن شوت کی ہے۔ اور پہلے ہی ڈوبی ہوئی لاش کو کوئی
بھی لائف لائن کس طرح زندگی دے گی۔ اس کی نگاہیں آسمان پر کانسی کے چمکتے ہوئے
الٹے کٹورے سے پھسل کر بے سود دعاؤں کی طرح دھرتی پر ٹپ ٹپ پڑیں اور زخمی پرندے
کی طرح سامنے سنسان کھیتوں میں رینگتی ہوئی ایک گرے ہوئے تنہا ویران سے کچے مکان میں

داخل ہوگئیں اور اس کو بہت دُور سے صحت مند عورت کی آواز آئی جیسے اسی مکان میں بول رہی ہو۔

"جی ہاں ——— میرے میاں مجھے بہت چاہتے ہیں۔ ان کے دفتر سے آنے کے وقت اگر میں دروازے میں منتظر نہ ہُوں تو پریشان سے ہو جاتے ہیں ——— اور"
اس نے اپنے کاکے کے کُرتے کا دامن اور بھی مضبُوطی سے پکڑتے ہُوئے کہا۔

گول مٹول سا بچہ کھڑکی کا سہارا لیے چاند دیکھ دیکھ کر کلکاریاں مار رہا تھا۔ دو ایک مرتبہ بچّے نے اپنے سامنے اس لڑکی کے لہراتے ہُوتے بال ہاتھ بڑھا کر پکڑ لیے تھے اور اس نے "دسی" کر کے ویران گھر سے نگاہیں ہٹائے بغیر بڑی بُری طرح سے اس کا ہاتھ جھٹک دیا تھا ——— جُوں جُوں وہ ویران مکان آگے بڑھ رہا تھا۔ تُوں تُوں صحت مند عورت کی آواز بھی اونچی ہوتی جا رہی تھی۔ اور اس لڑکی کا دِل گاڑی کی کھڑک کھڑاک سے بھی زیادہ تیزی سے دھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔

"آپ کی تو مَیرج ہُوئی ہو گی"

صحت مند عورت کچھ شرما سی گئی ——— "جی نہیں ——— لَو مَیرج تو نہیں ——— دراصل یہ میرے ماموں کے لڑکے ہیں ——— شادی سے پہلے کوئی خاص بات چیت نہیں تھی ——— بس کبھی کبھی ان کو اپنی طرف عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے ہُوئے محسوس کر کے مَیں پسینہ پسینہ ہو جایا کرتی تھی ——— پھر ———"

صحت مند عورت کھِل کھلا کر ہنس پڑی اور ویران مکان میں بھٹکتی ہُوئی لڑکی نے اس کی آواز کے تیروں سے بچنے کے لیے اپنے بھڑکتے ہُوئے سُرخ کانوں میں انگلیاں دے لیں لیکن صحت مند آواز کے سامنے یہ بند بالکل کچے تھے۔

"ایسی شادیوں سے زندگی اکثر اچھی گزر جاتی ہے۔ اب میرا ہی قصّہ لیجیے۔ میرے ———"

"چھوڑیئے بھی جی ——— مَیں نے تو یہ شادیاں اکثر ناکام ہوتی دیکھی ہیں۔ جب تک میاں بیوی میں شادی کے بعد بھی پیار قائم نہیں رہتا، زندگیاں جہنّم ہو جاتی ہیں۔"

ویرانوں میں بھٹکتی ہُوئی لڑکی کے کانوں کی سُرخی رفتہ رفتہ اس کے گالوں کی طرف بڑھ رہی تھی اور اس کے دِل کی دھڑکن اب گاڑی کی رفتار سے بھی تیز ہو گئی تھی —— ساتھ والی عورت نے کہا ——— "دراصل طبیعتوں کا اصلی پتا تو ———"

"نہیں بہن ——— مَیں تو یہ جانتی ہُوں کہ خوشی کی ذمّہ دار عورت ہی ہوتی ہے —— ہمارا تو پیار اب بھی اسی طرح ہے بلکہ پہلے سے بھی زیادہ بڑھ گیا ہے۔"

"بچّے ہونے کے بعد تو اتنا پیار نہیں رہتا۔ میرے بہنوئی کو اکثر یہی شکایت رہتی ہے کہ ———"

"ہائے بہن بچّے تو میاں بیوی کے درمیان مضبوط زنجیر ہوتے ہیں۔ جانے وہ کیسی ہوں گی جو بچّوں کی پرورش میں اپنے خاوندوں سے لاپرواہ ہو جاتی ہیں۔"

اس لڑکی نے مضبوطی سے کھڑکی کا تختہ تھام لیا ——— سامنے گھومتی ہُوئی زمین میں دھیرے دھیرے زلزلہ آ رہا تھا۔ ویران دیواریں ڈول رہی تھیں اور وہ اس مکان کی طرف بڑھتی ہی جا رہی تھی، قریب ——— اور قریب ——— اس کا دِل گاڑی سے کئی میل آگے جا چکا تھا اور اب رفتہ رفتہ اس کے شریانوں میں دھڑک رہا تھا۔

"جب کل کے میاں تشریف لائے تو انھوں نے کتنی ہی رقم ہم ماں بیٹے پر سے وار کے فقیروں میں بانٹ دی تھی ——— عقیقے کے روز تین دیگیں چڑھی تھیں اور ——"

"لڑکا جو ہُوا تھا ——— پلوٹھی کا لڑکا بھی خوش نصیبوں ہی کے ہاں ہوتا ہے۔ میری چھوٹی بہن کے ہاں ———"

"اب تو ہم دونوں کو لڑکی کی خواہش ہے۔" صحت مند عورت نے اپنے پھولے ہُوئے پیٹ پر دوپٹہ کھینچ کر شرماتے ہُوئے کہا وہ بچّہ پھر اس لڑکی کے پریشان بالوں

کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا اور اس لڑکی کے سامنے صرف وہ مکان تھا جس کی دیواریں زلزلے میں ڈولتی ہوئی گرتی گرتی رہ جاتی تھیں۔ اس کا سارا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ ماتھے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے اُبھر آئے تھے اور اس کا دل، دماغ کی شریانوں میں یوں دھڑک رہا تھا جیسے کوئی پناہ لینے کے لیے بند دروازے پر دستک دے رہا ہو۔

"جب سے کاکا پیدا ہوا ہے ——— میری اور بھی خاطریں ہونے لگی ہیں ——— پہلے تو یہ کبھی کبھی دوستوں کے ساتھ سینما یا چائے پینے چلے جاتے تھے۔ اب تو بس چھٹی ملتے ہی گھر آجاتے ہیں ——— اتوار کا سارا دِن کاکے کے ساتھ کھیلتے گزرتا ہے ——— جب کاکا سو رہا ہوتا ہے تو ہم دونوں اس کے مستقبل کے بارے میں سوچتے ہیں ——— ہم اُسے ڈاکٹر بنائیں گے ——— انشاء اللہ ——— بہن مَیں تو یہ سمجھتی ہو کہ بہت ہی بدنصیب گھر ہوتا ہوگا جس میں بچے نہ ہوں ——— ارے آپ کو کاکے کی ایک شرارت سناؤں ——— ایک روز یہ ———"

میرے یہ ——— میرا کاکا ——— میرے یہ ——— میرے یہ ———

ویران مکان اپنا غار ایسا منہ کھولے لڑکی کی طرف بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ اس میں سے صحت مند عورت کی آواز پوری قوت سے آرہی تھی۔ بالکل سامنے آکر ویران مکان کی دیواریں زور زور سے کانپتی ہوئی، گرنے لگیں ———

دھڑام ——— دھڑام ——— میرے یہ ——— میرا کاکا ——— اس کے سامنے چاندنی کی راکھ چاٹتے ہوئے مکان کا گرد و غبار دھوئیں کی طرح اُٹھنے لگا۔ اس کا دِل بڑی تیزی سے دماغ کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ ٹھک ۔ ٹھک ۔ اس کے ماتھے کا پسینہ بہہ کر گالوں پر اُتر آیا۔

ٹھک ٹھک ٹھک۔ اس گول مٹول سے بچّے کے ہاتھ میں اس کے لہراتے ہوئے بال آہی گئے۔ صحت مند عورت اس کی شرارت سناتی ہوئی زور سے ہنسی ——— کاکے نے اس کے بالوں کا گچھا پوری شدّت سے کھینچا اور دِل نے دماغ کا دروازہ توڑ دیا۔

اس لڑکی نے بچّے کے ہاتھ سے بال چھڑا کر اسے بڑے زور سے چپت لگائی اور پاگلوں کی طرح اسے اُٹھا کر کھڑکی سے باہر پھینکنے لگی ——— تو بھی جا چاندنی کی راکھ میں۔

"ہائے میں مر گئی۔" صحت مند عورت کے ہاتھ سے بچّے کا کرتہ پھسلتے پھسلتے بچا ——— ساری عورتوں کی نگاہیں اس لڑکی پر جم گئیں ——— ہیں ——— کیا ہوا ——— کیا بات ہے ——— اچھا ——— کیوں ——؟

"تیرا بیڑہ غرق ہو ——— تیرا کچھ نہ رہے ——— اس معصوم نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔ اس نے کاکے کو سینے سے چمٹاتے ہوئے کہا ———

"او تیری ——— حرامزادی"

ویران نگاہوں والی لڑکی کے سُرخ چہرے پر موت ایسی زردی چھاگئی۔ ——— اور اس کی نگاہیں پتھرا گئیں۔ بزرگ خاتون نے فوراً تسبیح رکھ کے اپنے سینے پر پھونک مارتے ہوئے پوچھا۔

"کیا ہوا بیٹی ——— یہ تم نے کیا کیا ——— کیوں؟"

ساری عورتیں متوجہ ہو کر رائے زنی کرنے لگیں۔ ڈبہ مچھلی مارکیٹ بن گیا۔

"بتاؤ نا بیٹی ———" وہ خاتون مُسکرائیں۔

اس نے بزرگ خاتون کے ہونٹوں سے اپنی امّی کی قبر سے اُترے ہوئے پھول

چنے۔ اور اِس کی نگاہیں پگھل کر آنسوؤں میں ڈوب گئیں۔

"مجھے آج میرے میاں نے طلاق دے دی ہے اور مَیں گھر ——"

"اچھا —— چچ چچ —— لیکن کیوں؟"

"کیونکہ —— کیونکہ —— میرے ہاں اولاد نہیں ہوتی۔"

اور ڈبے کی کوکھ میں قبرستان ایسا سناٹا چھا گیا۔

پرتو

جب آسمان کی کوکھ تاریکیوں کو جنم دینے لگتی اور رات کے دوش پر تاریکیوں کا سیلاب اُمڈنے لگتا تو وہ چپکے سے مکان کی چھت پر چلی جاتی اور دُور اُفق پر سیاہیوں میں گھلتی ہوئی سُرخی کو دیر تک دیکھتی رہتی۔ اور پھر جب چاروں طرف اندھیرے لپکنے لگتے اور تاریکیاں اس کی رُوح کو محیط کر کے اس کے دل میں اُترنے لگتیں تو وہ بہت ہی بے چین ہو کر اونچی منڈیروں والے گھر کے صحن میں کچھ اس طرح چکر کاٹنے لگتی جیسے کِلّے کے ساتھ رَسّی سے بندھی ہوئی بکری اپنی قید سے تنگ آکر کِلّے کے گرد گھومنا شروع کر دیتی ہے۔

صحن میں پھرتے پھرتے اس کے ذہن میں لاتعداد پریشان سے خیالات آتے جو اس کے ذہن کے مجروح کرنے کے بعد بالکل اسی طرح غائب ہو جاتے جیسے اس کے گھر کے سامنے سے گزرتے ہوئے اجنبی لوگ —— پھر وہ یکایک ایک بھاری سی آواز سے چونک اُٹھتی ہے —— ''جمیلہ!''

اس کے تمام خواب ٹوٹ جاتے اور وہ اپنے بکھرے ہوئے بالوں کو اپنے پریشان

خیالات کے مانند کندھے پر گرے ڈوپٹے کی بغل میں سمیٹتی اور ہولے ہولے سیڑھیاں اُترنے لگتی۔ اور پھر جب ابّا کی دوسری آواز اس کے کانوں سے ٹکراتی —— "جمیلہ بیٹی! آؤ کھانا کھالیں"، تو اس کا دوپٹہ اس کے سینے کو بھی اپنے دامن میں چھپا لیتا اور وہ خاموشی سے اپنے ابّا، امّی اور چھوٹی بہن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانے لگتی۔

اس کو سکول سے اُٹھا کر جب اس کی ماں نے اس سے یہ کہنا شروع کیا کہ "جمیلہ! سر پر دوپٹہ اُڑھا کر، اب تو ماشاءاللہ جوان ہوگئی ہے ——"

تو اس کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کو دوپٹے نے جکڑ لیا ہے۔ اس کے اور اس کی سہیلی کے درمیان صرف دو گھروں کا فاصلہ تھا۔ لیکن تھوڑے ہی عرصہ بعد اس کے ابّا کے کہنے پر اس کی ماں نے اس کی سہیلی کے ہاں آنا جانا بھی ختم کرادیا کیونکہ وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے کہ ان کی جوان بیٹی بازار سے گزرے۔

کبھی کبھار اس کی سہیلی اس کے ہاں آتی اور وہ دونوں پچھلے کمرے میں بیٹھی گھنٹوں کھسر پھسر کیا کرتیں۔ اور جب آخر وہ بتاتی کہ اس کے خالہ کے لڑکے نے آج اسے فلاں تحفہ خرید کے دیا ہے اور آج انھوں نے گھر سے چوری چھپے ہوٹل میں چائے بھی پی تھی تو جمیلہ روہانسی ہو جاتی اور اس کا دل سینے کے پنجرے میں بے بسی سے پھڑپھڑانے لگتا۔ اس کے ہاتھ کی پشت پر جلتے ہوئے کوئلے سے پڑا ہوا نشان بڑی شدت سے دھک دھک کر پھیلنے لگتا اور اس کے سارے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے کر اس کے ذہن کو بھی راکھ کر دیتا اور وہ اس راکھ کو اپنے زخمی دل پر لگاتے ہوئے سوچتی ..... جانے فضل اس وقت کہاں ہوگا ——؟ جانے کوئی اور فضل بھی کیوں اس کی زندگی میں نہیں آتا —— جو اسے ناخنوں کی پالش اور سُرخی لاکر دے —— وہ کب آئے گا —— فضل، فضل —— میری پیاری سہیلی —— میری اچھی ہمراز —— کاش فضل تمہارا بھائی نہ ہوتا۔ کاش اس کے بارے میں گفتگو کرنے کی چاہ نے تمہارے سامنے میرے ہونٹوں کو سی نہ دیا

ہوتا ــــــ یہ سب کچھ مَیں کس سے کہوں۔ اس کے متعلق کس سے پُوچھوں ــــــ مجھے ہونٹوں میں پڑا ہُوا تالا توڑنے میں شرم آتی ہے جیسے مَیں تمھاری کوئی چیز چرا رہی ہُوں۔ ابھی کل ہی کی تو بات تھی کہ وہ ہنڈکلھیا اور گڈے گڑیا کے بیاہ ایسے کھیلوں میں ان کا ساتھ دیا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب اس کی ان سے لڑائی ہُوئی تھی تو اس شریر نے گڈے اور گڑیا دونوں کو جان سے مار ڈالا تھا اور پھر جب ہنڈکلھیا کے کھیل میں چھینا جھپٹی کی نوبت آئی تھی تو اُس نے چمٹے سے سلگتا ہُوا کوئلہ پکڑ کے اس کے ہاتھ کی پُشت پر رکھ دیا تھا اور وہ چیختی ہُوئی گھر بھاگ آئی تھی۔ اس نے ماں سے گیلا آٹا زخم پر لگواتے ہُوئے کتنی بار دروازے کی طرف دیکھا تھا کہ شاید وہ اس کی خبر لینے آئے۔ لیکن وہ بے پروا سا لڑکا نہیں آیا تھا اور اس نے یہ سوچ کر دل کو تسلی دے لی تھی کہ شرمندگی نے اس کے پاؤں جکڑ لیے ہوں گے۔ اور جب وہ دوسرے دن ان کے ہاں گئی تھی تو فضل نے واقعی بڑی شرمندگی سے اس کے ہاتھ میں چمٹا دے کر کہا تھا ــــــ

"تم میرے ہاتھ پر کوئلہ رکھ دو ــــــ"

اور جمیلہ نے بڑے فاتحانہ طریقے سے چمٹا پھینک کر اپنے دل میں کہا تھا نہیں فضل ــــــ مجھ میں اتنی ہمت کہاں اور پھر جب ایک مرتبہ وہ اپنے گڈے کو کہیں رکھ کر بھول گئی تھی تو فضل نے اس شرط پر گڈا بننا منظور کیا تھا کہ جمیلہ گڑیا بنے۔ اتنے بڑے جاندار گڈے اور بے جان ننھی سی گڑیا کا کیا جوڑ ــــــ یہ سُن کر بچپنے کے باوجود جانے کیوں اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا اور اس کے گال خون سے جلنے لگے تھے۔

اسے تو سب کچھ یاد تھا۔ سب کچھ۔ لیکن فضل ــــــ؟ فضل تمھیں تو کچھ بھی یاد نہیں۔ اگر ہوتا تو آج میرے ہاتھ کا زخم میرے دل پہ نہ اتر آتا۔ اگر یہ تمام یادیں تمھیں عزیز ہوتیں تو تم مجھ سے بغیر ملے کبھی نہ اپنے چاچا جی کے ہاں رہنے کے لیے جاتے یہاں بھی

تو سکول تھے نئے شہر اور اپنے ابا، امّی سے دُور رہنے کے شوق میں تم مجھے بھی بھول گئے اور اگر تمھارے چاچا کو میری حالت کا پتہ ہوتا تو وہ تمھارے ابا سے ضد کر کے تمھیں کبھی نہ لے جاتے ـــــ تمھارے ابا تمھاری شرارتوں سے تنگ تھے اسی لیے تو انھوں نے چاچاجی کی بات مانی تھی۔

فضل کے جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد وہ دوپٹے سے بندھی گھر کی چاردیواری میں قید ہوگئی تھی۔

کبھی کبھی وہ اپنی سہیلی سے فضل کے بارے میں پوچھ لیتی تھی لیکن اس سلسلے میں وقت کے ساتھ ساتھ اس کی زبان کی لکنت بڑھتی گئی اور ایک دِن گنگ ہوگئی وہ باوجود کوشش کے بھی اس کے سامنے فضل کا ذکر نہیں کر سکتی تھی۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنے آپ کو احساس کے بارے میں سوچنا سراسر دیوانگی ہے۔ تب وہ بازار کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی کی چِک میں آنکھیں لگائے گھنٹوں نامعلوم شخص کی آمد کا انتظار کرتی۔ اور رات کو جب خاموشی مسلط ہو جاتی تو وہ بستر پر لیٹ کر چاند اور ستاروں سے پوچھتی ـــــ میں کس کی منتظر ہوں ـــــ؟ وہ میری زندگی میں کیوں نہیں آتا؟ اے اللہ میاں۔ مجھے بھی میری سہیلی کی طرح بنایا ہوتا ـــــ میں کیا کروں۔؟ پتھریلے ستارے صرف آنکھیں ہی جھپکتے رہتے اور چاند اس کی حالت پر مسکراتا ہوا اُونچی اُونچی دیواروں کی اوٹ میں ہو جاتا ـــــ نیند کے ساتھ ساتھ باوجود کوشش کے جانے کیوں پھر اس کی آنکھوں میں آجاتا اور وہ اپنی سہیلی کی قسمت پر رشک کرتی ہوئی سو جاتی جو کہ اب اپنی خالہ کے لڑکے کے ساتھ ہفتے میں ایک مرتبہ سینما بھی چلی جاتی تھی۔

فضل بھی شاید اپنے دِیے ہُوئے نشان کی طرح اس کے دماغ سے سمیٹ کر رہ گیا تھا۔

آخر ایک دِن اس نے اپنی تمام قوت کو سمیٹ کر اپنے ہونٹوں کا تالا توڑ ہی دیا۔

"آج کل فضل کہاں ہوتا ہے؟"

"اسے تو چاچا جی کے ہاں سے آئے ایک مہینہ ہو گیا ہے۔"

"ہیں!"

لمحہ بھر کے لیے اسے جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔

"ہاں۔ ہاں۔ کالج میں داخلہ لے لیا ہے نا۔"

"ا ـــ اچھا ـــ میں نے تو کبھی نہیں دیکھا۔" ضبط کے باوجود الفاظ اس کی زبان سے پھسل گئے۔

"صبح کا کالج گیا شام کو لوٹتا ہے۔"

جمیلہ نے دل ہی میں کہا ـــ او ـــ

"اب تو ماشاءاللہ اتنا جوان ہو گیا ہے کہ شاید پہچان بھی نہ سکو۔"

میں اور اسے نہ پہچانوں ـــ! یہ بھی اس نے اپنے دل ہی میں کہا۔

"میرے لیے بڑے اچھے اچھے ناول لاتا ہے ـــ تم پڑھو گی؟"

ضرور ـــ میں نے آج تک کوئی ناول نہیں پڑھا۔"

اپنی ماں کے منع کرنے کے باوجود جمیلہ کی آنکھیں چق میں جمی رہتیں۔ فضل وہاں سے گزرتا اور جمیلہ کی نگاہیں اس کے اوجھل ہونے پر بھی اس کا تعاقب کرتی رہتیں۔ اس نے دو ایک مرتبہ کھنکار کے اوپر سے چھوٹے چھوٹے کنکر مار کے اسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہا لیکن اس مٹی کے مادھو کو قطعاً احساس نہ ہوا کہ کوئی اس کی خاطر کھڑکی میں رہتا ہے اور دیوانوں کی طرح چاند اور ستاروں سے باتیں کیا کرتا ہے ـــ ان جاندار ستاروں سے جو اس کے اپنے گھر کے اوپر بھی چمکتے تھے۔

اس کی سہیلی اُسے مختلف ناول لا کر دیتی جنھیں وہ بہت چبا چبا کر پڑھتی ہر کتاب کے اختتام پر اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ ناول کی ہیروئن تھی اور فضل ہیرو

اس کی آنکھوں کے پردے پر ناولوں کے دلچسپ منظر فلم کی طرح گھومتے رہتے فضل کو وہ اپنی آنکھوں میں بند کر کے سو جاتی اور رات بھر عجیب عجیب سے خواب دیکھتی رہتی جن کا کوئی سر ہوتا نہ پیر۔

اس نے کئی مرتبہ اپنی سہیلی کے سامنے اپنا دل کھولنا چاہا لیکن ہر مرتبہ دل کی کتاب کے اوراق آپس میں چمٹ جاتے۔

ایک دن اُس نے اپنے ابّا کے سگرٹوں کی خالی ڈبیا سے پنی نکال کر اس پر فضل کا نام لکھ کر بلیڈ سے کاٹا اور کتاب میں رکھ دیا۔ جانے اسے کیوں یقین تھا کہ دوسری کتاب میں فضل بھی اس طرح اس کا نام لکھ کر رکھے گا۔ جب دوسری کتاب آئی تو اس نے ایک ایک ورق الٹ کر دیکھا لیکن وہاں پر مُنہ چڑاتے ہُوئے الفاظ کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس نے سوچا شاید وہ پنی فضل تک پہنچی ہی نہ ہو اور کہیں گر گئی ہو۔ تب وہ ہر کتاب میں اسی طرح پنی پر فضل کا نام کاٹ کر رکھ دیتی اور دن بھر کھڑکی میں کھڑی جاگتے خواب دیکھتی رہتی اور سوچتی رہتی کہ ایک رات ایسی ضرور آئے گی جب وہ اس ناول کی ہیروئن کی طرح چارپائی کی دوائن کھول کر کھڑکی سے باندھے گی اور اس ذریعہ سے وہ نیچے اترے گی جہاں فضل کھڑا ہوگا وہ اس کے کاندھوں پہ پیر رکھ دے گی اور کہے گی —— فضل! مَیں آگئی۔

پھر ایک شام اس کی سہیلی نے باتوں باتوں میں اسے بتایا کہ فضل کو پڑھائی ختم کرنے سے پہلے ہی کسی پٹرول کمپنی میں نوکری مل گئی ہے اور وہ کل آبادان جا رہا ہے۔

اس کے دل کی حرکت لمحہ بھر کے لیے بند ہو گئی —— کاش مَیں اس سے مل لیتی — شاید یہ پچھتاوا مجھے دیمک کی طرح ساری عمر چاٹتا رہے —— مجھے اس سے ایک بار تو ملنا چاہیے۔ مَیں اس سے ضرور ملوں گی اور اس کو اپنا دل کھول کر دکھاؤں گی اور کہوں گی —— میرے دل پہ جو چرکے تم نے لگاتے ہیں پہلے ان پر مرہم لگاؤ پھر جہاں جی چاہے چلے جانا —— میں یہیں ساری عمر تمھارا انتظار کروں گی —— لیکن مَیں اس

سے کب ملوں ——— ؟ کیسے ؟ ——— کاش وقت تھم جائے ———

وہ کوئی بہانہ بنا کر سہیلی کے پاس سے اٹھی اور جلدی سے ایک کاغذ پر لکھا۔ "جانے سے پہلے مجھ سے ضرور ملو۔ مجھے بہت کچھ کہنا ہے" اس کاغذ کو کتاب میں رکھ کر سہیلی کو دے دی ——— "لیتی جاؤ ——— لائبریری کو واپس کرنی ہوگی"

دُوسری صبح ساری دُنیا اپنے خوابوں میں مدہوش پڑی تھی لیکن دو آنکھیں کھڑکی میں تڑپ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ ساری دُنیا پر روشنیاں چھا گئیں لیکن آنکھیں ابھی تک کھڑکی میں جھول رہی تھیں۔ پھر ان آنکھوں نے جو کچھ دیکھا وہ انہیں آنسوؤں میں ڈبونے کے لیے کافی تھا۔

فضل اسٹیشن جانے کے لیے تانگے میں بیٹھا۔ اس کا ہاتھ اچانک کوٹ کی جیب میں گیا اور چند چمکیلے کاغذ نکل آئے۔ تانگہ چل پڑا۔ اس نے وہ کاغذ پھاڑ کر پھینک دیئے اور پنّیوں کے پُرزے نالی میں بہنے لگے ——— جمیلہ کی کھڑکیوں میں باندھی ہوئی رسّیاں ٹوٹ گئیں، جل گئیں۔

وہ سارا دن اپنے بستر پر لیٹی ڈوپٹے میں مُنہ چھپائے روتی رہی۔ اس کی ماں نے وجہ پوچھی تو اس نے سر درد کا بہانہ کر کے ٹال دیا۔

پھر اُس نے اپنی سہیلی سے ملنا جُلنا قریباً ختم کر دیا۔ کیونکہ اب اس کا سب کچھ اس آگ میں جل گیا تھا جو وہ اپنی خالہ کے لڑکے کی باتیں کر کے بھڑکایا کرتی تھی اور پھر وہ فضل کی بہن بھی تو تھی، فضل ——— جس نے کہ اس کے احساسات کے ٹکڑے کر کے نالی میں بہا دیا تھا۔ اس کی سہیلی جب بھی آتی تو جمیلہ اپنی ماں سے کہلوا دیتی کہ اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہے۔

وہ ہر وقت فضل کے متعلق سوچتی رہتی اور اکیلے میں فضل اس کے ذہن سے نکل کر اس کے سامنے آجاتا اور وہ کہتی فضل تُو نے ایسا کیوں کیا۔ ؟

میں نے ہمیشہ تمہیں اپنی آنکھوں میں بسا کر رکھا ہے ۔۔۔ لیکن تُو نے مجھے آنسوؤں کے جھولے میں بٹھا دیا ہے۔

پھر آہستہ آہستہ آہوں آنسوؤں کا یہ جھولا خشک ہوتا گیا۔ اور رفتہ رفتہ فضل اس کے ذہن کی گہرائی میں اس طرح غائب ہو گیا جیسے بچپن میں کوئلے سے جلنے کی درد کا احساس۔

وقت نے اس کی خواہشات کے زخموں کو مرہم بن کر بدل کر دیا تھا اور اب وہ ان زخموں کے نشانوں کو سینے سے لگائے پھر کھڑکی میں کھڑی کسی اجنبی کی منتظر رہنے لگی۔ شام کی تنہائیوں میں بال بکھیر کے اور دوپٹے کو چارپائی پر رکھ کر صحن میں چکر کاٹتے ہوئے وہ پھر کسی کی پکار کا انتظار کرنے لگی۔ کھڑکی کے لیے نئی رسی بُنی جانے لگی ۔۔۔ وہ وقت کب آئے گا۔ جب میں رسّی کے ذریعے سے بازار میں اتروں گی اور چپکے سے کسی کے کاندھوں پہ پیر رکھ کے کہوں گی میں آگئی۔

لیکن وہ وقت نہ آیا اور وہ اپنے خیالوں کے شہزادے کے جنازے کو اٹھائے ڈولی میں بیٹھ گئی۔

جب اس کی ماں نے بڑے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اس کو بتایا تھا کہ اس کے لیے بڑا اچھا رشتہ آیا ہے کوئی نند یا ساس نہیں ہوگی۔ لڑکا شریف ہے، نمازی اور پرہیزگار ہے۔ اور اس کو یقیناً پسند آئے گا تو وہ بڑے ہی عجیب سے ملے جلے جذبات کے ساتھ شرما کر وہاں سے اٹھ کر پچھلے کمرے میں بھاگ آئی تھی۔ اور اُس کی ماں نے بیٹی کی رخصتی کے خیال سے جمع ہوتے ہوتے آنسوؤں کو پیتے ہوئے سوچا تھا کہ ایسی بیٹیاں بہت کم خوش نصیبوں کے ہاں پیدا ہوتی ہیں جو اپنے والدین کے لیے رسوائی کا باعث نہیں ہوتیں ۔۔۔ فلاں کی لڑکی فلاں کے ساتھ بھاگ گئی تھی ۔۔۔ اس کی بیٹی کا فلاں کے ساتھ یارانہ تھا ۔۔۔ فلاں ایک ہفتہ غائب رہ کر لوٹی تھی ۔۔۔ اس کی ماں نے عشاء کی نماز کے بعد گیارہ نفل شکرانے کے پڑھے تھے۔

جمیلہ کو شادی کے خیال سے عجیب سی سنسنی محسوس ہوتی۔ سارا سارا دن اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجتیں اور رات کو سوتے وقت اس کی آنکھوں میں بے شمار پھول سما جاتے جب کبھی اس کو بھولے سے کھڑکی اور رسّی کا خیال آجاتا تو اس کی رُوح کانپ جاتی ——— ابّا اور امّی کی کتنی رسوائی ہوتی۔ کتنی نادانوں والی خواہش تھی ——— لیکن پھر بھی برقی رو کی طرح ایک خیال اس کے ذہن کو جھٹکا دیتا ہُوا گزر جاتا ——— کاش اس کی خواہشات کی تکمیل ہو جاتی۔

کوئی شہنائی نہ بجی کوئی پھول نہ برسا۔ اور بڑی خاموشی سے اس کا بیاہ مولوی شریف حسین سے ہو گیا۔

جمیلہ گھونگھٹ کاڑھے بستر پر بیٹھی مولوی شریف حسین کا بڑی بے صبری سے انتظار کر رہی تھی۔ وہ آرہا تھا۔ اس کے قدموں کی چاپ کے ساتھ اس کے دل کی حرکت تیز ہوتی گئی۔ اس نے کمرے میں قدم رکھا تو جمیلہ کی آنکھیں جگمگانے لگیں۔ مولوی شریف نے السّلام علیکم ورحمۃ اللہ کہتے ہُوئے اس کا گھونگھٹ الٹ دیا۔ جمیلہ کی آنکھوں کے دیئے بُجھ گئے۔ اس کے سامنے لمبے لمبے پٹوں اور چھدری داڑھی والا ایک آدمی کھڑا تھا جمیلہ پتھرا گئی۔ مولوی شریف گلا صاف کرتے ہُوئے قرأت کے انداز میں صدیوں سے گھسا ہُوا فقرہ کہا۔

''زندگی دو پہیوں والی گاڑی ہے۔ مَیں اور تم دونوں اس گاڑی کے پہیئے ہیں ایک پہیّہ بھی خراب ہو جائے تو گاڑی کا چلنا ناممکن ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تم اچھی بیوی ثابت ہو گی۔''

اس نے کوک بھری گڑیا کی طرح سر ہلا دیا۔ پھر مولوی شریف نے کمرے کی بتی بجھا دی اور سب کچھ اندھیرے میں ڈوب گیا۔ اجالا ———!

لیکن یہ اُجالا اس کے لیے وہ اُجالا ثابت نہ ہُوا جس سے انسان کی رُوح تک

روشن ہو جاتی ہے۔ اس نے زندگی کے دوسرے پہیئے کو بڑی گریس دی لیکن وہ پہیہ اپنی ہی آواز میں چرچراتا رہا۔

مولوی شریف صبح دفتر جاتا اور شام کو گھر میں زیادہ سے زیادہ دو گھنٹے ٹھہر کر اپنے پیر و مرشد قبلہ حاجی صاحب کے ہاں چلا جاتا اور وہاں سے رات گئے لوٹتا جمیلہ کی آنکھیں اس کے انتظار سے پتھرا جاتیں اور پھر جب اس کے دل و دماغ پر مایوسیاں حاوی ہو جاتیں تو وہ سوچتی،

شریف ایسا کیوں ہے ——— وہ میری ہمسائی کے خاوند کی طرح کیوں نہیں ——— وہ کیوں مجھے اپنے پیر صاحب کی خواہشات پر قربان کر رہا ہے ——— اس کا میرے ساتھ ہشتینی برتاؤ کیوں ہے اگر میں کسی چیز کی خواہش کرتی ہوں تو غربت آڑے آجاتی ہے لیکن پیر صاحب کے لیے وہ دنیا کا سب سے امیر آدمی بن جاتا ہے ——— وہ ابھی اسے نہیں سمجھاتے ——— وہ کیوں مجھ سے میری مسرتیں چھین لینا چاہتے ہیں ———؟

جب اس کے ذہن میں کیوں کی تکرار شروع ہو جاتی تو لوبان کے دھوئیں عطر کی خوشبو اور سبز چادریں اس کے دماغ پر تن جاتیں جن کے پیچھے اسے کچھ نظر نہ آتا، جب وہ مولوی شریف سے شکوہ کرتی تو وہ بہت ناراض ہو کر کہتا۔

میں دنیا کی خوشیوں کو آخرت کے لیے قربان کر کے اپنی عاقبت سنوارنا چاہتا ہوں اور قبلہ حاجی صاحب اس کا وسیلہ ہیں اور تمہیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ تم گاڑی کا دوسرا پہیہ ہو۔

پھر وہ دنیا اور آخرت کے چکر میں پڑ جاتی اور سوچتی ——— کیا واقعی دنیا میں پیروں کے کھاتے میں جمع کرائی گئی خوشیاں اس کو آخرت کے بینک سے مل جائیں گی؟

مولوی شریف کے رویے کے متعلق وہ اپنے ابا امی سے کچھ نہیں کہتی تھی۔ اس کو پتہ تھا کہ وہ اس بارے میں کچھ نہیں سنیں گے کیونکہ انھوں نے اسے ڈولی میں بٹھاتے

وقت سمجھا دیا تھا کہ جب والدین بیٹی کو رخصت کر دیتے ہیں تو بعد میں انہیں کسی بات پر اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا خاوند ہی سبھی کچھ ہوتا ہے۔

ایک دن وہ بہت ہی مجبور ہو کر حاجی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئی اور رو رو کر سارا حال بیان کیا۔ حاجی صاحب مراقبے میں چلے گئے اور جب کافی دیر بعد برآمد ہوئے تو انھوں نے "حق" کا نعرہ لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ کچھ نہیں —— وہ مجذوب ہو جائے —— مجذوب۔"

اس کی دنیا اور بھی اجڑ گئی۔ اس کی امیدوں نے جس نازک شاخ پر بسیرا کیا تھا وہ حاجی صاحب کے نعروں سے ٹوٹ گئی... کر جال سے جل گئی۔ اس کا ذہن مفلوج ہو گیا تھا جو اپنے مستقبل کے متعلق بھی کچھ نہیں سوچ سکتا تھا۔

اس کے اور ساتھ کے مکان کے درمیان ایک کھڑکی تھی جو کمرے میں جاتی ہوئی سیڑھیوں کی طرف سے ہمسائی کی طرف کھلتی تھی۔ اس کی ہمسائی نے جمیلہ کی سہولت کے لیے اپنے گھر کی طرف بانس کی سیڑھی لگا دی تھی تاکہ وہ اس کے گھر آسانی سے جا سکے۔ وہ کھڑکی کے ذریعے سے ہمسائی کے پاس چلی جاتی اور اس کے پاس رو رو کر جی کو ہلکا کیا کرتی اور اس کے منّے سے لڑکے سے دل بہلایا کرتی۔ اس کی ہمسائی اس کو تسلی دیا کرتی کہ خدا کے ہاں دیر ہے۔ اندھیر نہیں —— سب ٹھیک ہو جائے گا۔

اور وہ سوچتی —— دیر کرنے والا ہی جانتا ہے کہ یہ سب کب ٹھیک ہو گا۔

پھر اس نے مولوی شریف کا انتظار کرنا چھوڑ دیا کیوں کہ اس نے اس دن سے شام کے وقت بھی آنا چھوڑ دیا جس دن جمیلہ نے اسے بتایا تھا کہ اس کے پیٹ میں دوسرا دل دھڑکنے والا ہے۔

مولوی شریف حاجی صاحب کی خدمت میں ہر وقت حاضر رہتا اور اپنی ایک خواہش کو اکثر ان کے سامنے دہراتا کہ کسی طرح اس کے ہاں لڑکا پیدا ہو۔ تاکہ وہ اسے

ان کی سپردگی میں دے دے اور وہ بھی ان کے سلسلے کی تبلیغ کرے حاجی صاحب فرماتے ——— "خدا نے چاہا تو لڑکا ہوگا"۔

جس رات جمیلہ کو بچہ پیدا ہونے والا تھا۔ مولوی شریف پیر صاحب کے ہاں بیٹھا دُعا میں مشغول رہا۔ گھر میں ہمسائی کے علاوہ اور کوئی نہ تھا۔ جب تکلیف زیادہ بڑھی تو ہمسائی کے خاوند نے اس کی ماں کو تار دے کر دایہ کو بُلا لایا۔ ماں کے آنے سے پہلے ہی بچہ پیدا ہو گیا ——— لڑکی تھی!

دوسری صبح مولوی شریف آنکھوں میں رات کی نیند سمیٹے آیا۔ جمیلہ نے شادی کی رات کے بعد پہلی مرتبہ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ دیکھی تھی۔ مولوی شریف نے بڑی بے صبری سے پوچھا ———

"کیا ہُوا ———؟"

جمیلہ نے ہونٹوں پر ادھوری مُسکراہٹیں سمیٹے ہُوئے کہا "لڑکی"۔

مولوی شریف کو جیسے سکتہ سا ہو گیا ہو۔ پھر وہ الٹے پاؤں پیر صاحب کے ہاں بھاگا ——— اس نے چیخ کر پیر صاحب سے کہا

"قبلہ حاجی صاحب ——— لڑکی پیدا ہُوئی"۔

وہ مُسکرائے ——— "یہ تو ہم نے تمہارے جانے کے بعد ہی دیکھ لیا تھا۔

"ہم نے تو صحیح کہا تھا لیکن خدا نے اپنے پیارے کی بات کو زیادہ مقدم سمجھا ——— ارے پاگل! جس گھر میں لڑکی پیدا ہو وہاں رسولؐ اللہ سلام بھیجتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے تم ولایت کے بہت قریب پہنچ گئے ہو"۔

مولوی شریف ان کے قدموں میں گر کے ان کے پیر چُومنے لگا جیسے ولایت سمیٹ رہا ہو۔

جمیلہ کے دُکھ بٹ گئے اور اس کی تمام پریشانیاں اپنی بیٹی کو خوش دیکھنے میں

تبدیل ہوگئیں۔

رات کے سانچوں میں ڈھل ڈھل کر نکلتے رہے اور وقت پر لگا کر اُڑ گیا۔

جمیلہ بڑی حیران تھی کہ عابدہ کیوں نہیں اس کی طرح سارا سارا دن چھجے میں کھڑی رہتی ــــــ وہ کیوں نہیں سرِ شام ہی کوٹھے پر چلی جاتی اور بیقرار رہی میں ٹہلتی۔ وہ میری طرح ــــــ میری طرح ــــــ ایسے اجنبی کی منتظر کیوں نہیں جس کے لیے وہ کھڑکی میں رسّی باندھ کر نیچے اترنے اور اس سے کہے ــــــ "میں آگئی"

چلو اچھا ہے ــــــ بے چاری خواہ مخواہ کی پریشانیوں سے بچی ہوئی ہے۔

ایک رات وہ عابدہ کے مستقبل کے متعلق سوچتی ہوئی کہ وہ اس کے لیے کیسا دولہا لائے گی۔ سونے ہی والی تھی کہ عابدہ چپکے سے اٹھی اور جمیلہ نے کمرے میں دہکتے ہوئے کوئلوں کی مدھم روشنی میں دیکھا کہ دروازہ کھول کر باہر چلی گئی ہے جانے وہ بھی کیوں دبے پاؤں اس کے پیچھے آئی اور دروازے کی اوٹ میں کھڑی ہو کر اسے دیکھنے لگی عابدہ سیڑھیوں کے درمیان ہمسائی کی طرف کھلتی ہوئی کھڑکی کے سامنے رُک گئی اور آہستہ سے کھڑکی کی کنڈی کھول دی۔ دوسری طرف ٹھک سے کوئی چیز دیوار کے ساتھ لگی اور عابدہ نیچے اُتر گئی۔ جمیلہ نے کھڑکی سے ذرا سا سر نکال کر دیکھا، اس کی ہمسائی کا بیٹا حمید، پتھروں کو بھی کپکپا دینے والی سردی میں کھڑا عابدہ سے باتیں کر رہا تھا بانس کی سیڑھی جو شام کے وقت اُتار کے زمین پر رکھ دی جاتی تھی، دیوار سے لگی تھی اور عابدہ اس سیڑھی کے آخر قدم پر بیٹھی تھی۔

جمیلہ کا بوکھلایا ہوا دل کھڑکی سے اچھل کر گرنے لگا ــــــ "لوٹ آؤ عابدہ ــــــ تمھیں اپنے خاندان کی عزت کا کوئی خیال نہیں ــــــ ؟ شریف گھرانوں کی بیٹیاں یوں نہیں کیا کرتیں ــــــ عابدہ تمھیں شرم آنی چاہیے ــــــ تمہارے ابا آلیں سہی میں کل ہی اس کھڑکی کو اینٹوں سے چنوا دوں گی ــــــ کھڑکی ــــــ کھڑکی ــــــ رسّی ــــــ رسیاں .... میں آگئی ....

تھوڑی دیر بعد عابدہ نے حمید کے سینے سے الگ کر کہا "اب مَیں جاتی ہوں"
اور جمیلہ فوراً ہی اندر آ کر اپنے بستر پر لیٹ گئی ——— وہ عابدہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکی۔ جانے اس کا تمام غصہ اتنی سردی میں اسے پسینے میں شرابور کر کے کہاں چلا گیا۔ اس کے ذہن میں بڑے عجیب سے خیالات گڈمڈ ہوتے رہے ——— جانے کیوں اس کا دل انجانی خوشیوں سے ناچتا رہا ——— اس رات اسے پہلی مرتبہ محسوس ہُوا تھا کہ دُنیا میں غموں کے ساتھ خوشیاں بھی رہتیں ہیں۔

وہ ہر رات عابدہ کو حمید کے ساتھ دیکھتی اور ہر رات اس کی آنکھوں میں اَن دیکھی دُنیا آباد ہو جاتی اور وہ عابدہ کی تمام مُسکراہٹوں کو اپنے ہونٹوں پر سمیٹ لیتی۔

ایک مرتبہ ستارے اپنی آنکھیں جھپک جھپک کر سو گئے لیکن عابدہ حمید کے ساتھ باتیں کرتی نہ تھکی۔ پیر صاحب کے ہاں سے مولوی شریف کے آنے کا وقت قریب تھا اور وہ حمید کے کاندھے پر سر رکھے بیٹھی تھی۔ جمیلہ ایسے موقع پر اپنے خاوند کی آمد کے تصوّر سے لرز گئی۔ وہ جلدی سے اپنے کمرے میں آئی اور کمرے کی بھاری چیزیں اِدھر اُدھر کرنے لگی۔ عابدہ کمرے میں آواز سن کر چونکی اور بھاگ کر کمرے میں آ گئی جمیلہ فوراً بستر میں لیٹ گئی عابدہ نے اسے سوتے دیکھ کر اپنے دِل کو تسلی دی کہ بِلّی ہو گی۔

سردیوں کی ایک چمکیلی دوپہر کو جمیلہ کی مکان کی چھت پر بیٹھی کروشیے سے کچھ بُن رہی تھی۔ تاگے کا گولا زمین پر جا پڑا۔ وہ گولے کو اُٹھانے کے لیے اٹھی۔ جونہی اس کا سر دیوار سے اونچا ہُوا ایک پتھر سامنے کی دیوار سے ٹکرایا۔ پتھر کے گرد کاغذ لپٹا ہُوا تھا۔ اس نے کاغذ کھول کر پڑھا۔ عابدہ کے نام حمید کا خط تھا۔ اس نے خط پڑھ کر پھر اسی طرح پتھر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد عابدہ دُھلے ہُوئے کپڑے دیوار پر ڈالنے آئی۔ اس کی نظر پتھر پر جا پڑی۔ اس نے دھڑکتے دِل سے اٹھایا اور جلدی سے خط کو گریبان میں اڑس کر اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ جمیلہ اس کو یُوں ہی گھور رہی تھی۔

"کچھ نہیں امی ——— پتھر ہے۔ آج صبح ہی ——— جھاڑو دے گر گئی ہے پھر........"

"کھانا پک گیا ———"

جمیلہ مُسکرا دی اور جانے کیوں اسے گلے سے لگا لیا ——— "بڑی اچھی ہے میری بیٹی۔"

مولوی شریف نے ایک رات جمیلہ کو اٹھایا۔ اُس نے عابدہ کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اس نے جمیلہ سے کہا۔

"میری خواہش تھی کہ میرے گھر لڑکا پیدا ہوتا اور میں اسے حاجی صاحب کی غلامی میں دے دیتا۔ لیکن میری بدقسمتی عابدہ پیدا ہو گئی۔ لیکن بزرگوں نے میرے تمام دُکھ اپنا لیے اور قبلہ حاجی صاحب کو بشارت دی کہ عابدہ کو ان کے صاحبزادے کی غلامی دے دیا جائے ——— جمیلہ، مجھ ایسے گنہگار کے لیے یہ بہت بڑی بات ہے۔ شاید اسی طرح بخشا جاؤں۔"

جمیلہ جیسے کچھ بھی نہیں سُن رہی تھی۔ مولوی شریف نے کہا ——— "مَیں نے ہاں کر دی ہے۔"

وہ اس سے خوب لڑی لیکن مولوی پر کوئی اثر نہ ہُوا ——— اور اس نے فیصلہ کُن انداز میں کہا۔

"ہماری خوش نصیبی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی ہے کہ حاجی صاحب کے فرزند ارجمند کی اولاد ہمارے خاندان سے ہو گی ——— عابدہ اس مہینے کے آخر میں بیاہ دی جائے گی۔"

عابدہ اس مہینے کے آخر میں قربان کر دی جائے گی ——— اور میں دیکھتی رہوں گی اللہ میاں ——— میری آرزوؤں کی کلیاں عابدہ کے ہونٹوں پر کھل رہی ہیں۔

اب یہ بھی مرجھا جائیں گی ــــــــــ اللہ جی۔

جمیلہ نے گھٹتے ہوئے سانسوں میں عابدہ سے اس کا ذکر کیا تو اس کے آنسو بھی نہ بہہ سکے ــــــــــ اس کے مرجھائے ہوئے چہرے نے اپنی ماں سے کہا۔

"بی بی ــــــــــ ! کیا آپ میری خاطر کچھ نہ کریں گی؟"

"پیاری بیٹی ــــــــــ میں مولوی شریف کی بیوی ہوں ــــــــــ میں کیا کروں؟"

اس گھر کو پھر سے اداسیوں نے گھیر لیا۔

حمید کے دوسرے ہمسائے گھر میں سفیدی کرانے کے لیے وہ سیڑھی مانگ کر لے گئے تھے۔ عابدہ کھڑکی میں کھڑی رہتی اور حمید چارپائی کو دیوار کے ساتھ لگا کر اس پر چڑھ کر اس کے قریب ہو جاتا اور جمیلہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی سب کچھ سنتی رہتی اور اپنے آنسوؤں میں گھلتی رہتی ــــــــــ "جانے کیا ہو؟"

پھر شادی سے ایک ہفتہ پہلے عابدہ بہت جلد کھڑکی سے لوٹ آئی جمیلہ نے لحاف سرکا کے اپنی موندی ہوئی آنکھوں کے روزن سے دیکھا۔ عابدہ نے اپنے کپڑے نکال کر گٹھڑی میں باندھے اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے اپنی بی بی کو دیکھ کر کھڑکی میں آگئی۔

اس نے گٹھڑی کھڑکی سے پھینکی جو حمید نے دبوچ لی۔ پھر وہ کھڑکی سے نیچے اتری لیکن چارپائی پیروں کی پہنچ سے باہر تھی۔ وہ بہت ہی پریشانی میں کمرے میں آگئی اور بڑی بے قراری سے اپنے دوپٹے کے پلو کو انگلیوں سے مسلنے لگی۔

جمیلہ کو یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب کچھ خواب میں ہو رہا ہے۔ جانے

کیوں اس کی بولنے کی حس ختم ہو گئی تھی جیسے اسے اپنے اوپر بالکل اختیار نہیں تھا جیسے سب کچھ سیلاب میں بہہ رہا تھا۔

پھر عابدہ نے یکدم اپنی چارپائی کی ادوائن کھولی اور جلدی سے باہر آگئی۔ جمیلہ نے دروازے کے پیچھے چھپ کر دیکھا کہ وہ رسّی باندھ کر کھڑکی سے اُتر رہی ہے۔ جمیلہ کھڑکی میں آگئی۔ اور عابدہ نے حمید سے لپٹ کر کہا "میں آگئی"۔ اور ان دونوں کو چاندنی میں ڈوبے ہوئے اندھیرے نے نگل لیا۔

جمیلہ نے کھڑکی سے رسّی کھول کر کنڈی لگا دی اور کمرے میں آکر عابدہ کی چارپائی میں رسّی پرونے لگی۔ جیسے خواب کے خوشنما اور بھیانک احساسات کو ایک دوسرے سے باندھ رہی ہو۔

رشتے

"روشی۔ آج ڈاکٹر نے تم سے کیا کہا تھا۔؟ مجھے تو کچھ بتاتا ہی نہیں"۔

"کچھ نہیں بھیا۔ کہتا تھا کہ آپ اب جلد ٹھیک ہو جائیں گے"۔

"یہ بات تو میرے سامنے بھی کہہ سکتا تھا"۔

"ج ۔ جی بھیا۔ سچ یہی کہا تھا"۔

ہوں ۔۔ روشی! مجھے کب تک آرام آجائے گا"۔

"انشاء اللہ دو ایک ہی دن میں"۔

انشاء اللہ ۔۔ یہ انشاء اللہ بھی کتنا عجیب لفظ ہے۔ یعنی اگر خدا نے چاہا۔ تو"۔

"آپ ایسی باتیں نہ سوچا کیجیے"۔

"تم ٹھیک کہتی ہو۔ یونہی سوچنے سے کیا فائدہ ۔۔ مگر کیا کروں کم بخت دماغ تو نیند میں بھی نہیں سوتا"۔

"اچھا بس اب آپ ریسٹ کیجیے۔ ورنہ میں آپ سے روٹھ جاؤں گی۔ اور دماغ سے

کہیے کہ وہ بھی سو جائے۔"

"ارے پگلی۔ اگر دماغ بھی سو گیا تو پھر میں دوبارہ کیسے جاگوں گا"۔

"بھیا۔ ایسی بات نہ کہیے۔"

"میں تو مذاق کر رہا تھا۔"

"اچھا مذاق ہے۔"

لو بھئی۔ آج سے مذاق بھی نہیں کروں گا۔"

"یہ آپ سے کون کہتا ہے۔ بس ایسی بُری باتیں نہ کیا کیجیے"۔

"روشنی ___"

"جی۔"

"ٹمی کہاں ہے ___؟"

"ج ___ جی ___ وہ ___ بھابی ___؟"

"تو اس گھر میں کسی اور کا نام بھی ٹمی ہے۔"

"آپ کی مذاق کی عادت ابھی نہیں گئی ___"

"میں اسی عادت کے سہارے تو زندہ ہوں۔ اگر تم کہو تو آئندہ کے لیے کانوں کو ہاتھ لگاتا ہوں ___ میری توبہ ___ بس ؟"

"جائیے ___ میں نہیں آپ سے بولتی۔"

"جائیے۔ ؟ کہاں جاؤں اور کیسے جاؤں ۔ ؟ چارپائی سے ہلا تو جاتا نہیں ۔ اور پھر جانے کے لیے گھر سے بہتر کوئی جگہ نہیں اور اللہ کے فضل سے میں گھر ہی میں ہوں۔"

"آپ بہت شریر ہیں۔"

"___ تھا ___"

"میری ایک بات مانیے۔"

"ایک بات مان کر تو پچھتا رہا ہُوں۔ اب دوسری......"

"کونسی بات مان کر پچھتا رہے ہیں آپ۔؟"

"شادی کر کے۔"

"جی ——؟"

"کانوں سے میل صاف کراؤ۔"

"آپ بولے ہی بہت آہستہ تھے۔"

"کچھ نہیں۔ مَیں نے پوچھا تھا کہ کون سی بات مانوں۔"

"آپ آنکھیں بند کر کے خاموشی سے......"

"......جنّت سدھار جاؤں ——"

"بھیّا۔! مَیں رو دوں گی۔"

"اچھا بابا لو۔ بس۔! مَیں نے اپنے مُنہ کو تالا لگا لیا ہے —— یہ لو چابی۔"

"روشی۔!"

"جی۔"

"مَیں نے مُمّی کے متعلق پوچھا تھا۔"

"جی —— وہ میرے کمرے میں نماز پڑھ کر آپ کی صحت کے لیے دُعا کر رہی ہیں۔"

"صحت کے لیے۔؟"

"جی۔ وہ بے چاری تو دِن رات جائے نماز پر ہی بیٹھی رہتی ہیں۔ مغرب کے بعد سے اب تک نہیں اٹھیں۔"

"اچھا۔! بہت خوب۔"

"مجھے مائی جیواں نے آپ کی صحت کے لیے کل ایک وظیفہ بتایا تھا، وہی مَیں اور

بھابی دونوں کر رہی ہیں۔ مجھے تو گھر کے دوسرے کاموں سے فرصت نہیں ملتی۔ بھابی ہی دن رات لگی رہتی ہیں۔"

"اللہ میاں کو منانے کے لیے۔؟"

"اگر وہ نہ مانیں تو۔؟"

"یہ کہہ کر آپ ہنس تو یوں رہے ہیں جیسے کوئی بہت بڑا لطیفہ فرما دیا ہو۔"

"دراصل یہ زندگی ہی ایک بہت بڑا لطیفہ ہے اور موت اس لطیفے کی داد میں ایک قہقہہ۔"

"آپ مجھے مار کر ہی دم لیں گے۔"

"یہ بات سُن کر میرا دم نہیں نکلا۔ مرنا تو آخر ایک دن ہے ہی۔"

"آپ چُپ ہو جائیے، ورنہ میں چلی جاؤں گی۔"

"پھر میں اپنے آپ سے باتیں کروں گا۔ میرا جی چاہتا ہے کہ اتنی باتیں کر دوں کہ آئندہ زندگی کا اسٹاک بھی ختم ہو جائے ـــــ روشی! ممّی کیا واقعی میرے لیے اتنی عبادت کرتی ہے۔"

"یقین کیجیے بھیا۔ اب تو وہ اتنی بدل گئی ہیں کہ کیا کہوں۔"

مجھے یقین نہیں آتا۔ وہ ممّی جس کے قدم آج تک گھر میں نہیں ٹکے تھے اور جو مجھے اپنے ساتھ کلبوں میں گھسیٹے پھرتی تھی، وہ چوبیس گھنٹے گھر میں ہی ہے۔"

"اسے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے۔"

"اب شاید ہو گئی ہو۔ اگر پہلے ہوتی تو وہ کلب کے لوگوں کے مجبور کرنے کے باوجود کبھی ٹینس کا ٹورنامنٹ نہ کھیلتی ـــــ مجھے بچپن کی کتنی خواہش تھی۔"

"وہ تو اس کا بچپنا تھا۔ توبہ! وہ اس کے بعد کتنا روئی تھی۔"

"مجھے معلوم ہے — پھر اس کا دل دوستوں کی محفلوں اور کلب وغیرہ سے اچاٹ ہو گیا تھا۔ وہ تو مَیں ہی اس کو مجبور کر کے لے جاتا تھا کہ اس کا دِل بہلا رہے۔"

"انھیں تو آپ کے ساتھ شروع ہی سے محبت ہے اگر نہ ہوتی تو آپ سے شادی کیوں کرتی۔"

"وہ تو تمھاری مہربانیوں کی وجہ سے ہُوئی تھی۔"

"پتہ ہے؟ میرے ساتھ ہر وقت آپ ہی کی باتیں کرتی رہتی تھی کہ تمھارے بھیا بے حد اسمارٹ ہیں۔ بڑے اچھے تیراک ہیں۔ ہیں۔ اُن کے پسندیدہ رنگ کون سے ہیں؟ خوشبو کونسی استعمال کرتے ہیں — اور —"

"میرے محبوب مصنف وغیرہ۔"

"آپ نے کبھی نوٹ نہیں کیا کہ شادی سے پہلے جب بھی وہ مجھ سے ملنے کے لیے آتی تو آپ ہی کے پسند کے رنگوں کی ساڑھی پہن کر اور خوشبو لگا کر —"

"اسی خوشبو سے تو مجھے بھی زکام ہوا تھا۔ لیکن مجھے اس کا مکسڈ پارٹیوں میں جانا قطعی پسند نہ تھا۔"

"وہ تو اس کا ماحول ہی ایسا تھا — یوں تو وہ میری اتنی اچھی فرسٹ کلاس بھابی ہے۔"

"اسی لیے تو مَیں ڈرتا تھا کہ ہم انٹر کلاس کے لوگ اور وہ —"

"دیکھ لیجیے وہ کس طرح ہمارے رنگ میں بس گئی ہیں —"

"جانے کیسے —؟"

"واہ — اپنے میاں کی مرضی کے خلاف بھی لڑکی کچھ کر سکتی ہے۔"

"ممی وغیرہ کے ہاں تو ہر ایک کی اپنی مرضی ہی چلتی ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے —؟"

"انتشار ——"

"بہرحال مجھے کچھ پتہ نہیں —— مَیں صرف اتنا جانتی ہوں کہ تمتی اتنا کوئی لڑکی اپنے شوہر کو نہیں چاہ سکتی۔"

"اور مجھے کچھ پتا نہیں ہے؟ مَیں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ ان لوگوں نے اپنے جذبات کو واٹر ٹائٹ کمپارٹمنٹس میں رکھا ہوتا ہے۔ کیسے اور کیوں، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

"آپ ان سب چیزوں پر حاوی ہیں نا ——"

"شاید —— روشنی —— ! تم بھی اسی طرح کی کیوں نہیں ہو گئیں تھیں۔ ؟"

"کیا مطلب —— ؟"

"میرا مطلب ہے کہ —— وہ تمھاری بے حد عزیز سہیلی تھی نا ——"

"اور اب بھی ہیں —— پتہ ہے میری اور ان کی دوستی کس طرح شروع ہوئی تھی؟ امتحانوں کے دنوں میں انھوں نے مجھے اکنامکس تیار کرانے کو کہا تھا۔ اس کے بعد ہمارے ہاں آپ کو دیکھنے کے بعد ہماری دوستی اور پکی ہو گئی —— میں نے انھیں بہت سمجھانا چاہا کہ آپ کے اور ان کے خیالات بڑے متضاد ہیں تو کہنے لگیں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"مجھے تو ——"

"اور پھر اللہ بخشے امی جی کی بھی تو یہی خواہش تھی کہ آپ کے لیے اعلیٰ خاندان کی چاند سی لڑکی لائیں گی —— اور تمتی ......"

"چاند سی —— ! جانتی ہو کہ چاند کے کشکول میں روشنی کہاں سے آتی ہے؟ اور پھر سرمائے وغیرہ سے گھرانا اونچا ہو جاتا ہے کیا —— ؟ پھر تو ہم لوگوں کا خاندان اچھا نہ ہوا ——"

"آپ پھر اپنے فلسفے کے بور سے لیکچر دینے پر اتر آئے ہیں —— آخر کیا کمی ہے

بھابی ہیں ــــــ ذرا سوشل ہیں تو کیا ہوا ــــــ ؟"

"تو پھر تم بھی سوشل کیوں نہیں ہو جاتیں ــــــ"

"ہائے ــــــ میں مر نہ جاؤں ــــــ مجھے لو۔"

"تم اس گھر میں رہتی ہوئی اپنے ملک میں رہتی ہو اور وہ لوگ یہاں رہتے ہوئے بھی مغرب میں رہتے ہیں۔"

"تو پھر آپ نہ کرتے شادی ــــــ آپ ہی دیوانے ہوئے جا رہے تھے۔"

"اگر میں بیمار نہ ہوتا تو وہ کبھی نہ بدلتی ٹینس ٹورنامنٹ والے حادثے سے بھی وہ بہت کم وقت کے لیے متاثر ہوئی تھی۔ لیکن اب تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی انٹرکلاس کی مسافر ــــــ بیماری بڑے بڑوں کو سدھار دیتی ہے۔"

"انھیں کو آپ سے محبت ہے تو بدل گئی نا ــــــ ٹھیک راستے پر آنے کے لیے بھی تو کوئی بہانہ چاہیے ــــــ مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ آپ یونہی مجھے ستانے کے لیے بھابی کو باتیں بنا رہے ہیں ــــــ"

"تمھیں ستا کر مجھے بڑا لطف آتا ہے ــــــ یاد ہے نا بچپن میں تمھیں تنگ کرنے پر میری کتنی پٹائی ہوتی تھی ــــــ کیا تھا وہ واقعہ جب ......"

"اب بس کیجیے ــــــ آپ کتنے تھک گئے ہیں ــــــ گولیاں کھا کر سو جائیے۔"

"بھئی روشی! آج صبح سے تمھاری بھابی کے ہاتھ سے دوا نہیں کھائی۔ اسے بلاؤ۔"

"جی ــــــ ؟"

"ہاں ــــــ ہاں ــــــ وہ تو مصلے کو کبھی چھوڑتی نہیں ــــــ ٹمی ــــــ ٹم ــــــ می ــــــ !"

"ہائے اللہ بھیا۔ آپ بھی حد کرتے ہیں۔ دیکھیے تو سانس پھول گیا ہے۔ ٹھہریے میں بلا کر لاتی ہوں ــــــ"

".........او —— روشی .... تم اپنے لیے کتنی اچھی بھابی لائی ہو —— میری اس پندرہ دن کی بیماری نے اصلی ٹمی کو دریافت کیا ہے .... میری اچھی ٹمی! آج سے پندرہ روز پہلے کے تمہارے بارے میں مَیں اپنے تمام خیالات واپس لیتا ہوں .... کون کہتا ہے کہ ٹمی کی سماج کے لوگ اپنے پاؤں میں ڈالی ہوئی نقرئی زنجیریں نہیں توڑ سکتے .... کون کہتا ہے کہ ان کے دلوں کی لاشیں ان کے ماحول میں گل رہی ہیں ——"

"بھ —— بھیا —— ہٹمی بھابی داتا صاحب کے مزار پر گئی ہیں۔"

"........ آں۔"

"کیا سوچ رہے تھے آپ ——؟"

"مَیں سوچ رہا تھا کہ کیا بہروپیے پھر انسان بن کر انسان کے لیے انسانوں کی طرح سوچ سکتے ہیں۔"

"پھر وہی —— میرا جی چاہتا ہے کہ آپ کا دماغ دبلوا دوں۔"

"ٹمی نہیں آئی ——؟"

"لیجیے دوا کھا لیجیے —— مَیں نے کہا نا کہ داتا صاحب گئی ہیں۔"

"میری عمر بڑھانے ——؟ بھئی ——"

"اگر آپ نے آگے کچھ کہا، تو .... جبھی تو آپ جلد صحت یاب نہیں ہوتے۔"

"نہیں .... اب ٹمی کی دعاؤں سے جلد ہی اچھا ہو جاؤں گا۔ اب تو خود میرا جی مرنے کو نہیں چاہتا۔"

"ساڑھے نو بج گئے ہیں —— اب آپ سو جائیے۔ زبان کو کافی ورزش کرا لی ہے ——"

"ارے —— سنو تو کس کا فون ہے —— اچھا رہنے دو۔ عبدل سُن لے گا۔

تم لوری گاؤ تاکہ میں سو جاؤں۔"

"تو پھر پہلے آپ کو جھولے میں لٹانا پڑے گا ____"

"اور میں انگوٹھا چوستا ہوا سو جاؤں گا۔"

"____ کون تھا، عبدل ؟"

"بی بی جی ____ وہ جی ____ وہ بیگم صاحبہ کا فون تھا ____ کہتی تھیں کہ وہ صاحب کے لیے بڑا فکر کر رہی ہیں، اور ان کا حال پوچھتی تھیں اور کہتی تھیں کہ آج انھیں کلب میں ذرا دیر ہو جائے گی ____ آپ لوگ انتظار نہ کیجیے گا ____"

اجنبی

لڑکی نے اس کے گھر میں داخل ہوتے ہی نقاب اتار کے چاروں طرف دیکھا۔ اس کی نگاہیں دائیں طرف اور سامنے کے بند کواڑوں پہ دستک دیتی ہوئی بائیں طرف کے دروازے میں داخل ہو گئیں۔ لڑکے نے مڑ کر اس کی للچائی ہوئی آنکھوں کو دیکھا

——— "یہ باورچی خانہ ہے۔"

"جی۔" لڑکی نے اپنی نگاہوں کے پیچھے داخل ہونے کے لیے قدم بڑھایا۔

"اونہوں"

"جی؟"

"——— تم اندر نہیں جاؤ گی تم ———" پھٹی پھٹی حیران سی مجرم آنکھوں نے فقرہ اس کے گلے میں دبا دیا۔ "میرا مطلب ہے کہ اس میں، باورچی خانے میں صرف میری اماں۔"

"جی"، لڑکی جلدی جلدی برقعے کے نچلے حصے کے بٹن کھولنے لگی۔ اور پھر سوالیہ

نظروں سے لڑکے کی طرف دیکھا۔

"اوپر" لڑکا بڑبڑایا۔ لڑکی نے مڑ کے باورچی خانے کو ایک نظر دیکھنے کے بعد سر جھکا لیا اور لڑکے کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"ہائے۔ یہاں کتنا اندھیرا ہے۔" اسے دوسری سیڑھی پر ہلکی سی ٹھوکر لگی تھی۔

"ہاں۔ یہاں کا بلب فیوز ہو گیا ہے" اور لڑکے نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے سوچا —— یہ سیڑھیاں روشن نہیں ہیں۔

"اوئی"

"کیا بات ہے"

"کچھ نہیں" لڑکی نے اس کا ہاتھ دھک دھک کرتے دل پر رکھ لیا اور وہ سمجھ گیا کہ بات کوئی تکنیکی تھی۔

کمرے میں بیمار سا بلب اونگھ رہا تھا۔ اگر سورج یہاں چمکے تو سیڑھیوں میں بلب کی ضرورت نہ پڑے۔ اس نے سورج سے پیچھا چھڑاتے ہوئے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے جمخانہ کی بوتل نکالی اور میز پر رکھ کر سوچنے لگا۔ یہ میں آج بار بار کیوں سوچ رہا ہوں۔

لڑکی نے کھونٹی پر برقع لٹکا دیا اور کمرے کی واحد کرسی کو دیکھتی ہوئی بستر پر بیٹھ گئی۔

"لحاف لے لو"

لڑکی نے لحاف کنارے سے پکڑ کر اپنے اوپر کھینچتے ہوئے بڑی پیشہ ورانہ نظروں سے لڑکے کو دیکھا۔ اس نے لڑکی کی آنکھوں پر پڑے معصومیت کے نقاب کو تار تار ہوتے دیکھ کر اپنی سوچ کو ایک ہی جھٹکے سے کارک کے ساتھ بوتل میں گرا دیا۔ اس نے قینچی سے، بوتل کے منہ پر لگے کارک کو ہمیشہ بڑی صفائی سے نکالا تھا، لیکن وہ سب

نگاہیں ننگی تھیں۔ بے نقاب۔

لڑکی نے اسے کھونٹی سے قمیض اور پاجامہ اتارتے دیکھ کر مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

لڑکے نے کپڑے بدلتے بدلتے لڑکی کی طرف دیکھا۔ دلبر تانگے والا ٹھیک ہی کہتا تھا،

لڑکی بالکل نئی ہے، زیادہ سے زیادہ تین یا چار بار

"آپ بھی لحاف میں آجائیں نا۔"

تمھاری جگہ کوئی اور ہوتی تو مَیں خود ہی آجاتا، لیکن ابھی میرا جی نہیں چاہ

رہا۔ ابھی نہیں، وہ لڑکی کی آنکھوں میں جھانکتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

"آپ کو سردی لگ جائے گی۔"

اس انداز میں ایسے الفاظ کہنے تم نے کہاں سے سیکھے۔ اس طرح تو میری ۔

ماں کا خیال ذہن میں آنے سے پہلے ہی اس نے کرسی کی ٹیک سے سویٹر اٹھا کر پہن لیا۔

دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ لڑکے نے بھی مسکرانے کی کوشش کی۔ لڑکی لحاف

اوڑھے خواہ مخواہ کانپنے لگی۔ لڑکے نے میز پر پڑی شراب کی بوتل کے حلق میں اٹکے ہوتے

کارک کو دیکھا۔ مَیں ابھی آیا۔

"ہاتے۔ کدھر چلے آپ؟"

"جگ اور گلاس لے آؤں۔"

"مَیں اکیلی رہ جاؤں گی۔ مجھے بڑی سردی لگ رہی ہے" لڑکی نے لحاف کا کنارہ

اٹھا دیا۔ لڑکے کو شاید لحاف کے غار میں دہکتی ہوئی پنڈلی نظر نہ آئی "مَیں انگیٹھی بھی

لاتا ہوں۔"

لڑکی کی کپکپاہٹ ختم ہو گئی۔ بڑا عجیب ہے۔ اور اس نے جماہی لیتے ہوئے سامنے

اندھیرے میں ڈھلتے ہوئے سائے کو دل ہی دل میں بڑے زور سے گالی دی۔ دلبرے

تیرا پرانا باؤ تو بالکل اناڑی ہے۔ اسے تو مسکرانا بھی نہیں آتا۔ جانے کیوں ناراض

ہے۔ اگر کل اس نے تم سے شکایت کی تو مجھے۔ مجھے نہ پیٹنا۔ مَیں بالکل بے قصور ہُوں۔ مَیں تو پُوری کوشش کر رہی ہُوں۔ اسے مَیں نے ناراض نہیں کیا۔ اس نے قمیض اتار کے کرسی پر پھینک دی اور اپنی گرم چادر اوڑھ لی۔

لڑکا بغلوں میں ہاتھ دبائے سیڑھیاں اُتر رہا تھا۔ بغیر ٹھوکر لگے۔ اس کا ذہن دِن میں بھی تاریک سیڑھیاں اترتے چڑھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ دلبر نے تین سالوں میں آج پہلی مرتبہ سچ بولا ہے۔ اس میں واقعی پختگی نہیں۔ صاف لگتا ہے کہ وہ یہ سب کچھ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس نے ٹین کی ٹرے میں پانی کا جگ، اور دو گلاس رکھے۔ مَیں اس کے سامنے چپ سا کیوں ہو گیا ہُوں۔ مَیں ہمیشہ کی طرح فوراً ہی چارپائی پر کیوں نہیں چلا گیا۔ آج تو مَیں نے پہلے سے پیسے بھی دو گنے دیے ہیں۔ اُس نے آخری سیڑھی پر ٹرے رکھی۔

"کون ہے؟"

"مَیں ہُوں۔" وہ انگیٹھی لینے کے لیے پھر باورچی خانے میں آ گیا۔ دلبر، لالٹینوں کے پار مکان میں اپنے بابو کو لڑکی کی طرف پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے ہُوئے، اپنی نوکیلی مونچھوں کو تاؤ دے رہا تھا— "باؤ جی اس نے سُرخی پاؤڈر نہیں لگایا"— ہوں— "باؤ جی۔ بالکل تازہ ہے۔" لڑکی نچلا ہونٹ دانتوں میں لے کر شرماتی ہُوئی پُر اُمید نظروں سے لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں پر پڑا ہُوا معصوم سی نظروں کا غلاف دھواں بن کر لڑکے کے گرد چھا گیا۔ "باؤ جی۔ پھر کیا خیال ہے۔" "ٹھیک ہے۔" "رقم۔ دو گنی" "میری جیب میں پُوری تنخواہ ہے۔ دلبر نے لڑکے کو سُنانے کے لیے لڑکی کے کان میں سرگوشی کی تھی۔ "باؤ جی بہت پُرانے گاہک ہیں۔ سمجھیں؟"

—— میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آج میں کیوں بالکل نیا، اناڑی بن کر رہ گیا ہُوں۔ اس نے بوری سے کچے کوئلے نکال کر انگیٹھی میں جلتے ہُوئے کوئلوں پر ڈالے۔ دلبر اپنے

نمبردن ٹانگے کو اڑائے جا رہا تھا۔ لڑکے نے جیب سے سو روپے کا نوٹ نکال کر اس لڑکی کے سامنے کر دیا۔ وہ ہمیشہ اسی طرح ٹانگے میں بیٹھ کر لڑکی کے ہاتھ میں پیسے دیا کرتا تھا۔ لڑکی، نوٹ پکڑنے کے بجائے اس کا ہاتھ اپنے نقاب کے پیچھے لے گئی اور اس کے ہاتھ سے نوٹ انگیا کے پیچھے اڑس کے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ کاروباری اعتبار سے ہٹ کر وہ اس نئی تکنیک سے بڑا متاثر ہوا۔ بجلی کے کرنٹ کے ساتھ بوسے کا خلوص کپکپی بن کر اس کے جسم میں سرایت کر گیا۔ بہت مزہ رہے گا۔ دگنی رقم، دُگنا مزہ۔

وہ انگیٹھی اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ مَیں خواہ مخواہ جذباتی ہوں۔ اس کی نگاہوں میں کوئی خاص بات نہیں —— سو روپے ضائع نہیں ہونے چاہئیں۔ صبح دلبر آ کر اُسے لے جائے گا اور پھر ایک مہینے کے بعد وہ بالکل باسی ہو جائے گی۔ پچاس روپے والی۔ یہ سب، اپنے آپ کو تازہ رکھنے کے حربے استعمال کر رہی ہے۔ تاکہ گاہک آنکھوں کی بھول بھلیوں میں ہی بھٹکتا رہے۔ اور اپنی رقم تک نہ پہنچے۔

ٹرے دہلیز میں نہیں تھی۔ وہ کمرے میں آ گیا۔ ٹرے میز پہ بوتل کے پاس پڑی تھی۔ اس نے لڑکی کی طرف دیکھا وہ اپنے کندھے سے چادر سرکائے بیٹھی تھی۔ اس نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ مَیں اٹھا لائی تھی۔" وہ ایک بار پھر آنکھوں کی بھول بھلیوں میں بھٹک گیا۔ اس نے خاموشی سے انگیٹھی زمین پر رکھ دی اور ایک گلاس میں وہسکی انڈیل کر لڑکی کو اشارہ کیا۔ "پیو۔"

"مَیں نے کبھی نہیں پی۔" باؤجی لڑکی نئی نئی ہے پیتی ویتی نہیں —— اگر آپ پلا سکیں تو آپ کی ہمّت۔

"مَیں تو پلایا کرتا ہوں۔ مَیں نے تمہاری قیمت دی ہے۔"

"ہائے نہ۔"

لڑکے نے دوسرا گلاس بنا کر اٹھا لیا اور لڑکی کو گھورتا ہوا کرسی پر بیٹھ گیا۔

—— یہ پہلوں سے مختلف ہے۔ وہ تو بھوکے تھے۔ درندے۔ اس نے ابھی تک خود مجھے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس کی نظریں میز پر پڑے بھرے گلاس میں تیر کے لڑکے کی آنکھوں کے کنارے لگ گئیں۔ وہ بالکل چپ تھا۔ یہ لڑکی میرا وقت ضائع کر رہی ہے۔ اگر اس نے نہ پی تو سارا لطف جاتا رہے گا۔ اور میرے پیسے۔

لڑکی نے چادر اتار کے انگڑائی لی۔ "بتی بجھاؤں"

"نہیں۔"

"تو آپ مجھے یہاں لائے کس لیے ہیں" اس نے انگیا کے پیچھے اڑسا ہوا نوٹ نکال کے مٹھی میں بھینچ لیا۔

تم جب تک پیو گی نہیں میں اسی طرح بیٹھا رہوں گا —— اور سمجھوں گا کہ کسی نے میری جیب کاٹ لی ہے —— میں کیوں خواہ مخواہ جان بوجھ کر جیب کٹوا رہا ہوں —— پھر مجھے ایک مہینہ انتظار کرنا ہوگا۔ تنخواہ کا —— پھر ایک ماہ بعد میری ماں اپنے بھائی کے ہاں جائے گی —— وہ بالکل بچوں کی طرح ضدی ہے۔" لڑکی نے پھر شراب کے گلاس کو دیکھا —— لڑکا کچھ اس طرح چہرہ بنائے بیٹھا تھا جیسے کوئی بچہ خواہش پوری نہ ہونے پر روٹھ گیا ہو۔ یکدم جانے کیوں اسے لڑکے پر اتنا پیار آیا۔ اس نے سو کا نوٹ سرہانے کے نیچے رکھ کر گلاس تھام لیا۔

"تم بڑے عجیب ہو۔"

"تم بھی تو ہو۔"

لڑکے کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ لڑکی نے ایک ہی سانس میں سارا گلاس ختم کر دیا۔ "بہت کڑوی ہوتی ہے۔" اس کی شکل دیکھ کر لڑکے کو ہنسی آگئی "شکر ہے ہنسے تو ہو۔ اب آجاؤ۔" "میں حلال کی کمائی کھانا چاہتی ہوں۔ لڑکی نے سینے پہ ہاتھ رکھ کر ڈکار لیا۔

"ابھی نہیں۔" ابھی میرا جی نہیں چاہتا۔

"میں اچھی نہیں ہوں۔؟"

—تم بہت اچھی ہو بہت ہی اچھی لیکن پہلے شراب ختم کرلیں۔ لڑکے نے دونوں گلاس ٹرے میں رکھ دیئے اور میز اٹھا کر چارپائی کے ساتھ لگا دی "تم بتاؤ۔"

لڑکی نے میز پر جھکتے ہوئے لڑکے کو بالوں سے پکڑ کر اس کا منہ اپنے ہونٹوں کے قریب لے آئی۔ "میرے ہونٹوں میں بھی شراب ہے۔ میرے نہ پینے پر پہلوں نے مجھے بتایا تھا۔"

جب انھوں نے اپنے ہونٹوں سے ایک دوسرے کے پیمانے ہٹائے تو دونوں کی آنکھوں میں کمرہ گھوم گیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزر گئے۔ لڑکے نے دوسرے گلاس کا آخری گھونٹ بھی پی لیا۔ اس نے پینے میں آج تک اتنی جلدی نہیں کی تھی بہونا۔"

لڑکی نے اس کی طرف لمحہ بھر دیکھنے کے بعد گلاس اٹھا لیا۔ "اتنی جلد چڑھ جاتی ہے۔" اس کی آواز میں شراب گھل رہی تھی۔ آنکھوں میں خمار ——— آج تو مجھے بھی بہت جلد سرور آگیا ہے۔ الفاظ اس کے منہ سے موبل آئل کی طرح لٹک لٹک کر بہنے لگے۔ عجب انسان بیک وقت منہ ہونٹوں اور آنکھوں سے پیئے تو۔" میں مہینے میں ایک بار پیتا ہوں۔ لیکن اگر میں ہر روز پینے والا ہوتا تو بھی آج یہ آگ مجھے اتنی ہی تیزی سے جلاتی —

"کمرہ بہت گرم ہو گیا ہے۔" اس نے چادر لے کر بعد انگیا بھی اتار دی "تمہیں گرمی نہیں لگتی۔"

—گرمی ؟ تمہارے برف میں بنے مجسمے نے مجھے اور بھی سرد کر دیا ہے اور یہ سردی کچھ اتنی عجیب سی ہے کہ لگتی نہیں۔ برف کو کچھ عرصہ پکڑنے کے بعد ہاتھوں کو گرمی سی لگتی ہے اور بعد میں سن ہو جاتے ہیں۔ میں سن ہونے والا ہوں۔

"تم بولتے کیوں نہیں ؟"

"اور بتاؤ۔"

اور اس نے اور بنانے سے پہلے ایک ہی سانس میں اپنا گلاس ختم کر دیا۔ لڑکے نے جانے کیوں گرم چادر پھر اس پر ڈال دی — "تم بڑے عجیب ہو!"

"بار بار نہ کہو۔ تم مجھے بالکل عجیب بنا دو گی!"

"ناراض ہو گئے!" لڑکی نے اسے گلاس پکڑا دیا "لو اب میں چپ رہوں گی"

لیکن میں نے آج تک اتنی باتیں نہیں کیں۔ اور تم نے میری قیمت دی ہے۔ تم بڑے نادان ہو۔ بڑے بچے ہو۔ فضول خرچ — لڑکی نے ڈبیا سے سگریٹ نکالا۔

"اچھی لڑکیاں سگریٹ نہیں پیا کرتیں" اس نے سگریٹ اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

"— شراب پیا کرتی ہیں" لڑکی نے ہنستے ہوئے اپنے گلاس میں شراب انڈیلی۔

"شراب بھی نہیں پیتیں" اس کی تیز آواز نے لڑکی کا قہقہہ کاٹ کے رکھ دیا اور لڑکی کے ہاتھ سے بوتل چھین لی۔ لڑکی کی آنکھوں میں آنسو سمٹتے دیکھ کر اس کا اپنا گلا رندھ گیا — "مجھے معاف کر دو"

— معافی۔ ہائے الو کے پٹھے، معافی مانگنا ہماری قسمت میں لکھا ہے۔ "تم۔ تم کتنے اچھے ہو"

— مجھے آج تک ایسا محسوس نہیں ہوا۔ میں نے ایسی حرکتیں آج تک نہیں کیں۔ میں بے وقوف نہیں ہوں۔ میں جب سے جوان ہوا ہوں۔ ایک رات خریدتا ہوں۔ میں نے مہینے کے انتیس دنوں آنکھ اٹھا کر کبھی کسی لڑکی کو نہیں دیکھا — میں صرف ایک رات آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں، اور دوسری صبح نگاہیں پھر جھک جاتی ہیں — مبادا میرے پیروں میں پلکوں کی زنجیریں نہ پڑ جائیں۔ کیوں کہ میں دو سو روپے ماہوار کماتا ہوں۔ میری ماں کی بڑی خواہش ہے کہ میں شادی کر لوں — لیکن پیروں میں پڑی ہوئی پلکوں کی زنجیروں کو توڑ کر ہاتھوں ڈالنے کے لیے پیسہ چاہیے۔ اس لیے میں ہر مہینے پچاس روپے

میں ایک رات خریدتا ہوں۔ میرے پاس پیسے جمع نہیں ہو سکتے کیوں کہ میں اتنی راتوں کو جمع نہیں کر سکتا پچھلے تین سالوں کو گرہ نہیں دے سکتا۔ لیکن تم میری آنکھوں میں گھل کر کیوں میری رگ رگ میں اتر رہی ہو۔ جب کوئی اس طرح دبے پاؤں آنکھوں میں داخل ہو جاتا ہے تو جانتی ہو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے —— "آؤ محبت کریں۔"

"جی۔" لڑکی مسکرائی اور پھر ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ "وہ کیا ہوتی ہے؟"

لڑکا کچھ کھسیانا سا ہو گیا۔ پگلے اگر وہ اس لفظ سے واقف ہوتی تو اس دنیا میں اس کو جاننے والا صرف ایک ہی ہوتا۔ واقعی محبت کیا ہوتی ہے۔ یہ تو ایک خاص لمحے میں زندگی بھر کے لیے چھپایا ہوا ایک احساس ہوتا ہے —— یہ اس لمحے سے مانوس نہیں اور میری جھکی ہوئی نظروں کو کنکھیوں سے دیکھتا ہوا یہ لمحہ چپکے سے گزر گیا ہوگا۔ میرے پاس احساس تو ہے لمحہ نہیں تھا۔ اور اس سمے میں لمحے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہا ہوں —— وہ دھیرے دھیرے اٹھا اور لڑکی کے بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کرتا ہوا لمحے کا امرت چوسنے لگا۔

"یہ ہوتی ہے محبت۔"

"اچھا۔ اس طرح تو کئی بار ہوا ہے۔" لڑکی نے اس سے علیحدہ ہو کر بلب کی طرف دیکھا۔ لڑکے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"وہ کئی بار والی محبت صرف تاریکی میں ہو سکتی ہے" —— اجالے میں نہیں۔ اور آج سے بلب نہیں بجھے گا۔ کیوں کہ میرے پاؤں میں زنجیریں ہیں۔

"تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہم لوگ اپنا نام ہمیشہ غلط بتایا کرتی ہیں۔ کبھی کچھ، کبھی کچھ۔ اور پھر نام سے فرق کیا پڑتا ہے۔ غرض تو کام سے ہونی چاہیے اور اس غرض میں ہم کبھی کبھی اپنا نام بھی بھول

جایا کرتی ہیں۔ لڑکی نے آدھا لحاف، چارپائی سے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھے ہوئے لڑکے کو اوڑھا دیا۔ وہ اس کے گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے اس کی گیلی گیلی آنکھوں کی دلدل میں اتر رہا تھا۔ "لیکن تمھیں مَیں اپنا اصلی نام بتاؤں گی۔"

"میرا نام۔ لڑکی ہے۔" اس کی ہنسی میں شرارت تھی۔ "مَیں تمھیں نام دوں گا۔ تمھیں اپنے ماں باپ کا دیا ہُوا نام بھول ہی جانا چاہیے تھا۔" "تمھارا کیا نام ہے۔؟"

"لڑکا۔" دونوں پھر ہنس دیے۔ "تمھیں بھی میرا نام رکھنا ہوگا مجھے میری ماں کا دیا ہُوا نام اسی کی امانت ہے۔ آج مجھے بھی یہ نام بھول گیا ہے۔" "تمھاری آنکھیں گیلی گیلی کیوں ہیں ؟"

نہیں تو۔" "ویسے جب بہت زیادہ خوشی ہو تو بھی تو آنکھیں گیلی ہو جاتی ہیں۔"

"تو آج تم بہت خوش ہو ؟"

"ہُوں۔"

— مَیں بھی ہُوں۔" جب کبھی تم تنہا ہوتی ہو تو تمھارے دماغ میں کوئی ایسی تصویر نہیں آتی جسے دیکھ کر تم خود ہی شرمانے لگو۔؟"

— شاید کل سے اس طرح مُسکرانے لگوں۔" "ویسے تم نے مجھے پلا کر بڑا ظلم کیا ہے۔ پتا نہیں مجھے اپنے دماغ پر اختیار کیوں نہیں رہا۔" اس کا ہاتھ بوتل کی طرف بڑھا۔ لڑکے نے میز اٹھا کر پرے رکھ دی۔ "تم صرف باتیں کرو۔ اور پی کر سونا چاہتی ہو ؟"

"نہیں۔"

"نہیں نہیں۔ اگر سونا چاہتی ہو تو مَیں نیچے چلا جاتا ہُوں۔"

"ہائے رے کیسی باتیں کرتے ہو۔" لڑکی نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ وہ پھر اسی طرح لحاف اوڑھ کے ٹانگیں لٹکا کر بیٹھ گیا۔ لڑکی نے اپنے ہاتھوں کے کٹورے میں اس کا چہرہ لے لیا۔ پہلی رات کو اس طرح نہیں جایا کرتے۔ دُنیا میں تم ایسا ایک نہ ایک انسان

ضرور ہوتا ہے۔

"تمھیں گانا آتا ہے" لڑکی نے اثبات میں سر ہلایا "تو سناؤ"

دو پتر اناراں دے۔

ماہیا۔

جند دا دساہ کوئی ناں۔

اور ماہیے۔ آنسو ــــ

اور آنسو

"روؤ تو نہیں"

"تو کیا کروں۔ جب سے اس شہر میں آئی ہوں پہلی مرتبہ کھل کر روئی ہوں"

ــــ کیا ہوا تھا تمھیں۔ تم اس شہر میں کس طرح آئی تھیں؟ "ہر لڑکی زندگی میں ایک بار کھل کر رو ہی لیتی ہے۔ تمھاری بھی وہی بوسیدہ سی کہانی ہو گی"

"ہاں"

سکوت

"میں قصبے سے آئی ہوں۔ میں دو سال کی تھی تو میرے ماں باپ مر گئے تھے۔ میرے چاچے نے مجھے پالا تھا۔ میں نے بڑے بڑے ظلم دیکھے ہیں ــــ جانے عمر کے ساتھ ساتھ خوابوں میں بھی رنگ کیوں آ جاتا ہے۔ میرا بڑا جی چاہتا تھا کہ چاچے کی طرح میرا بھی کوئی شام کو کاروبار سے واپس آئے تو میں باورچی خانے میں اسے گرم گرم روٹی اتار کر دوں ــــ لیکن میرے چاچے کو اپنی لڑکی کی شادی کرنی تھی اور جانے کیا کیا کچھ کرنا تھا۔ اور میں اپنے خوابوں سمیت پانچ سو روپے میں بک گئی ــــ" ہنسی۔

"کتنی پرانی سی کہانی ہے۔ بابے آدم کے وقت کی ــــ ہے نا ــــ لیکن تم کیوں رو رہے ہو۔"

"تمہارے آنسو میری آنکھوں میں آگئے ہیں" "میں تمہارا نام رکھوں گا۔ میں اپنے گھر میں سورج جلاؤں گا ـــــ چلو"

"کہاں"

"نیچے باورچی خانے میں"

سوالیہ نظریں ـــ "مجھے روٹی اتار کے دو۔ گرم گرم" ـــ "کل کو اتار کے دوں گی"۔

لڑکی ہنسی "وہ تو خواب تھے۔ تم بتی کیوں نہیں بجھاتے؟"

"کوئی اور گانا سناؤ"

گیا ہیج تقدیر دے نال ٹھوٹھا، تے ساتھوں قیمت لے لے۔ لڑکی یکدم چپ ہوگئی۔ اس نے سرہانے کے نیچے سے سو کا نوٹ نکالا "وے۔ یہ واپس لے لے"

"کیوں؟"

بیمار بلب کی اونگھتی ہوئی روشنی نے کروٹ لی ـــــ "یہ میری رات کی قیمت ہے"۔ تمہاری قیمت ہے۔ کل کو جب دلبر پیٹ پیٹ کر میرے جسم پر لاشیں ڈال دے گا۔ تو میں گر گئے ہیں، کھو گئے ہیں کہتی کہتی تھک جاؤں گی اور سچ پھر بھی نہیں بولوں گی۔ میں اس سچ کو اپنے آپ سے بھی چھپاؤں گی۔ اور پھر اکیلے میں شرمایا کروں گی ـــ آپ ہی آپ "وے لے نا۔ تجھے میری جان کی قسم" اس نے نوٹ لے کر میز پر میز پوش کی جگہ پڑے اخبار کے نیچے رکھ دیا۔

ڈولی چڑھدے آں ماری آں ہیر چیکاں ـــــ ساری رات ڈولی چڑھے بنا ہیر روتی رہی۔ روتی ہی رہی اور لڑکے کی آنکھوں سے اس کے آنسو بہتے ہی رہے ـــــ ماں اب تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ـــــ تم اس روشنی کے لیے اپنے زیور بیچنے سے بھی دریغ نہیں کروگی۔ اب بیڑھیوں میں، میرے کمرے میں، ہمارے گھر میں سورج چمکے گا ـــــ اور ـــــ اور ـــــ "وے ـــــ میرا

ڈولا لینے تم ہی آنا۔"

"میں تمھارا نام رکھوں گا اور تم — تم — تم —" "وے — وے — سو گئے ہو —" بچہ — بالکل بچہ — ٹھک — ٹھک — ٹھک — لڑکے کی نیند کے دروازے پر دستک ہوئی — "کون —"

"میں جی — دلبر — ٹانگے والا۔"

روشن دان سے سورج کی پہلی کرن کمرے میں داخل ہونے کی کوشش کر رہی تھی — "اچھا۔"

لڑکی بھی اُٹھ بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تھکی تھکی رات تھی — "تم مسکرائیں کیوں نہیں۔ لڑکے نے بلب کی طرف دیکھا۔ پہلی کرن اس کی روشنی کو چاٹنے کی کوشش کر رہی تھی۔ لڑکی نے قمیض پہن کر تکیے کے نیچے ہاتھ پھیرا اور پھر تکیہ پلٹ دیا۔

"آپ — آپ کے گھر میں چور بستے ہیں؟"

"کیوں کیا ہوا؟"

"میرا نوٹ کوئی لے گیا ہے۔"

لڑکی کی نگاہوں نے لڑکے کی آنکھوں میں سارے شبہے انڈیلتے ہوئے سو کا نوٹ ڈھونڈا۔ لڑکے کی نظریں فوراً میز پر اخبار کے نیچے چلی گئیں —

— اور سورج کی پہلی کرن کو بلب کی بیمار روشنی چاٹ گئی۔

جنم دن

"اتنے شریف باپ کے بیٹے ہو کر بازار میں بنٹے کھیلتے ہو ــــ تمھیں شرم نہیں آتی"
"باپ تو اس کا بہت مشہور آدمی ہے"
"او جی ــــ ڈاکٹر صاحب نے لوگوں کے اتنے بڑے بڑے کام کیے ہیں ــــ لیکن بیٹے کو دیکھیے پتنگ بازی کرتا ہے"
"آوارہ ــــ ضرور باپ کے نام کو چار چاند لگائے گا"

بچپن میں جب بھی وہ ایسی باتیں سنتا تو اُسے یُوں محسوس ہوتا جیسے اُس کے باپ کی شہرت ایک ایسی تیز ڈور ہے کہ اُس کی ہر پتنگ کو ہوا لگتے. کاٹ کے رکھ دیتی ہے۔ محلّے کے لوگ اس کے باپ کی بہت عزّت کرتے تھے۔ کیوں کہ ایک تو وہ بہت اچھا ڈاکٹر تھا۔ خُدا نے اُس کے ہاتھ میں شفا لکھی تھی۔ دوسرے بڑے لوگوں کا معالج ہونے کے باعث وہ اپنے سرکاری مریضوں سے سرکاری کام بھی کرا سکتا تھا۔ اور یہ بھی ان کی

نظروں میں ڈاکٹر صاحب کی عظمت تھی کہ اتنا بڑا آدمی بننے کے باوجود انھوں نے اس محلے میں اپنا آبائی مکان نہیں چھوڑا تھا۔ وہ لوگ ڈاکٹر صاحب کی نظروں میں آنے کے لیے وقتاً فوقتاً ان کی حاشیہ برداری کیا کرتے، اور اس حاشیہ برداری کا سیاہ حاشیہ رشید ہوتا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے پاس اس کی مختلف شکایتیں، صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کرتے کہ وہ ان کے بہت بڑے خیر خواہ ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سارا سارا دن اپنی ڈسپنسری میں کام کرتے، دوپہر کو گھنٹہ دو گھنٹے سونے کے بعد پھر مریض دیکھنے لگتے اور رات کو دیر گئے گھر لوٹتے، جب رشید سو رہا ہوتا۔ رشید کی ماں سوتیلی تھی جو کبھی مصلحت کے پیشِ نظر اس کی زیادہ پروا نہیں کرتی تھی۔ مگر وہ روایتی سوتیلی ماں بھی نہیں تھی۔ ڈاکٹر صاحب خود تو سارا دن مصروف رہتے تھے، اس کی ماں کو اس سے دلچسپی نہیں تھی، اس لیے اکثر وہ اپنے محلے کے ہم عمر آوارہ لڑکوں کے ساتھ گھومتا رہتا۔ اس کو اپنی سوتیلی ماں سے کوئی شکایت نہیں تھی کیوں وہ اس کی باتوں میں دخل نہیں دیتی تھی۔ ڈاکٹر صاحب جانتے تھے کہ ان کے بیٹے کا خیال کیوں نہیں رکھتی۔ اس لیے وقت ملنے پر وہ بذاتِ خود اسے ڈانٹا کرتے تھے۔

جانے رشید کو اپنے باپ سے ضد کیوں تھی کہ جو کام بھی کرتا باپ کی مرضی کے خلاف کرتا۔ بعض وقت جب اُس کی پٹائی ہوتی تو اُس کا جی چاہتا کہ کہیں سے تلوار مار کر ڈور لائے اور اپنے باپ کی ٹُبلے چڑھی پتنگ کو ہاتھ سے کاٹ دے۔ اتنے زور سے بٹے کو نشانہ بنائے کہ شہرت کا بنٹا چکنا چُور ہو جائے، اور یا پھر اتنی زور سے مُٹل لگائے کہ اُس کی عزت گلی کے مانند سب کی نظروں سے دور جا کر کہیں کھو جاتے۔ لیکن اسے تلوار مار کر ڈور کہیں نہ ملی۔ دوسرا بنٹا زیادہ سخت تھا اور گلی بہت بھاری تھی۔ اور جب وہ بہت زیادہ جھنجلا جاتا تو سوچتا کہ اس کا باپ اتنا مشہور آدمی کیوں ہے اور سب اس کی اتنی عزت کیوں کرتے ہیں ؟

بننے کو تو وہ بھی اپنے باپ کے قدموں پر چل کر بڑا آدمی بن سکتا تھا۔ لیکن اس کو پڑھائی سے دلچسپی نہیں تھی۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب نے یونیورسٹی کی نبض پر اس طرح انگلیاں رکھیں کر وہ پاس ہو ہی گیا۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ بھی ڈاکٹر بنے تاکہ ان کی اتنی بڑھی ہوئی پریکٹس ضائع نہ ہو، اور ان کا بیٹا اس سے فائدہ اٹھائے۔ لہٰذا میٹرک کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اسے میڈیکل کالج میں سائنس پڑھنے کے لیے کہا تو اس نے حسبِ عادت انکار کر دیا لیکن جب اُسے پتہ چلا کہ میڈیکل گروپ میں لڑکیاں بھی پڑھتی ہیں تو وہ مان گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے تصور ہی تصور میں دیکھا کہ رشید ہینڈ بیگ لیے وزیرِ اعظم کی کوٹھی کا دروازہ کھول رہا ہے۔

لیکن رشید نے اپنے لیے وہ تمام دروازے بند کر لیے جو اس کے باپ کی تعبیروں کی طرف کھلتے تھے۔

پروفیسر اس سے کہتے۔

"بھائی۔ کیوں باپ کا روپیہ ضائع کر رہے ہو۔ کچھ پڑھا۔"

"کیوں اس کی عزت مٹی میں ملا رہے ہو؟"

"لڑکیوں کے پیچھے پھرنا چھوڑ دو۔"

وہ دل میں کہتا ——— "میرا باپ کوئی بڑا آدمی نہیں ہے ——— بڑے لوگوں کی خوشامد کرتا ہے ———" اور جب پروفیسر اُس کی زبانی سُنتے کہ وہ اپنے باپ سے بھی بڑا آدمی بننے والا ہے تو ہنس دیتے۔ اور رشید کو یوں محسوس ہوتا، گویا یہ ہنسی ان خالی برتنوں کی آواز ہے جو کسی بڑے پتھر سے ٹکرا گئے ہوں۔ اور وہ سوچتا ——— "سالے مجھے سمجھے نہیں ——— میں بہت بڑا آدمی ہوں۔"

دوسرے ہم جماعت شہزادوں کے ساتھ پیریڈ چھوڑ کر کافی ہاؤس جانے اور دیگر آوارہ گردیوں کے باعث وہ ایف ایس سی میں کئی بار فیل ہوا۔ اور جب بھی اُس کا باپ

اسے ڈانٹتا یا پیار سے سمجھاتا تو وہ دِل ہی دِل میں مُسکراتا ——— "وہ کتنا بڑا آدمی میرے سامنے بے بس ہے۔"

پھر ایک ہم جماعت کو تنگ کرنے کے باعث اس کو کالج سے نکال دیا گیا، اور جب یہ خبر سارے کالج میں مشہور ہوگئی تو وہ بہت خوش ہُوا کہ اس کے باپ کی عزت ینھیلینڈ پیپرٹ کے مانند اُڑ گئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی بیوی نے ڈاکٹر صاحب کو اس کے خلاف بھڑکایا۔ کیوں کہ اب اس کا اپنا بیٹا بھی بچپن سے قدم نکال رہا تھا۔ جب اُنھوں نے اپنے دوسرے بیٹے کا رشید سے مقابلہ کیا تو اپنی بیوی کی ہدایات کے مطابق اس نتیجے پر پہنچے کہ آوارگی متعدی بیماری ہے۔ اس لیے اسے علیحدہ کر دینا چاہیے۔ اُنھوں نے اسے ایک فرم میں نوکری دلا دی، اور کہہ دیا کہ وہ اپنا انتظام خود کرے۔

چند دِن بعد وہ اپنے کلرک دوستوں نسیم اور جلیل کے پاس اُٹھ آیا جو ایک مشترکہ فلیٹ میں رہتے تھے۔

نسیم اور جلیل کو اُردو ادب سے بہت دلچسپی تھی۔ نسیم تو شاعر بھی تھا۔ دفتر کے اوقات کے بعد جب بھی انھیں وقت ملتا، تو دُنیا جہاں کے ادیبوں اور شاعروں کے متعلق گفتگو ہوتی، اور رشید بحث کرنے کے بعد آخر میں اپنا فیصلہ سُناتا

"یہ سب لوگ بکواس ہیں ——— ایک دوسرے کی نقل کرتے ہیں۔"

اُس کے نزدیک دُنیا میں آج تک صحیح معنوں میں اچھا ادیب کوئی پیدا ہی نہیں ہُوا تھا۔ کھیلوں میں ٹامس ٹیک بازبادلر تھا، اور ہٹن گھٹیا بیٹس مین ——— دراصل وہ ہر مشہور آدمی کی شہرت کو لوگوں کی کم علمی پر محمول کرتا تھا۔ اُس کا خیال تھا کہ اگر وہ خود کسی بھی شعبے میں کچھ کرے تو بات بن سکتی ہے۔

ایک رات جب وہ تینوں سونے کے لیے بستروں پر لیٹے تو جانے کس طرح کسی

کی شاعری زیرِ بحث آگئی۔ رشید کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ اُس نے کروٹ بدل کر آخری فیصلہ دیا۔

"تم لوگ خواہ مخواہ کسی کی تعریف کرنا اپنا فرض سمجھ لیتے ہو ——— اور مسٹر نسیم تم بھی جو شعر کہتے ہو سراسر بکواس ہوتے ہیں ——— تمہاری تازہ غزل جو تم نے کل کہی ہے مَیں نے اس وقت پڑھی تھی جب مَیں میٹرک میں تھا ———"

نسیم راکھ ہو گیا، اور اس رات نوبت یہاں تک پہنچی کہ اس نے رشید کو گریبان سے پکڑ لیا لیکن جلیل نے دونوں کو چھڑا دیا۔ نسیم بہت دیر تک آسمان پر ٹکٹکی لگائے رشید کے متعلق سوچتا رہا۔ پھر اُس نے بڑی ہمدردی سے رشید کو بلایا۔ وہ بھی ابھی تک نہیں سویا تھا۔ اس نے کہا۔

"رشید ——— تم کیوں نہیں کچھ لکھنے کی کوشش کرتے۔ خدا قسم اتنے ذہین ہو کہ بعض وقت گفتگو میں بھی اُونچی بات کہہ جاتے ہو ——— تم بہت اچھے ادیب بن سکتے ہو۔"

رشید نے روکھے پن سے جواب دیا ——— "مَیں جانتا ہوں۔"

اس رات جب وہ سویا تو اس کی آنکھوں میں بہت سے کاغذ قلم اور کتابیں سما گئیں، اور اس نے دیکھا کہ اس انبار کے نیچے تمام دُنیا کے افسانہ نگار، فلسفی اور نقاد دبے ہوئے ہیں۔ لیکن خدا معلوم ان لوگوں میں اس کا باپ بھی کیوں تھا۔

رشید افسانے لکھنے لگا۔

نسیم اور جلیل اُس کے افسانے پڑھ کر اس کے سامنے بہت تعریف کرتے تھے اور پیٹھ پیچھے ہنستے تھے۔ جب رسالے کے مدیروں نے یہ نوٹ لکھ لکھ کر افسانے واپس کرنے شروع کیے کہ افسانہ اچھا نہیں اور لکھیے، تو رشید کو بہت غصہ آیا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان کے دفتر جلا کر راکھ کر دے۔ ان کے رسالوں کے ڈیکلیریشن ضبط کرا دے۔

جب یہ سوچ کر بھی وہ مطمئن نہ ہوا کہ ایڈیٹر لوگ ناسمجھ ہیں تو اس نے نسیم سے ساری

بات کہی۔

نسیم نے کہا کہ جب تک وہ کسی سے محبت نہیں کرے گا، اُس کی تخلیقات میں وہ چیز مفقود رہے گی جو کہ ہونا چاہیے۔ خلیل نے نسیم کی بائیں آنکھ کے کونے کی حرکت سمجھ کر ہاں میں ہاں ملائی اور کہا کہ محبت ضرور کرو ـــــ عوام سے ـــــ جانوروں سے، یا کسی لڑکی سے ـــــ اور رشید نے سوچا۔

"عوام سے کس طرح محبت کروں، جن میں ایڈیٹروں کی قوم بھی شامل ہے۔ جو اس کی تخلیقات کو نہیں سمجھ پاتے۔"

"جانوروں سے ـــــ؟ لیکن وہ تو ہوتے ہی جانور ہیں۔"

"تو پھر کسی لڑکی سے محبت کروں؟ لیکن سنا ہے محبت تو ہو جاتی ہے ـــــ دراصل یہ ہونے والی بات بالکل بکواس ہے۔ اگر محبت کرو گے تو ہوگی، ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ ـــــ کسی چیز کو کچھ نہ کیا جائے اور وہ ہو جائے۔"

اس کو فوراً مس ہلری کا خیال آیا۔ جو اس کے دفتر میں مینیجر کی ٹائپسٹ تھی ـــــ اُس کی شربتِ بنفشہ ایسی براؤن آنکھیں، ہائیڈروجن پر آکسائیڈ زدہ سنہرے بال، گُلِ داؤدی کی پنکھڑیوں ایسے پتلے ہونٹ اور ہلکا گلابی چہرہ اس کی آنکھوں میں گھوم گیا۔ وہ مس ہلری جس کی پنڈلیوں کو نسیم سوڈے کی بند بوتلوں سے تشبیہہ دیا کرتا تھا۔ ـــــ وہ سردیوں کے سورج کی دھوپ تھی۔ اور گرمیوں کے چاند کی چاندنی جس سے دفتر کے لوگ دُور ہی سے لطف اٹھایا کرتے تھے۔

دوسری صبح جب وہ دفتر گیا تو کسی کام کے بہانے مینیجر کے کمرے میں آیا، اور اس سے گفتگو کرنے کے بعد جب وہ مس ہلری کے قریب سے گزرا تو اس کے ہونٹ ہلے ـــــ "گڈ مارننگ۔"

اور گلِ داؤدی کی پنکھڑیاں مسکرانے لگیں۔

اس تمام دن اس کے رجسٹروں اور فائیلوں پر گل داؤدی کی دو پتیاں مسکراہٹ سے لرزتی رہیں، اور پھر حسین ہلری کا چہرہ ابھرتا رہا۔ اس نے آج تک رقمیں لکھنے میں غلطی نہیں کی تھی لیکن اس دن ہر ہندسہ کئی بار مٹا۔ وہ مینجر کے کمرے میں بہت کم جاتا تھا کیونکہ اس کا کام ہی ایسا تھا۔ لیکن اس دن وہ کئی بار جلیل کی فائلیں لے کر اس کے پاس گیا۔ اور مینجر کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ جلیل کی ٹانگ میں درد ہے۔ ہر دفعہ جب بھی اس کے کمرے میں جاتا تو مس ہلری سے کوئی نہ کوئی بات ضرور کرتا۔ کوئی ایسی بات جس کا جواب مس ہلری کو دینا پڑتا۔

جب سے اس نے افسانے لکھنے شروع کیے تھے، اُس نے کافی ہاؤس جانا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہاں کے باسی اس کے نزدیک کافی ہاؤس کے بیرے تھے۔ جنھیں یہ بھی علم نہیں تھا کہ علامہ اقبال اور وارث شاہ سے بھی بڑھ کر ایک شخصیت رشید احمد ہے۔ اور جو اسے ایک پیالی کافی یا ایک پلیٹ شامی کباب سے زیادہ کچھ نہ سمجھتے تھے۔ لیکن اس شام جب وہ تینوں مال روڈ کی سیر کر رہے تھے تو وہ ان دونوں کے ساتھ کافی ہاؤس بھی گیا۔ اور چمچ سے بجتی ہوئی خالی پیالی ایک مرتبہ پھر جلترنگ میں دب کر رہ گئی لیکن اس نے کوئی پرواہ نہ کی۔ کیوں کہ اسے مس ہلری سے محبت ہو گئی تھی۔

جب وہ کافی ہاؤس سے باہر نکلے تو روشنی میں نہاتی ہوئی سڑک پر مینجر کی کار گزری جو بائیں ہاتھ مڑنے کے بعد کمرشل بلڈنگ میں ایک دوکان کے سامنے جا کر رک گئی۔ مینجر کے ساتھ کار سے کوئی عورت نکلی —— وہ عورت نہیں مس ہلری تھی۔ اس کو مینجر کے ساتھ دیکھ کر رشید کی آنکھوں میں خون اُتر آیا لیکن نسیم نے اُسے تسلّی دی کہ —— بوڑھا آدمی ہے، کوئی بات نہیں —— بیٹی سمجھ کر شاپنگ کے لیے لایا ہے۔

اس رات بے شمار خواب اس کی آنکھوں میں سما گئے۔ لیکن صبح تک صرف ایک خواب اُسے یاد رہا کہ سورج نکلا ہوا ہے اور وہ بستر پر لیٹا ہے۔ اس کے ارد گرد

بے شمار کتابیں بکھری پڑی ہیں جن پر اس کا نام لکھا ہے۔ اور مس ہلری چاند کی ایک پہاڑی پر اُردو کی ٹائپ مشین لیے ٹائپ کر رہی ہے۔

ایک ہفتے کے بعد رشید نے اپنے دوستوں کو بتایا کہ مس ہلری اس کے ساتھ سینما جا رہی ہے۔ وہ بینجر کے ساتھ آئندہ کہیں نہیں جائے گی کیوں کہ وہ خود اسے شاپنگ کے لیے لے جایا کرے گا۔ مس ہلری کا ٹائم ٹیبل کچھ ایسا تھا کہ اُس کا بوس بھی خوش تھا اور رشید بھی۔ وہ اکثر اسے ریستوران میں لے جاتا جہاں وہ دونوں محبت کی باتیں کرتے۔ زیادہ عرصہ رشید بولتا۔ اس کی باتوں کا لبِ لباب یہ ہوتا کہ وہ ملک کا سب سے بڑا ادیب ہے اور مس ہلری اس کی آئیڈیل ہے جو اسے انسپریشن دیتی ہے۔ اور مس ہلری کی باتوں کا ماحصل یہ ہوتا کہ کاش وہ انگریزی میں کہانیاں لکھتا جنھیں پڑھ کر وہ بھی محظوظ ہوتی۔ اگر رشید کے لیے انگریزی میں عشق کرنا بڑی تکلیف دہ بات تھی لیکن پھر بھی وہ رٹے ہوئے انگریزی جملوں اور محاوروں کے بل بوتے پر عشق کر رہا تھا۔ یہ بات الگ ہے کہ جب وہ انگریزی میں باتیں کرتا تو یوں محسوس ہوتا جیسے رانجھا جیولیٹ کے پاس بیٹھا ریوڑیاں چبا رہا ہے۔

اپنے افسانوں میں جس چیز کو پیدا کرنے کے لیے وہ ہلری پر عاشق ہوا وہ تو نہ پیدا ہوئی۔ البتہ وہ روز بروز مس ہلری کے متعلق سنجیدہ ہوتا گیا۔ ایڈیٹر اب بھی اس کے افسانے ناقابلِ اشاعت قرار دے کر لوٹا دیتے تھے۔ پھر یہ سوچ کر کہ ان کے دماغ میں سیاہی بھری ہے اور جلیل کی شہ پر اُس نے اپنے افسانوں کا مجموعہ شائع کرانے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے جمع کیے ہوئے کچھ پیسے تو مس ہلری چاٹ گئی تھی، اور باقی ماندہ کتاب کی اشاعت ہضم کر گئی۔ ایک مہینے کے بعد جب وہ مختلف بک سٹالوں پر کتاب کی حالت پوچھنے گیا، تو سب نے یہی مشورہ دیا کہ کتاب تو بکے گی نہیں بہتر ہے کہ ردی میں بیچ دی جائے۔

وہ اپنے دل میں دنیا جہاں کی مایوسیاں سمیٹے لوٹ رہا تھا کہ راستے میں مس ہلری بینجر کے

ساتھ کار میں جاتی ہوئی دکھائی دی۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ کار فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئی۔ لیکن وہ کچھ نہ کر سکا۔ اگلے روز وہ مس ہلری سے ملا۔ اس سے پیشتر کہ وہ اس سے شکوہ کرتا۔ مس ہلری اس پر برس پڑی۔

"رشید احمد ——— تم بالکل بکواس کرتے ہو کہ اس ملک کے لوگ تم پر جان دیتے ہیں، اور تم بہت مشہور آدمی ہو ——— تمہیں تو کافی ہاؤس کے بیرے تک نہیں جانتے۔ مجھے کل تم سے ضروری کام تھا لیکن تم نہ ملے تو میں کافی ہاؤس گئی تھی ——— میں جانتی ہوں سب ادیب وہاں جاتے ہیں ——— تم جھوٹے ہو ——— فراڈ ہو ——— میں تم سے محبت نہیں کر سکتی۔ میں دوستوؤسکی کی اینا بننا چاہتی ہوں ——— "

اس طرح مس ہلری نے رشید سے اپنا پیچھا چھڑا لیا۔ رشید مینیجر کے کمرے کے دروازوں میں لگے پردوں کی آڑ میں چھپا مس ہلری کو دیکھ لیتا۔ جلیل نے اس سے علیحدگی کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا۔

"وہ میرے قابل نہیں تھی۔"

"کوئی اور عشق لڑاؤ۔"

"عشق بھی کوئی بٹیر ہے کہ لڑاؤں۔ اگر ہوتا تو بھی میری توہین تھی ——— میں رشید احمد ہوں۔"

رشید مس ہلری کی بے وفائی کے باعث بہت اداس رہنے لگا۔ سارا سارا دن اس کے ذہن میں کوئی سوئیاں سی چبھوتا رہتا ——— مس ہلری اُسے جھوٹا سمجھتی ہے ——— فراڈ تصور کرتی ہے ——— لیکن اس کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا ——— وہ گمنام نہیں مرے گا ——— وہ یقیناً کسی دن بہت مشہور ہو جائے گا ——— اور پھر مس ہلری اس کے قدموں میں آ گرے گی اور کہے گی ——— "میرے دوستوؤسکی میں تمہاری اینا ہوں۔" ——— لیکن کب ——— ؟ میں اس کے بغیر زندہ نہیں

رہ سکتا۔

ان دنوں اچانک حکومت کو کوئی بین الاقوامی مسئلہ پیش آگیا۔ ملک کے حاکم کی شخصیت ساری دنیا کی نگاہوں کا مرکز تھی، حاکم کی تو یہی کوشش تھی کہ مسئلہ جلد از جلد حل ہو جائے مگر جانے کیا چیز روڑے اٹکا رہی تھی۔ حالانکہ عوام کی رائے حاکم کے حق میں تھی لیکن خدا معلوم رشید کا دماغ کس چیز سے بنا تھا کہ وہ حاکم کو دنیا کا سب سے بڑا غدار سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک حاکم جو قدم بھی اٹھاتا تھا غلط اٹھاتا تھا۔ وہ چیخ چیخ کر کہتا کہ عوام اندھے ہیں ——— میں جو کہتا ہوں اس پر عمل کرو۔ مسئلہ فوراً طے ہو جائے گا۔ لیکن اس کے دوستوں کا خیال تھا کہ یا تو وہ پاگل ہو گیا ہے یا رائے عامہ کا مخالف ہو کر اہمیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جلیل اُسے بہت سمجھاتا۔

"سالے ایسی باتیں نہ کیا کر، پولیس اندر لے جائے گی۔"

لیکن رشید کے کان بند ہو چکے تھے۔ وہ اکیلے میں اکثر سوچتا ——— "لوگ میری باتوں کو کیوں نہیں سمجھتے ——— کاش میں بااختیار ہوتا، تو مسئلے کو چٹکیوں میں حل کر دیتا۔"

ایک دن نسیم نے تنگ آکر کہا ——— "تو تم کیوں نہیں حکومت سنبھال لیتے۔"

اس نے سوچا کہ نسیم صحیح کہتا ہے۔ وقت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ حاکم بن جائے اور عوام کو تباہی سے بچائے ——— وہ ہر وقت حاکم بننے کی ترکیبیں سوچتا رہتا۔ اور جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو بے بسی سے دیوار میں ٹکریں لگاتا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت انتشار رہتا۔ اور وہ تصور میں دیکھتا کہ مسکراہٹ کے ساتھ وہ اپنے محل کی بالکنی میں کھڑا لوگوں کی تالیاں اور مسکراہٹیں وصول کر رہا ہے۔

پھر ایک روز اخباروں میں خبر چھپی کہ حاکم اس کے شہر میں لوگوں سے خطاب کرنے کے لیے آرہا ہے۔ اس نے حاکم کو کیڈی لاک میں بیٹھے دیکھا جو ہاتھ کے اشارے سے لوگوں کے نعروں کا جواب دیتا ہوا جا رہا تھا۔ رشید کا دل ڈوب گیا۔ اس نے

جاتے وقت بڑے غصے میں لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے آہستہ سے کہا۔

"بیوقوف"

پنڈال میں دو ڈھائی لاکھ کا مجمع تھا۔ حاکم تقریر کرنے کے لیے اُٹھا۔ اُس نے ابھی دو لفظ ہی کہے تھے کہ رشید نے اٹھ کر چیختے ہوئے کہا ——

"یہ غدار ہے —— ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔" یہ کہہ کر اس نے گولی کی سی تیزی سے اپنی جیب سے جلیل کا پستول نکالا اور —— اور لوگوں نے دیکھا کہ ان کا محبوب راہ نما دیمک خوردہ ستون کے مانند گر پڑا ہے۔

رشید نے کہا۔ "مجھے حاکم ......"

پھر اسے پتہ نہ چلا کہ کیا ہوا۔

جب عجیب و غریب سی روشنی میں اس کی آنکھیں کھلیں تو اُس نے دیکھا کہ وہ سفید لٹھے کی چادر میں لپٹا ایک بند کوٹھری میں پڑا ہے۔ ایک شخص میز پر بیٹھا رجسٹر پر کچھ لکھ رہا ہے۔ اتنے میں ایک اور آدمی جو اُس کا جڑواں بھائی معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھ میں اخباروں کا پلندہ لیے آیا۔ پہلے نے دوسرے سے اخبار لے کر دیکھتے ہوئے کہا۔

—— "او ہو آج کے اخبار تو ہمارے اسی مہمان کی تصویروں سے بھرے پڑے ہیں"

یہ سُنتے ہی رشید نے لپک کر اس سے تمام اخبار چھین لیے۔ اور اُنھیں سینے کے ساتھ لگاتے ہوئے چیخ کر کہا ——

میں نے اپنی منزل کو پا لیا ہے —— تمام دُنیا مجھے جان گئی ہے ——

"رشید احمد دی گریٹ مین" —— ابا جان آپ کے بیٹے کا نام دُنیا بھر کی تاریخوں میں لکھا جائے گا —— مس ہلری —— اب تو مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ گی —— تم کہاں ہو ڈارلنگ؟"

ایک بھائی دوسرے سے ہنس کر مخاطب ہوا۔ "کم بخت نہیں جانتا کہ مر چکا ہے۔"

رشید نے فوراً کہا ——— "میں تو اب پیدا ہوا ہوں یارو ——— میں نے تو اب جنم لیا ہے۔"

یہ کہہ کر اس نے فلک شگاف قہقہہ لگایا، مگر قبر شق نہ ہوئی۔

ہتک

بدرے نے چاروں طرف دیکھا، گلی میں سبھی لوگ چارپائیوں پر مُردوں کی طرح سو رہے تھے۔ سوائے کتوں کے ایک جوڑے کے اور کوئی زندہ نہ تھا۔ بجلی کے کھمبے کے مُنہ سے بہتی ہوئی روشنی اس کھڑکی والی دیوار تک پہنچ کر خشک ہو جاتی تھی۔ ایک نے دوسرے کُتّے کے کان میں سرگوشی کی اور دونوں بدرے کے وجود سے بے نیاز روشنی کے تاریک کناروں میں اُتر گئے۔ بدرے نے اپنے جسم سے اُبھرتے ہوئے تازہ پسینے سے دِل کی آگ بجھانے کی کوشش کرتے ہوئے اس کھڑکی کو ذرا سا دبایا —— کھڑکی بند تھی اس پٹ میں ایک چھوٹے سے روزن میں آنکھ جما کر سرگوشی کی —— "شیدو"

کمرے میں صرف لالٹین کی لَو سو رہی تھی۔ بدرے کو بہت غصّہ آیا کہ اتنی منّتوں کے باوجود شیدو کا منجمد دِل پگھلا نہیں۔ اس نے ہاتھ پر بہت جبر کر کے دروازہ کھٹکھٹایا——

"شیدو!" کھٹ کھٹ کھٹ۔

لالٹین کی نیند میں ڈوبی روشنی میں ایک سایہ بڑی تیزی سے دیوار پہ کانپا اور چوڑیوں

کی گھٹی ہوئی جھنکار بند کھڑکی میں اُلجھ گئی۔

"شیدو ——"

"کیا بات ہے؟" شیدو کی آواز روزن سے دبے پاؤں نکلی۔

بدرے کا جی چاہا کہ کھڑکی اکھاڑ کر پھینک دے اور شیدو کی کلائیوں میں ہلکی ہلکی کھنکتی ہوئی چوڑیوں کا گلا گھونٹ کر کہے —— یہ بات ہے لیکن اس کے جسم پر تازہ پسینہ پھر جم گیا اور اس نے اپنی اس خواہش کی گردن دباتے ہوئے سوچا، شیدو! اب میں کیا بتاؤں کہ کیا بات ہے۔

"میں چلی ہوں —— کاکا جاگ جائے گا۔"

اسے معلوم تھا کہ شیدو جھوٹ بول رہی ہے۔ کاکا اور دوسرے سب چھت پر سو رہے ہیں اور وہ حسبِ معمول تنہا نیچے صحن میں۔ بدرے نے بڑی مشکل سے اپنے صحت مند جسم کی تمام قوّت جمع کرتے ہوئے بند کھڑکی سے کہا —— "شیدو! اب مجھ سے اور صبر نہیں ہو سکتا۔"

"کس معاملے میں؟"

بدرے کا خیال نہیں تھا کہ شیدو کی سمجھ میں اتنی معمولی سی بات بھی نہیں آئے گی۔ وہ کچھ بوکھلا سا گیا جب شیدو نے پھر کہا —— "بتاؤ نا!" تو اس نے پردہ پوش عورت کی طرح جو کسی کے مجبور کرنے پر پہلی مرتبہ برقع اتار کے باہر نکلتی ہے، شرما کر کہا —— "منگنی ہوئے اتنے مہینے ہو گئے ہیں —— تمہارے ماں باپ سے ابھی تک تمہارا داج نہیں بنا ——؟"

یہ کہہ کر وہ یوں سر جھکا کر کھڑا ہو گیا جیسے شیدو کے باپ نے اسے چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔ شیدو نے کچھ نہ کہا —— "شیدو"

خاموشی۔

"شیدو" اس نے یک دم روزن سے آنکھ لگا دی ــــ لالٹین کی لو لالٹین کے منہ سے اتر چکی تھی، کمرے میں تاریکی تھی اور شیدو وہاں نہیں تھی ــــ "مرجانی۔ شیدو کی بچی ــــ کوڑھا ہو کے مروں اگر دوبارہ تم سے ملوں۔"

اس نے روہانسا ہو کر پاس ہی زمین پر رکھی ہوئی ٹھر پاس سے چاک باز نکالی جو وہ بڑے ارمانوں سے شیدو کے لیے لایا تھا۔ جانے وہ کتوں کا جوڑا اتنی جلد تاریک کناروں سے پھر روشنی کے دریا میں کیوں آ گیا تھا۔ اس نے بڑے غصے میں وہ چاک بار انہیں مار دی۔ ان میں سے ایک چیاؤں چیاؤں کرتا ہوا بھاگ گیا ــــ بدرے کا ذہن اور بھی چیاؤں چیاؤں کرنے لگا ــــ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے ــــ جب سے اس کی شیدو سے منگنی ہوئی تھی تب سے وہ اسی طرح بوکھلایا ہوا پھر رہا تھا ــــ اسی دن سے بدرے کے جذبات شیدو کے گھونگھٹ کی منہ بند کیتلی میں قید ہو کر رہ گئے تھے۔ جب دل کی آگ جذبات کو بھاپ بنا دیتی تو اس وقت تک دیکھتا رہتا جب تک کہ شیدو گھڑا لے کر آتی۔ اس کے چہرے پر گھونگھٹ کی دیوار اور بھی پختہ ہو جاتی۔ بدرے نے اس سے کئی مرتبہ کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن وہ اپنا گھڑا وہاں رکھ کر بغیر کچھ سنے تیز ہوا کی طرح ساتھ ہی گوجروں کے ویہڑے میں چلی جاتی۔ اور بدرا اس دن کو کوستا ہوا لوٹ آتا جب اس کی منگنی ہوئی تھی۔

اسے کئی مرتبہ خیال آیا تھا کہ کہیں شیدو کا دل اس سے بھر نہ گیا ہو، کہیں وہ اس سے اکتا نہ گئی ہو۔ لیکن جب اس کو منگنی سے پہلے کے دنوں کا خیال آتا جب رات کو گھڑیال کی بارھویں ٹسر پر اس کا قدم کھڑکی سے اندر ہوتا۔ وہ ایک سیکنڈ بھی لیٹ نہ ہوتا، کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیدو بے حد بے قرار ہو جائے گی اور پھر اس سے لاتعداد مرتبہ شکوہ کرے گی۔ اس زمانے میں تو اسے سب کے ساتھ چھت پر سوتے ہوئے ہول آتا تھا، اور وہ نیچے صحن میں تنہا ہی سوتی تھی اور سردیوں میں اُسے کاکے کے خراٹوں سے بے پناہ نفرت تھی اور

وہ اس کمرے میں تنہا ہی سوتی تھی ـــــ اور وہ دونوں شیدو کی ماں کے تہجد پڑھنے کے لیے اٹھنے تک (ایک چارپائی کی پائنتی اور دوسرا سرہانے کی طرف بیٹھے) باتیں کرتے رہتے، یا صرف ایک دوسرے کو دیکھتے ہی رہتے ـــــ بدرے کو چارپائی کی لمبائی کا یہ فاصلہ کم کرنے کی کبھی ضرورت پیش نہ آئی تھی۔ لیکن پچھلے چند دنوں سے اس کا جی چاہتا تھا کہ دھواں بن کر شیدو کے کمرے کے کونے کونے میں رچ جائے ـــــ لیکن اب جب کہ شیدو اتنی بے رُخی سے پیش آرہی تھی اور آج اس نے اس کے احساس پر اتنا کاری زخم لگایا تھا اس کا جی چاہا کہ آگ کی لپیٹ بن کر ساری دُنیا کو چاٹ جائے ـــــ

جب وہ کھڑکا کیے بغیر اپنے سوئے ہُوئے باپ کی نیند کی حفاظت میں آکے اپنی چارپائی پر لیٹا تو اپنے احساس پر شیدو کا لگایا ہوا زخم دھیرے دھیرے پھیلنے لگا۔ بدرا گھبرا کے اُٹھ بیٹھا، وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کا سارا جسم اس زخم کی لپیٹ میں آجائے ـــــ آخر اس شیدو کی بچّی کو ہو کیا گیا ہے ـــــ وہ یقیناً مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتی ہے۔ لیکن بچپن کی گلی میں کھیلتا کھیلتا کھڑکی کی اوٹ میں جوان ہوتا ہُوا پیار اس طرح مدھم ہو سکتا ہے ـــــ ؟ اگر ہو سکتا ہے تو بے شک ہو، مجھے کیا پڑی ہے کہ مَیں تنہا اس پیار کی حفاظت کروں ـــــ شیدو یقیناً اس طرح مجھ سے بے رُخی برت کے مجھ سے پیچھا چھُڑانا چاہتی ہے ـــــ تو جائے بھاڑ میں ـــــ مَیں کون سی پروا کرتا ہُوں ـــــ مَیں بھی تو اسی لیے اس سے ملنا چاہتا تھا کہ بعد میں کوئی مجھ سے میرے پیار کے کچے پن کا شکوہ نہ کرے ـــــ تب وہ کس طرح نرگس بی بی کی باتوں سے جلتی تھی ـــــ اسے کیا خبر کہ نرگس بی بی مجھے ان نگاہوں سے دیکھتی ہے کہ آج تک اس نے بھی نہ دیکھا تھا ـــــ نرگس بی بی ـــــ! تم کتنی اچھی ہو ـــــ کتنی ہمدرد ـــــ شیدو کی بچّی، جاؤ جہنّم میں ـــــ اگر مجھ سے اُکتا گئی ہو اور مجھ سے ملنا نہیں چاہتی تو مَیں کون سی پروا کرتا ہُوں ـــــ جب مَیں نرگس بی بی کی کوٹھی میں نوکر ہو جاؤں گا تو خود ہی پچھتاؤ گی ـــــ اگر تم نے مجھ سے آج چاک بات نہیں

لی تو نہ سہی ——— میں کل نرگس بی بی کو دو چاک باریں مفت کھلاؤں گا ——— اگر تم نے کسی اور سے آنکھ لڑائی ہو تو میں ....

اُس نے مسکراتے ہوئے اپنے سرہانے کے نیچے سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکالے اور کھرے میں بیٹھ کر آہستہ آہستہ دانت مانجھتا ہوا مسکرا مسکرا کے جانے کیا سوچنے لگا ———

وہ ٹوتھ پیسٹ اور برش جو نرگس بی بی نے اسے پرسوں ہی دیئے تھے ——— وہ نرگس بی بی جو بھری دُنیا میں تنہا اُسے بدر کہتی تھی۔

نرگس بی بی کے کالج کی دیوار کے ساتھ ایک چھوٹی سی کھال بہتی تھی جسے سب ندی کہتے تھے اور جس کے کنارے لگے ہوئے شیشم، یوکلپٹس اور کیلے کے درختوں کی چھاؤں میں کالج گیٹ سے کافی ہٹ کر چند ایک ان کاروں کے ڈرائیور اپنی بیبیوں کے لوٹنے کے انتظار میں تمباکو نوشی کرتے ہوئے اپنے اپنے مالکوں کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے، جن کی کلاسیں جلد ہی ختم ہو جاتی تھیں۔ کالج کی حدود سے ایک ایک فرلانگ تک کسی خوانچے والے کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔ کیونکہ کالج ٹک شاپ میں املی سے لے کر چاٹ ہر چیز ملتی تھی۔ بدرے کو اندر رکیلوں کے سائے میں آنے کی اس لیے اجازت تھی کہ ٹک شاپ میں آئس کریم نہیں ملتی تھی اور کالج کی پرنسپل نے لڑکیوں کی ضد پر لے بی ڈیلائٹ آئس کریم" والوں سے کہا تو انھوں نے بدرے کو بھیج دیا۔ لے بی ڈیلائٹ" کے مینجر کے ہاں کوئی بوڑھا آدمی ملازم نہیں تھا اور بدرے کے متعلق اسے پتا تھا کہ وہ بہت شریف آدمی ہے، اور لڑکیوں کے ذکر سے بالکل لڑکیوں کی طرح شرما جاتا ہے ——— بدرے نے مینجر سے بڑی منت سماجت کی کہ وہ کسی اور کو بھیج دے، لیکن اس انکار سے اس پر مینجر کا اعتماد اور بھی پختہ ہو گیا۔

جب وہ پرنسپل کے سامنے پیش ہوا تو کالج کے تمام بوڑھے نوکر اور چپڑاسی اس کی نگاہوں میں گھوم گئے۔ وہ بدرے کے خوبصورت ڈیل ڈول سے گھبرا گئی۔

لیکن بدرے سے چند منٹ کی گفتگو سے اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ایسی ویسی حرکت نہیں کرے گا۔

اس انٹرویو کے بعد وہ ماتھے سے پسینہ پونچھتا کچھ سوچتا ہُوا باہر آ گیا ـــــ اس نے شیدو سے لڑکیوں کے کالج کی نوکری کا ذکر کیا تھا تو شیدو نے بڑے عجیب انداز سے کہا تھا ـــــ "راجہ اندر بنو گے وہاں تو ـــــ" بدرے کو اس جملے کا ایک ایک لفظ زہر میں بجھا محسوس ہُوا تھا ـــــ "اگر تم نہیں چاہتیں تو مَیں انکار کر دوں گا ـــــ وہ مجھے نوکری سے نکال دے گا اور پھر منگنی دُور جا پڑے گی۔" جانے شیدو اس بات سے قائل ہُوئی تھی یا نہیں، لیکن اس نے کمائی میں اضافے کی دُعائیں دیتے ہُوئے اسے صرف ذرا احتیاط برتنے کے لیے کہا تھا۔ اور بدرے نے سینہ پُھلا کر اسے اپنے بدرے ہونے کا یقین دلایا تھا۔

"میرا نام بدرا ہے بدرا ـــــ اور مَیں صرف تمہارا ہُوں۔"

پھر اس نے پرنسپل کو کچھ ایسے جواب دینے چاہے تھے کہ وہ اُسے نہ رکھے مگر وہ اپنی اسکیم میں کامیاب نہ ہو سکا۔ شاید اس لیے کہ اس طرح اس کی خود اعتمادی کا جذبہ مجروح ہوتا تھا۔ سارا دِن اتنی ساری لڑکیوں میں رہ کر وہ شیدو پر ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ راجہ اندر نہیں بدرا ہے ـــــ اُس کا بدرا۔

وہ کالج کی لڑکیوں سے اپنے برتاؤ اور رویّے کے متعلق سوچتا۔ آہستہ آہستہ آئس کریم گاڑی دھکیلتا نہری کے کنارے آ گیا اور یوکلپٹس اور کیلوں کے سائے میں ڈرائیوروں کے کنبے میں ایک اور فرد کا اضافہ ہو گیا۔

کالج بند ہوتے پر جب اُس نے ریڑھی کا ڈھکنا اُٹھا کر دیکھا تو اُس نے خدا کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا کہ اُسے یہ نوکری نصیب ہُوئی۔ کہاں تو سارا سارا دِن شہر کی خاک چھاننے کے بعد کچھ رقم ملتی تھی اور اب گرمیوں کے موسم میں دیکھتے ہی دیکھتے ریڑھی خالی ہو گئی تھی ـــــ اور اس کے نزدیک یہ سب شیدو کی دُعاؤں کا نتیجہ تھا۔

رات کو چونکہ اس کی ساری آئس کریم ختم ہو چکی تھی اس لیے اس نے کسی دوسرے

آئس کریم والے سے اپنی شیدو کے لیے چاک بار خریدی اور حسبِ معمول بھرماس لے کر آدھی رات کو اس سے ملنے گیا۔ شیدو نے بڑی بے صبری سے اس سے سارے دن کا احوال پوچھا۔ اور اسے یقین ہو گیا کہ بدرے کی آنکھیں خوبصورت اور اونچے گھرانوں کے رنگین کپڑوں سے نہیں چندھائیں گی ـــ اور اگر کبھی وہ اندھا بھی ہو گیا تو کہاں ایک آئس کریم والا اور کہاں کاروں والے ـــ پھر اس نے احتیاطاً بدرے سے کہہ دیا کہ اگر اس نے شیدو کو لمحہ بھر کے لیے بھی اپنے دل سے علیٰحدہ کیا تو خدا اُسے کبھی نہ بخشے گا۔

بدرا کالج میں ڈرائیوروں سے ہٹ کر اپنے فارغ وقت میں بوریئے پر لیٹ کر یا تو ذہن کے آئس بکس سے شیدو کی باتیں نکال کر سنتا اور پھر ان میں مستقبل کے پروگراموں کو جمع کر کے پھر ذہن کے آئس بکس میں رکھ دیتا اور یا پھر اس ندی کنارے بیٹھ کر قصہ سیف الملوک یا یوسف زلیخا پڑھنے لگتا ـــ اُسے ڈرائیوروں کی گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کیونکہ وہ نہیں جانتا تھا کہ کلب کسے کہتے ہیں، فلاش کیا ہوتی ہے اور بال رُوم کس کمرے کے ناچ کا نام ہے۔ کبھی کبھی اس کے مکان میں کسی کے مالک کی شرافت اور پرہیزگاری کے متعلق بھی آواز آتی، لیکن وہ ان سب باتوں کو گوش انداز کر دیتا ـــ اس کے نزدیک سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ کوئی اپنی شیدو کو لمحہ بھر کے لیے اپنے دل سے علیٰحدہ کر دے۔ اور سب سے بُرا عذاب یہ تھا کہ خدا کسی کو کبھی نہ بخشے۔

اس کے لیے سبھی لڑکیاں ایک سی تھیں۔ سب کی سب شیدو سے کم، بہت کم خوبصورت۔ ہر لڑکی کو صرف لمحہ بھر دیکھ کر نظریں جھکا لیتا اور اس کے بعد اپنی شیدو سے مقابلہ کرنے لگتا سوائے لباس کے شیدو کی ہر چیز ان سے اچھی تھی (جو کہ کوئی بھی اچھائی نہیں تھی کیونکہ اس کا دل کے ساتھ کوئی تعلق نہ تھا)۔ اسے دو ایک بار یہ احساس بڑی شدت سے ہُوا تھا کہ شیدو کا ان لڑکیوں سے مقابلہ کرنا اچھی بات نہیں۔ مگر پھر بھی وہ اپنے خیالات کو شیدو کی زنجیر نہ پہنا سکا۔ پھر یہ سوچ کر کہ آخر میں حرج ہی کیا ہے اس کے احساس کی چبھن مٹ گئی۔

وہ ہر لڑکی سے بڑی سنجیدگی سے پیش آتا، اتنی سنجیدگی سے کہ وہ بھی ان کی نگاہوں میں کالج کے بوڑھے نوکروں کے گروہ میں شامل ہو گیا۔ لیکن ان تینوں لڑکیوں کو دیکھ کر روکنے کی کوشش کے باوجود اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی (جس سے وہ اپنے آپ کو تسلی دے لیتا کہ یہ تو تجارتی مسکراہٹ ہے)۔ وہ ان کے سامنے بالکل بے بس ہو جاتا۔ وہ جب بھی اس کے پاس آتیں تو تمام وقت اس کی گاڑی کے تینوں پہیوں کی طرح چرچراتی رہتیں۔ اس سے ہلکے ہلکے مذاق کرتیں۔ بدرا شروع شروع میں تو بہت گھبرایا۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ پرنسپل سے رپورٹ کر دے کہ یہ لڑکیاں اُسے تنگ کرتی ہیں۔ لیکن یہ سوچ کر وہ خود ہی شرمندہ ہو گیا کہ آخر یہ لڑکیاں اُسے کیا ضرر پہنچاتی ہیں۔ لمبی کار والی بے پناہ خوبصورت آنکھوں والی لڑکی "بدرے" کو یہ دیکھ کر تھوڑا سا دکھ ہوا تھا کہ اس کی آنکھیں شیدو سے ذرا اچھی ہیں، جو خود ہی کار ڈرائیو کر کے کالج آتی تھی۔ اپنی لمبی لمبی پلکیں جھکا کر کہتی ——

"بدرے —— !تو بڑا اسمارٹ ہے۔"

بدرا لمبی لمبی پلکوں والی اس بے حد اچھی لڑکی کا بہت احترام کرتا تھا کیونکہ بدرے کے بجائے "بدر" سن کر اُسے بڑی مسرت ہوتی۔

"اسمارٹ کیا ہوتا ہے نرگس بی بی۔؟"

"دلکش ——"

بدر کے گالوں میں خون اُبلنے لگتا۔ وہ کبھی نہ کہہ پاتا کہ ایسی باتیں نہ کیا کریں بی بی ۔ لیکن یہ الفاظ تو آج تک شیدو نے بھی اس سے نہیں کہے تھے۔

"ہائے —— کس طرح شرماتا ہے۔" ایک کہتی ——

"بدرے، تیری مونچھیں بڑی اچھی ہیں۔" دوسری کہتی۔

"بالکل ہیرو وں والی —— بدرا ہیرو۔" پہلی کہتی۔

بدرا کو اپنی تلوار مارکہ مونچھیں تلوار کی نوک کی طرح چبھتی محسوس ہوتیں۔

اس کے بعد وہ ان کی باتوں کا عادی ہو گیا تھا۔ کیونکہ وہ باتوں باتوں میں بہت ساری آئس کریم کھا جاتی تھیں اور اس میں بدرے ہی کا فائدہ تھا۔ جب وہ تینوں چلی جاتیں تو اُسے یُوں محسوس ہوتا جیسے کسی گھاٹی پر اس کے ہاتھوں سے آئس کریم کاڑی چھُوٹ گئی ہو۔ لیکن پھر ذہن کے کسی گوشے سے ایک عجیب سا اطمینان نکل کر اس کے ذہن پر چھا جاتا، اور وہ سر کو ذرا سا جھٹکا کر مونچھوں کو سہلاتا ہُوا اپنے ذہن میں فوراً "قصّہ شیدو بدرا" کھول کر بیٹھ جاتا۔

روز بروز نرگس بی بی اور اس کی دونوں سہیلیاں اس کی زندگی میں بالکل آئس کریم کی طرح جم کر رہ گئیں ـــــ بدرے کو اس چیز کا بالکل احساس نہ ہُوا تھا۔ اگر کبھی روز وہ نہ آتیں یا کالج میں چھٹی ہوتی تو وہ ان کی غیر موجودگی میں اداس بالکل نہ ہوتا۔ بس یہ تھا کہ کھانے کے ساتھ سرکہ یا اچار کی کمی محسوس ہوتی تھی ـــــ

اس کے دن بہت اچھے گزر رہے تھے۔ شیدو کو جب بھی وہ ان لڑکیوں کی باتیں سناتا تو وہ تھوڑی دیر تک ان باتوں سے لُطف اُٹھانے کے بعد اس سے کہتی ـــــ چل چھوڑ اب دفع کر انہیں۔ اور بدرا انھیں دفع کر دیتا۔ وہ اُسے بار بار اپنی محبت کا یقین نہیں دلانا چاہتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ شیدو اس کے جواب میں کیا کہے گی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "اگر تم نے لحہ بھر کے لیے مجھے"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ویسے بھی باتوں باتوں میں جب وہ نرگس بی بی کا ذکر شروع کرتا تو دو لمبی لمبی پلکوں والی آنکھیں اس کے دل میں عجیب سے خلا پیدا کرتی ہُوئی اسے گنگ کر جاتیں اور وہ نرگس بی بی کی کہی ہُوئی کئی باتیں گول کر جاتا ـــــ اور جانے اب وہ کیوں شیدو کے لیے ایک کے بجائے دو چاک باریں لاتا تھا۔

پھر جب ایک رات شیدو کو محسوس ہُوا کہ بدرا اب کالج کی لڑکیوں کا ذکر کچھ زیادہ ہی کرنے لگا ہے تو اس نے کہا ـــــ "بدرے ـــ اب ہم کب تک یُوں چھپ چھپ کر ملتے رہیں گے"

بدرے کو یُوں محسوس ہُوا جیسے وہ نرگس بی بی کی آنکھوں کے بوجھ تلے آگیا ہے ـــــ

نرگس بی بی کی نگاہیں وہ شروع شروع والی نگاہیں نہیں رہی تھیں۔ اب جب بھی کبھی وہ اس کے ذہن میں آتی تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اُس نے کسی چور سے سازش کر کے اپنے ذہن میں سینڈھ لگوائی ہو۔ اسے نرگس بی بی سے کبھی کبھی بہت خوف سا آنے لگتا تھا، اور اس نے کئی بار سوچا تھا کہ وہ یہ نوکری چھوڑ کر بھاگ جائے۔ لیکن پھر اس خیال سے کہ شیدو یقیناً دال میں کچھ کالا سمجھے گی (اور زندگی کی روٹی اچار بغیر کھانی پڑے گی) تو وہ یہ ارادہ ترک کر دیتا۔ پچھلے چند دنوں کی اس الجھن کا حل اسے اب ملا تھا۔

"کیا سوچ رہے ہو بدر — ! میں نے کہا تھا کہ......"

"شیدو — شیدو" بدر کے منہ سے جیسے لاوا اُبلنے لگا "شیدو میں کل ہی اپنے لالا سے کہہ کر منگنی کے لیے تمہارے ہاں بھیجوں گا"

یک دم اُس کے ذہن پر منگنی کا بھوت سا سوار ہو گیا۔ اور دوسرے ہی دن اپنے باپ سے منگنی کی ضد منوالی کہ وہ کل ہی پیغام لے کر جائے گا۔ اگرچہ اس کے باپ نے اُس کو یقین دلایا تھا کہ گھر کا معاملہ ہے، منگنی بیاہ کسی دن بھی ہو جائے گا۔ لیکن خدا معلوم وہ اُن عجیب سی دل میں آگ لگا دینے والی دو آنکھوں کے پاٹوں میں کیوں پسنے لگا تھا۔ اور اُسے یہ احساس کیوں ہو گیا کہ اگر اس کی منگنی جلد ہی نہ ہوئی تو خدا اُسے کبھی نہ بخشے گا — باپ کو اس کی ماننی ہی پڑی —

دوسرے دن جب نرگس بی بی اور اس کی سہیلیاں آئیں تو نرگس بی بی نے اس سے اتنی خوشی کی وجہ پوچھی۔

"کچھ نہیں بی بی —" بدر نے دلہنوں کی طرح شرما کر کہا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ نرگس بی بی اور اس کی دونوں سہیلیوں کو سب کچھ بتا دے۔ مگر اس کی زبان شرم کی زنجیروں سے آزاد نہ ہو سکی۔

"کچھ تو بات ہے؟" نرگس بی بی نے خود ہی گاڑی کا ڈھکنا کھول کر چاک بار نکالتے

ہوئے کہا۔

"نرگس بی بی ——— آپ بہت اچھی ہیں۔"

دونوں سہیلیاں کھلکھلا کر ہنس دیں اور پل بھر کے لیے نرگس بی بی کے دانت آئس کریم میں منجمد ہو کر رہ گئے۔ اس نے اپنے ہونٹوں سے زبان کے ساتھ آئس کریم سمیٹتے ہوئے آہستہ بہت آہستہ جھکی ہوئی پلکیں اُٹھائیں اور برف کی دو ڈلیاں بدرے کے دل میں اُتر کے پگھل گئیں۔ وہ یک دم اتنا گھبرا گیا کہ اُس نے گاڑی سے ایک اور چاک بار نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ دونوں سہیلیاں پھر ہنسیں اور نرگس بی بی نے بہت ہی ہلکی سی مسکراہٹ سے کہا......

"کیوں بدرے ——— میں بہت اچھی کیوں ہوں؟"

بدرا بالکل خالی الذہن ہو گیا ——— واقعی وہ بہت اچھی کیوں ہے ——— اس نے بالکل الوؤں کی طرح کہا ——— "پتا نہیں جی۔"

"بدرے ——— تو بالکل گریک گوڈ ہے۔" نرگس بی بی کچھ اسی قسم کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ بدرے نے یہ سمجھ کر کہ کوئی اچھی بات ہی ہو گی اور گالی نہیں ہو گی۔ جھٹ سے شکریہ کہہ دیا۔

نرگس بی بی نے اپنی سہیلیوں سے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کچھ ایسی نگاہوں سے بدرے کو دیکھا جیسے شید و ——— نہیں، شیدو نے بھی کبھی بدرے کو ایسی نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ بدرے کے لیے یہ نگاہیں بالکل نئی تھیں اسی لیے اس کا ردِ عمل کچھ ایسے ہی ہوا جیسے کوئی بچہ کسی کی گود میں جکڑا روشن انگارے دیکھے۔

"بدرے ہیرو ——— ہفتے ڈیڑھ ہفتے تک کالج میں چھٹیاں ہو جائیں گی۔ تو پھر ہم تم سے آئس کریم کیسے کھائیں گی؟" ایک سہیلی نے پوچھا۔

دوسری نے کہا "ہمارے گھر آ کے دے جایا کرے گا۔"

بدرے نے نہ چاہنے کے باوجود نرگس بی بی کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ اداس سی ہو گئی تھی۔ بدرے نے کہا "آپ فکر نہ کریں نرگس بی بی، آپ تینوں مجھے اپنے پتے دے دیجیے گا میں

آپ کو گھر آئس کریم دے جایا کروں گا۔"

نرگس بی بی اپنی سہیلیوں سمیت مسکرا دی۔

جب وہ گھر گیا تو اس کے لالہ نے اُسے بتایا کہ وہ شیدو کے باپ سے رشتے کی بات پکی کر آیا ہے ـــــ یعنی اس کی منگنی ہو گئی ہے۔ بدرے کا دل خوشی میں سینے کی دیوار سے سر ٹکراتے ہوئے رات کا بڑی شدت سے انتظار کرنے لگا۔

رات کو وہ حسبِ معمول بھر موس میں چاک بار لے کر شیدو کے ہاں گیا لیکن کھڑکی بند تھی۔ وہ کھڑکی کی بتّی پر چاک بار رکھ کے آ گیا تھا۔

اگرچہ اس کے دل کا سب سے بڑا ارمان پورا ہو چکا تھا لیکن اس کی خوشی بجھی بجھی سی تھی۔ نرگس بی بی کو تو وہ بہت ہی اداس نظر آیا۔ اس نے اور اس کی سہیلیوں نے بدرے کو بہت مجبور کیا لیکن اس نے اپنی اداسی کی کوئی وجہ نہ بتائی۔ آدھی چھٹی کے خاتمے کی گھنٹی کے بعد جب سب لڑکیاں جماعت میں چلی گئیں تو نرگس بی بی آئی۔

"اب بتا بدرے ـــــ دیکھ میں تیرے لیے اپنی کلاس مس کر کے آئی ہوں۔"

نرگس بی بی نے کچھ اس انداز سے التجا کی تھی کہ بدرے کے کانوں کی لَویں بھڑکنے لگیں اور گال تمتمانے لگے، اور اس نے قصۂ شیدو بدرا بڑی تفصیل سے اُسے سنا دیا ـــــ نرگس بی بی نے جیسے اپنے خشک آنسوؤں سے خشک گلے کو تر کرتے ہوئے کہا ـــــ "تو پگلے اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے؟

"یونہی نرگس بی بی ـــــ رات ـــــ"

"مبارک ہو بدرے ـــــ" نرگس بی بی نے اس کی پوری بات نہ سنی اور جانے کے لیے مڑی۔

"آپ ناراض ہیں" جانے بدرے نے کیا سوچ کر کہا۔

"نہیں تو ـــــ میں کیوں ناراض ہوں گی ـــــ تمہاری منگنی کا سن کر تو میں بے حد

خوش ہوئی ہوں۔" بدرا اپنی بیوقوفی پر دل ہی دل میں ہنسا کہ واقعی اس میں ناراضی کی کیا بات تھی —— اور پھر نرگس بی بی کی نگاہوں میں وہ عجیب سی چمک بدستور تھی۔

—— رات وہ پھر شیدو سے ملنے گیا —— لیکن ہر رات وہ کھڑکی کی بتی پر چاک بار رکھ کے مایوس ہی لوٹتا رہا۔ پھر وہ شیدو کی کھڑکی سے ٹکریں مارنے کی بجائے انگریزی فلمیں دیکھنے لگا اور کسی حد تک اس کی ذہنی اُلجھن کم ہو گئی۔ لیکن وہ شیدو کے رویّے سے بہت حیران تھا کہ اُسے دیکھتے ہی فوراً گھونگھٹ کاڑھ کر پرچھائیں کی طرح غائب ہو جاتی ہے جیسے وہ اجنبی ہو۔ پھر جب اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تو وہ غصّے میں جھنجھلا جاتا کہ اسے ہو کیا گیا ہے۔ ایک روز اس نے گلی کی نکڑ والے نلکے پر اس سے بات بھی کرنی چاہی تھی لیکن اس نے بڑے غصّے میں کہا تھا —— "بدتمیز" اور آندھی کی طرح گوجروں کے ویہڑے میں چلی گئی تھی۔ بدرا پہلے سے بھی بہت اداس رہنے لگا —— اس کو ہر وقت ایک ہی خیال ستاتا رہتا مبادا شیدو کی آنکھ کسی دوسرے سے —— نہیں ایسا ممکن نہیں۔ اس کی مجھ سے منگنی ہو گئی ہے —— اور پھر گزرے ہوئے اتنے حسین دن اور وعدے —— تو پھر کیوں —— بدرے کے ذہن میں سوالوں کے تاگے اتنے زیادہ اُلجھ جاتے کہ وہ بے بس ہو کر انھیں پھینک دیتا اور کالج میں گزرے ہوئے دن میں خاموشی سے اُتر جاتا۔

نرگس بی بی اب اکثر تنہا آدھی چھٹی کے بعد والی کلاس مِس کر کے آتی۔ اس سے شادی کی تاریخ پوچھتی (بدرا بہت جھنجھلا کر لاعلمی کا اظہار کرتا) اُسے شیدو کے بارے میں تسلّیاں دیتی کہ لڑکیاں منگنی کے بعد اکثر پردہ کرنے لگتی ہیں۔ (لیکن بدرے کو اس دلیل سے چڑ تھی کیونکہ بچپن سے لے کر اب تک کی وابستگیوں کا تقاضا یہ نہیں تھا) جب نرگس بی بی باتوں باتوں میں یونہی اداس ہو جاتی تو بدرے کا جی چاہتا کہ وہ اس کی اداسی دُور کرنے کے لیے ناممکن ترین کام بھی کر دے ——

اس نے اپنے باپ سے دبی زبان میں ذکر کیا کہ اُس کی شادی جلد ہو جانی چاہیے لیکن اس

نے شیدو کے داج کا حوالہ دے اُسے ڈانٹ پلا کر چپ کرا دیا۔

ایک روز نرگس بی بی بہت ہی اداس تھی۔ بدرا بہت بے چین ہو گیا —— "کیا بات ہے بی بی —— آج آپ بہت اداس ہیں؟"

"ہوں ——؟ نہیں کوئی بھی تو نہیں۔"

بدرے نے خالی نظروں سے نرگس بی بی کی طرف دیکھا، اُس کی نظریں بھی خالی تھیں۔ لمحہ بھر کے لیے جب دونوں خلا ایک دوسرے میں اچھی طرح حل ہو گئے تو نرگس بی بی نے چاک بار کو چاٹتے ہوئے رُک رُک کر کہا ——

"بدرے —— تُو ہمارے ہاں نوکری کرے گا ——؟"

"جی ——"

"ہاں — ہاں۔"

"جی اگر شیدو ——"

"شیدو کے اتنے ظالمانہ رویے کے باوجود تمھیں اس کا اتنا خیال ہے!"

بدرا اپنی نگاہوں میں ذلیل ہو گیا —— واقعی اسے کیا پڑی ہے کہ شیدو کی اتنی بے رُخی کے باوجود اس کا اتنا خیال رکھے۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں نرگس بی بی سے معافی مانگ لی۔

"تم کتنے اچھے ہو بدرے ——!"

بدرکا جی چاہا کہ اپنی گاڑی کی ساری آئس کریم نرگس پر سے وار کے پھینک دے۔

"بی بی —— مَیں چھٹیوں میں آپ کے ہاں نوکری کر لوں گا۔"

"سچ ——!" نرگس بی بی کے مُنہ سے خوشی پھُوٹ بہی۔ پھر اُس نے اپنے پنسلوں والے ڈبے سے ایک برُش اور ٹوتھ پیسٹ نکال کر اُسے پکڑاتے ہوئے کہا: "بدرے —— اگر انسان کے دانت خراب ہوں تو اس کی صحت خراب ہو جاتی ہے اور مُنہ سے بدبو بھی آتی

ہے —"

"میں روز صبح مسواک کرتا ہوں۔"

"یہ انگریزی طریقہ ہے۔ تمہارے دانت موتی بن جائیں گے۔"

نرگس بی بی کتنی اچھی تھی، اُسے بدرے کا کتنا خیال تھا۔ اور تو اور جس طرح اس کے ذکر سے شیدو کچھ جل سی جاتی تھی، وہ اس کے برعکس شیدو کے ذکر سے خوش ہوتی تھی اور اب وہ شیدو کے دیئے ہوئے غم میں اس کی پوری حصہ دار تھی۔ صرف اسی نے اُسے سمجھنے کی کوشش کی تھی۔

کالج کی چھٹیاں بہت ہی قریب آگئی تھیں۔ یہی کوئی دو چار دن رہتے تھے۔ بدرے کی خواہش اور بھی زور پکڑ گئی کہ اس کی شادی چھٹیوں سے پہلے ہی ہو جائے۔ کیونکہ جب وہ شادی کے بعد نرگس بی بی کے گھر میں چھٹیوں کی نوکری کا تصور کرتا تو اس کا ذہن سردیوں میں آئس کریم کی گاڑی کی طرح خالی ہو جاتا۔

نرگس بی بی کی ان نگاہوں کی شدت بھی بڑھ گئی تھی جن سے آج تک شیدو نے بھی اُسے نہیں دیکھا تھا۔ وہ اپنے گھر میں اس کی نوکری کا ذکر کرتی اُسے اتنی بلندیوں میں لے جاتی کہ وہاں سے لوٹتے بدرے کو دُکھ ہوتا۔

پرسوں رات تو سینما میں بیٹھے بیٹھے بدرے کا جی چاہا تھا کہ اُٹھ کر چیختا ہوا اسکرین پھاڑ دے کیوں کہ نرگس بی بی کو اس کا اتنا خیال تھا کہ اُسے دانت صاف کرنے کے لیے ٹوتھ پیسٹ برش لا کر دیا تھا اور جس طرح اس کا جی چاہا تھا کہ اس کے اور شیدو کے درمیان سرہانے سے پائنتی تک کا فاصلہ نہ رہے۔ اسی طرح وہ چاہتا تھا کہ نرگس بی بی کے درمیان آئس کریم کی گاڑی نہ رہے۔

اس روز نرگس بی بی کی آنکھیں بالکل اژدھے کی طرح تھیں۔ اور شیدو نے دو دن سے گھر سے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ اس کے گھر میں ڈھولک کی آواز اب بھی نہیں گونجی تھی۔

کل صبح بدرے نے اپنی جیب سے قصہ سیف الملوک نکال کر پڑھا نہ یوسف زلیخا۔

اس نے قصّہ شیدو بدرا کو بھی ذہن کی جیب میں رہنے دیا اور دوسری جیب سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکال کر بڑی احتیاط سے تھوڑی سی پیسٹ لگا کر ندی میں اپنا عکس دیکھتا ہوا دانت مانجھنے لگا۔

"بدرے ——!"

بدرے نے جلدی سے گھبرا کر منہ صاف کیا۔ نرگس بی بی جانے کب سے وہاں کھڑی آئس کریم کھا رہی تھی۔ وہ بوکھلاہٹ میں یونہی ہنس دیا۔

"بدرے آج سے چوتھے دن چھٹیاں ہو جائیں گی۔" نرگس بی بی بہت اداس تھی۔ بدرا اس سے بھی اداس ہو گیا۔ پھر اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"لیکن اسی دن تو میں آپ کے ہاں نوکر ہو جاؤں گا نا۔"

"ہاں سچ —— میں بھول ہی گئی تھی۔" نرگس بی بی نے جیسے خود پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "شیدو کا کیا حال ہے؟"

"اس کا نام نہ لیجیے میرے سامنے۔ مجھے تو نظر ہی نہیں آتی۔"

"بدرے —— ! اس نے کہیں ——"

"میں بھی یہ سوچا کرتا ہوں۔"

"بڑی ظالم ہے وہ۔"

"عورت ذات ہوتی ہی بڑی ظالم ہے۔" بدرے نے اپنی تمام تر مظلومیت سے کہا۔

"اگر میں شیدو. . . . ."

نرگس بی بی باقی کا فقرہ آئس کریم کے ساتھ ہی نگل گئی اور ایک عجیب سا سانس لے کر گاڑی پر پیسے رکھ کر چلی گئی۔ بدرا مبہوت کھڑا رہ گیا۔ اس کے کان اس فقرے کے پگھلے ہوئے سونے سے بند ہو گئے تھے۔ اُسے وہاں کھڑے کھڑے اتنا پسینہ آ گیا جیسے اس نے ندی میں ڈوبتے ہوئے کسی کو بچانے کے لیے ڈبکی لگائی ہو۔ نرگس بی بی نے اس کے

ساتھ بڑی زیادتی کی تھی۔ اسے گیس بھرا غبارہ سمجھ کر ہوا میں چھوڑ دیا تھا۔ اس کا بے پناہ جی چاہا کہ شیدو کے گھر کے اوپر یہ غبارہ پھٹ کر اس کے صحن میں جا گرے۔

وہ باقی کی آئس کریم بیچے بغیر ہی گھر آگیا اور اپنے دروازے میں کھڑا ہو کر شیدو سے ملنے کی ترکیبیں سوچنے لگا۔ وہ اس سے مل کر ساری بات پوچھنا چاہتا تھا کہ اگر واقعی اسے اس میں کوئی دلچسپی نہیں رہی تو صاف صاف کہہ دے اور اگر وہ نرگس بی بی کے گھر تنہا ہی نوکر ہو گیا تو پھر شیدو کو شکوے کا موقعہ نہ ملے۔ وہ یہ نہ کہے کہ اس نے عشق کے نام پر سیاہی مل دی ہے —— وہ اس کو یہ بھی بتانا چاہتا تھا کہ اگر اسے بدرے سے نفرت ہو گئی ہے تو کوئی بات نہیں۔ دُنیا میں صرف وہی اُس سے پیار نہیں کرتی بلکہ ——

شیدو کا آنچل کمیٹی کے نلکے پر لہرایا اور وہ ہکلاتا ہُوا وہاں چلا گیا۔ شیدو اُسے گھونگھٹ کی اوٹ سے دیکھ کر گوجروں کے ویہڑے میں چلی گئی۔ بدرے کو یقین تھا کہ اگر شیدو کو اس میں ذرا سی دلچسپی بھی باقی رہ گئی ہوتی تو آج رات وہ ضرور کھڑکی کھول کر اس کا انتظار کرے گی۔

لیکن اب جب کہ وہ غصّے میں کتوں کے جوڑے کو چابک بار مار کے آگیا تھا اور کھُرے میں بیٹھ کر دانت مانجھتا ہُوا نرگس بی بی کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ہر بار اس کے شبہات کی دیوار کو یہ فقرہ گرا دیتا۔ "اگر میں شیدو ...... " یعنی اگر میں شیدو ہوتی تو تم سے کبھی ایسا سلوک نہ کرتی بلکہ ہر وقت تمہارے ساتھ رہتی، تمہاری پُوجا کرتی —— بدرے نے کالج میں پہلے دن سے لے کر آج تک کا جائزہ لیتے ہُوئے سوچا کہ وہ کتنا بیوقوف ہے خواہ مخواہ شیدو ایسی گھٹیا لڑکی کے لیے وقت ضائع کرتا رہا —— اُسے تو پہلے دن ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ نرگس بی بی کو اس سے بے پناہ عشق ہے۔ ورنہ کوئی غیر لڑکی بھی کسی سے اس قسم کی باتیں کر سکتی ہے۔

پھر مُنہ صاف کرنے کے بعد جب وہ نرگس بی بی کو آنکھوں میں لے کر چارپائی میں لیٹا تو اُس کے ذہن میں اُردو فلموں کے ڈائیلاگ گونجنے لگے ——

"مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگ سکتا۔"

"ذات کی کوڑھ کر لی۔"

وغیرہ۔ وغیرہ۔

پھر اچانک اس کو بہت عرصہ پہلے ایک ڈرائیور کا سُنایا ہُوا قصّہ یاد آگیا کہ کس طرح اس کا مالک اپنے اتنے سرمائے کے باوجود اپنی بیٹی کی محبت کو قابو میں نہیں کر سکا تھا۔ اس کی بیٹی اس سے پہلے ڈرائیور کے ساتھ بھاگ گئی تھی، اور پھر اپنے باپ کو خط لکھا تھا کہ اگر اس نے اس ڈرائیور کو اپنے کاروبار میں حصّہ دار بنا کر اس سے شادی نہ کی تو وہ یہ خبر عام کر دے گی۔ اور اس بے چارے نے اس ڈرائیور کو اپنا داماد بنا کر عزّت کی دیوار کو سہارا دیا تھا —— دُنیا میں کیا نہیں ہو سکتا۔ ہو سکتا ہے نرگس بی بی بھی ——

شیدو کی بند کھڑکی کے سامنے رفتہ رفتہ نرگس بی بی کے محل کے دروازے کُھلتے گئے اور اس نے شیدو کے لیے اپنے دِل کے دروازے کو کیلیں ٹھونک کر بند کر دیا۔ اس کے جکڑے ہُوئے اعصاب کی زنجیر ڈھیلی ہوتی گئی اور نیند ان اعصاب کی قید سے آزاد ہو کر اس کی آنکھوں میں بند ہو گئی۔

دوسری صبح اس نے ڈرائیوروں سے اور بھی ہٹ کر گاڑی کھڑی کی۔ وہ ٹوتھ پیسٹ اور بُرش نکالنے ہی والا تھا کہ دُور سے نرگس بی بی آتی دکھائی دی۔ اس کے تمام خیالات جنھیں وہ رات بھر اپنے ذہن میں سجاتا رہا تھا ایک دم یُوں بکھر گئے جیسے دماغ کے کمرے میں کسی نے بہت ہی جلدی میں چوری کی ہو۔ مستقبل کے سارے دِنوں میں اس نے نرگس بی بی ہی کو تو سجایا تھا۔ اور اب اسے ہی دیکھ کر یہ دِن اس طرح گڈمڈ ہو گئے تھے جیسے اسکرین پر ایک ساتھ کئی فلمیں چل رہی ہوں —— جیسے جیسے وہ قریب آتی جا رہی تھی یہ فلمیں اور بھی زیادہ تیزی سے گھومنے لگیں —— کبھی شیدو اسکرین پر اپنی باتوں سمیت ابھرتی، کبھی بند کھڑکی بجلی ایسی تیزی سے گھوم جاتی۔ پھر نرگس بی بی اپنی آنکھوں کا جادو لیے ہُوئے آتی اور پھر

پھلجھڑیاں رقص کرنے لگتیں، پھر مخمل میں ٹاٹ کا پیوند ایسے ڈائیلاگ گونجنے لگتے، لیکن پھر سیٹھ صاحب کی لڑکی والا ڈرائیور قہقہوں میں گھرا قصہ سناتا نظر آتا۔

نرگس بی بی نے اپنی آنکھوں کی کشتی میں ڈولتے، دل کے سیلاب میں ڈوبتے بدرے کو اپنی جھپکتی ہوئی پلکوں کا سہارا دیا —— "ہیلو بدر ——!"

بدرے کے ہونٹ زخمی پرندے کے پروں کی طرح پھڑپھڑا کر رہ گئے۔

"کیا بات ہے بدر ——" اس نے حسبِ معمول خود ہی گاڑی سے آئس کریم نکال لی۔

"نرگس ——" اُس سے بی بی نہ کہا گیا۔ اُسے جھرجھری آگئی اور اپنی نگاہوں سے زمین کو کریدنے لگا۔

"ہوں ——" نرگس کی آواز جیسے آئس کریم کے نشے میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"میں بڑا احمق ہوں ——" بدرا کچھ کھسیانا سا ہو کر ہنسا۔ "جانے میں کیا سوچتا رہا ہوں۔"

"میں بھی بڑی احمق ہوں بدر —— میں بھی بہت کچھ سوچتی رہی ہوں۔"

نرگس بی بی کی نظریں بھی زمین میں اتر گئیں۔ بدرا کچھ بھی نہیں سوچ رہا تھا۔ وہ اس وقت اس دُنیا میں نرگس کے ساتھ تنہا تھا۔

"ہیلو! بدرے ہیرو ——"

نرگس کی سہیلیاں آگئی تھیں۔ اور ان دونوں کو دنیا میں اور لوگوں کی موجودگی کے احساس سے بڑی کوفت ہوئی۔

پھر جب آدھی چھٹی کے خاتمے کی گھنٹی ہوگئی تو نرگس سہیلیوں کے ساتھ دو قدم جانے کے بعد فوراً لوٹ آئی۔

"بدر —— آج شام ہمارا ڈرامہ ہے۔ تم ڈرامے کے خاتمے تک یہیں رہنا۔ مجھے آفٹر ڈنر گھر کے لیے بہت سی آئس کریم چاہیے۔"

"مگر نرگس بی بی ——"

"اوہ ہوں ——— نرگس۔"

"میرے پاس تو صرف پانچ چھ بکٹس اور اتنی ہی چاک بارس۔۔۔۔۔۔"

"بس کافی ہیں ——— اور پھر مجھے تم سے کچھ کہنا بھی ہے۔"

شام کا اندھیرا درختوں سے نکل کر ندی پر تیرتا ہُوا کالج میں جا رہا تھا۔ وہ کالج کے گیٹ پر کھمبے کی روشنی میں آگیا۔ وہ تمام وقت یہی سوچتا رہا کہ نرگس کو اس سے کیا کہنا ہے ——— وہ خود ہی ان باتوں کے متعلق سوچ سوچ کر خوش ہوتا رہا۔ بہت ہی خوش، اتنا کہ اپنی منگنی پر بھی نہ ہُوا تھا۔

ڈرامہ ختم ہو گیا۔ لوگ چلے گئے۔ ایک ایک کر کے سب کاریں بھی چلی گئیں۔ مگر نرگس کی سیاہ کار وہیں کھڑی تھی۔ تھوڑی دیر بعد وہ آئی۔ اس نے کار سے تھرماس نکال کر گاڑی پہ رکھ دی اور بدرے نے فوراً نرگس کی آئس کریم تھرموس میں ڈالنے کے لیے گاڑی پر رکھ دی۔

"بدر ———" نرگس نے کچھ سوچتے ہُوئے کہا۔ بدرے کو اس کے دل کی دھڑکن صاف سُنائی دے رہی تھی۔ وہ پیازی غرارے میں بالکل چیری آئس کریم معلوم ہو رہی تھی ———

"جی۔" بدرے نے بہت ہی آہستہ کہا۔

"بدر ——— آج صبح جب مَیں آئس کریم کھانے آئی تھی تو وہاں ندی کے کنارے میرا پین گر گیا تھا۔ چلو ڈھونڈ لائیں۔"

"وہاں تو بہت اندھیرا ہے بی بی ———"

"اوہ ہوں۔ نرگس۔" نرگس کی آنکھوں کی ساری شراب زبان میں اُتر آئی تھی۔

"نرگس ———" بدرے کی نظریں جُھک گئیں۔

"میرے پاس ٹارچ ہے۔" اُس نے اپنے پرس سے چھوٹی سی ٹارچ نکالی۔

"چلیے۔ !"

اور ٹارچ کا ننھا سا روشن نقطہ ان دونوں سمیت اندھیرے کے دل میں اُتر گیا۔

بدرے کی گاڑی پر بھڑ اس کے قریب پڑی ہوئی آئس کریم پگھلنے لگی ——— پگھلتی رہی اور گاڑی کے کناروں سے بہتی رہی ———

کل سے کالج میں چھٹیاں تھیں - بدرا بہت خوش تھا ——— آج وہ نرگس کے ساتھ لمبی سیاہ کار میں بیٹھ کر انجانی دُنیا میں چلا جائے گا۔ کل شام نرگس نے اسے آج کے لیے ساری سکیم سمجھا دی تھی ——— دُنیا میں کیا نہیں ہو سکتا ——— دِل کے ہاتھوں سبھی مجبور ہوتے ہیں۔

بدرے نے اپنی جیب سے ٹوتھ پیسٹ اور برُش نکالا اور نرگس کی کار کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے پیسٹ نکالنے ہی والا تھا کہ کالج کے بوڑھے چپڑاسی کی آواز اس کے کانوں میں گرجی۔

"پرنسپل صاحبہ کا حکم ہے کہ تم یہاں سے دفع ہو جاؤ ——— وہ تمہاری شکل تک نہیں دیکھنا چاہتیں"

بدرے نے بچوں کی طرح اُسے کچھ یُوں دیکھا جیسے کہہ رہا ہو ——— کیا بکتے ہو ——— چوکیدار کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے (بدرے نے اُسے کبھی مُفت آئس کریم نہیں کھلائی تھی)۔

"دیدے پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھتے ہو۔ ابھی ابھی نرگس بی بی نے تمہاری رپورٹ کی ہے"

"آں ———" اس کا مُنہ کھُلا کا کھُلا رہ گیا۔

"ہاں ہاں ——— تمہارے منیجر کو فون پر رپورٹ کر دی گئی ہے۔ اگر آئندہ یہاں نظر آئے تو تھانے میں دے دیئے جاؤ گے ———"

"نرگس ——— بی بی"

"ہاں ——— نرگس بی بی نے رپورٹ کی ہے کہ تم لڑکیوں سے گندے مذاق

کرتے ہو ––– اُٹھو"

بدرے کے ہاتھوں نے بڑی شدت سے ٹوتھ پیسٹ کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت سے قہقہہ لگانا چاہا لیکن فوراً شیدو کے گھونگھٹ میں گونجتی ہوئی چوڑیوں کی جھنکار نے اس کے قہقہے کا بھی گلا گھونٹ دیا۔

صلیب کے سائے میں

یہ کانونٹ اس پہاڑی پر واقع تھا جو اوروں سے بالکل الگ تھلگ تھی۔ اُسے دیکھ کر یُوں محسوس ہوتا جیسے یہ پہاڑی بھی راہبہ بن کر ہنگاموں کی دُنیا سے نکل آئی ہو۔ ہنگاموں کی دُنیا اور اس پہاڑی کے درمیان ایک پگڈنڈی نما ٹوٹی پھوٹی کولتار کی سڑک تھی جس پر چیڑ کے خشک نوکیلے پتے بکھرے رہتے تھے اور جسے دیکھ کر اس راستے کی یاد آجاتی جو انسان کو روحانی منزل پہ پہنچاتا ہے —— اکھڑے ہُوئے چھوٹے چھوٹے نوکیلے پتھر اور چیڑ کے پھسلنے نوکیلے پتے، جیسے گرجا کے چھوٹے چھوٹے مینار ——

گرجا کی عمارت سکول سے ذرا ہٹ کر ہوسٹل کے قریب تھی اس کے مخروطی مینار پر مرغِ بادنما ہلکی ہلکی سرد ہواؤں سے گھومتا رہتا۔ گرجے کے دروازے پر محیط "بلیو بلز" کے نیلے پھولوں کی بیل تھی جس میں پہاڑی چڑیاں سارا سارا دن چہچہایا کرتیں۔

انگوٹھا چُوسنے سے لے کر اپنا نچلا ہونٹ چُوسنے تک اس نے یہ بائیس سال انہی اکھڑے ہُوئے پتھروں پر لڑھکتے، چیڑ کے خشک پتوں پہ پھسلتے، چڑیوں کے گیت سُنتے اور گرجا

کے مینار کے سائے میں سستاتے اسی کانونٹ میں گزارے تھے۔

اس کا نام بینی ڈکٹا تھا ——— سسٹر بینی ڈکٹا۔

سسٹر بینی ڈکٹا کی شکل وصورت قطعاً ایسی نہیں تھی، جسے دیکھ کر دوسری پہاڑیوں کے دلوں میں یہ احساس پیدا ہوتا کہ اس پھول کو کنواری ماں یا اس کے بیٹے کے مجسموں پر نچھاور ہونے کے بجائے کلب کے کسی پھولدان کی زینت ہونا چاہیے اس انگریز راہبہ کا رنگ سہ پہر کی دھوپ کی طرح تھا۔ اس کی ناک سوکھے ہوئے چہرے سے جیسے گرتی گرتی اٹک گئی تھی۔ دبیز شیشوں کی عینک کے پیچھے اس کی چمکیلی سیاہ آنکھیں، اصل سے ڈیڑھ گنا دکھائی دیتی تھیں۔ اس کا منہ ہر وقت کھلا رہتا جس میں شوکیس میں رکھے ہوئے چینی کے برتنوں کی طرح اس کے دانتوں کی نمائش ہر وقت ہوتی رہتی تھی۔ اگر کبھی اتفاق سے اس کا منہ بند ہوتا تو وہ اپنے نچلے ہونٹ کو "لالی پپ" سمجھ کر چوستی رہتی۔ اصول کے مطابق وہ سر سے پاؤں تک سیاہ لباس میں ملبوس رہتی تھی۔ جب شام آہستہ آہستہ چیڑ کے درختوں سے اترنے لگتی یا بادل سورج کو اپنے دامن میں چھپا لیتے تو اسے دیکھ کر بالکل یوں محسوس ہوتا جیسے کسی پرانی قبر سے کوئی مردہ نکل آیا ہے۔ کانونٹ میں پڑھنے والے ننھے ننھے بچے اس سے ضرور ڈر جاتے اگر اس کے ہونٹوں پر ہر وقت وہ پُر شفقت مسکراہٹ نہ کھیلتی رہتی جس کے سائے میں آ کر وہ اپنی اپنی امیوں کو بھول جایا کرتے تھے۔ اس کی کمر کے گرد لپٹی ہوئی چوڑی سی سفید پٹی میں زنار کے ساتھ صلیب لٹکتی رہتی تھی، جو چلتے ہوئے اس کے گھٹنوں سے ٹکرا ٹکرا کے ہمیشہ اس کے آگے آگے جھوما کرتی ——— اور وہ خود جیسے اس صلیب کے پیچھے پیچھے چلتی ہوئی اپنے ذہنی سکون کی تلاش میں سرگرداں رہتی تھی۔

سارے کانونٹ میں اس کی کوئی سہیلی نہیں تھی۔ اس نے کئی مرتبہ دوسری سسٹروں سے بے تکلف ہونا چاہا مگر جانے کیوں کوئی بھی اسے قریب نہ پھٹکنے دیتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ کسی کو پسند نہ تھی۔ اس کے دل بہلاوے کا ذریعہ صرف وہی کھلونے تھے جو کھیلتے

ہوئے آپس میں لڑ پڑتے اور پھر اس سے اِنصاف کراتے تھے۔ فراغت کا وقت وہ مخروطی سائے میں آرام کرسی میں بیٹھ کر انجیل پڑھنے میں گزارتی اور "بلیو بلز" کی بیلوں میں ناچتی ہوئی چڑیوں کے گیت سُنتی رہتی۔ اس مینار کے سائے کے ساتھ ساتھ اس کی کرسی بھی کھسکتی رہتی۔ پھر وہ کبھی کبھی انجیل کو اپنی گود میں رکھ کر دور سبزی مائل نیلی پہاڑیوں کو گھورنے لگتی، جن پر بادل سوئے رہتے تھے —— پھر ان بادلوں کی نیند اس کی آنکھوں میں بھی اُتر آتی اور مینار کا سایہ اسے تھپکیاں دینے لگتا —— سو جا، میری پیاری سِسٹر بینی ڈکٹا۔

—— سو جا، تو تنہا نہیں —— میں تیرا ساتھی ہوں —— '

اور اگرچہ سِسٹر بینی کی ڈکٹا کی آنکھیں کھُلی رہتیں لیکن اس کا احساس سو جاتا، مر جاتا۔ اور وہ دیکھتی کہ ان پہاڑیوں کے ساتھ گلوبند کی طرح لپٹے ہوئے بادلوں میں اضطراب پھیل رہا ہے اور سُورج کے پگھلتے ہوئے رنگوں سے آہستہ آہستہ مٹیالی قبا میں ایک جسم نمودار ہو رہا ہے۔ جس کے چہرے کے نقوش واضح نہیں ہیں۔ اس کے لمبے لمبے بال لہرا رہے ہیں اور اس کے سر کے پیچھے نورانی حلقے کی کرنیں روشن ہو رہی ہیں۔ پھر وہ دیکھتی، اس نے اپنے بازو پھیلا دیے ہیں اور بادلوں نے اکٹھے ہو کر بھیڑوں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ سِسٹر بینی ڈکٹا کی دبیز شیشوں کے پیچھے اصل سے ڈیڑھ گنا آنکھیں اور بھی چمکیلی ہو جاتیں اور ہونٹ لرزنے لگتے —— ہم عیسیٰؑ کی بھیڑیں ہیں —— اور پھر گرجا کے مخروطی مینار کی گھنٹیاں اپنی سُریلی آواز میں بجنے لگتیں —— مینار کا سایہ، شام کے اندھیرے میں تحلیل ہو رہا ہے۔ پیاری سِسٹر، پیاری بینی ڈکٹا، اب اُٹھو —— ورنہ شمالی ہواؤں کی سردی تمہیں منجمد کر دے گی اور پھر تم عیسیٰؑ کو کبھی ان پہاڑیوں پر نہیں سکو گی —— آؤ کلیسا میں آؤ اور یسوعؑ کے قدموں سے لپٹ جاؤ، تاکہ حیاتِ ابدی میں بھی تم اس کے ساتھ رہو —— اُٹھو بینی ڈکٹا، اب مینار کے سائے کو شام چُرا کے لے گئی ہے۔ اور تمہیں کوئی نہیں، کوئی نہیں بلانے آئے گا —— تمہاری عمر کی دوسری سِسٹریں اس

وقت خوش گپیوں میں مشغول ہیں اور پھر وہ ہمیشہ کی طرح بچوں کو مناجات کرانے کے بعد عیسیٰؑ اور اس کی کنواری ماں مریم کے قدموں میں موم بتیاں جلائیں گی اور پھر ہمیشہ کی طرح معنی خیز ہنسی ہنستی ہوئی ایک دوسرے سے بغل گیر ہو کر سو جائیں گی ——— اور تم؟ تم اسی طرح اپنے بستر پر تنہا پڑی صلیب کے دامن میں سکون کی تلاش میں بے چین تڑپتی رہو گی ... اب اُٹھو میری جان ——— شاباش، شاباش ———"

گھنٹیوں کی آخری آواز پہاڑیوں میں گونج کر ختم ہو جاتی۔ وہ اپنے سینے پر ہاتھ کے اشارے سے صلیب کا نشان بناتی اور کرسی کو گھسیٹتی ہوئی اپنے کمرے کو جاتی یہ سوچنے لگتی کہ اس کی کوئی سہیلی کیوں نہیں بنتی؟ ہر رات کوئی نہ کوئی سسٹر اُٹھ کر اپنی کسی چہیتی سسٹر کے کمرے میں کیوں چلی جاتی ہے ——— ؟ اتنی پرہیزگار ہونے کے باوجود اُسے تصور میں حضرت عیسیٰؑ کا چہرہ صاف نظر کیوں نہیں آتا ——— ؟ اتنی عبادت اور ریاضت کے باوجود بعض اوقات اس کے ذہن میں خلا کیوں پیدا ہوتے رہتے ہیں جنہیں وہ کبھی عبور نہیں کر پاتی ——— جب اُس کے ذہن میں کیوں کی تکرار ہونے لگتی تو وہ کھانا کھانے کے لیے میس میں آجاتی۔ ہر سسٹر مسکرا مسکرا کے "ہیلو" کرتی اور ان کی مصنوعی مسکراہٹیں وصول کر کے چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگتی۔ کبھی کبھار ریورنڈ مدر اُس کے پاس آجاتی جو اپنے پوپلے مُنہ سے اس کو بڑے پیار سے کہتی ——— "ہیلو ڈیئر"۔ مُسکراہٹ سے مدر کے چہرے کی جھریاں اور بھی نمایاں ہو جائیں جس میں پینی ڈکٹا ان خوشگوار دنوں کو ڈھونڈنے لگتی جب وہ مُناجات گاتی ہوئی پہاڑیوں پر خودرَو پھول چُنا کرتی تھی۔ اور تتلیاں پکڑا کرتی تھی ——— اس کا بچپن بوڑھی مدر ہی کی جھریوں میں کھو گیا تھا۔ پھر وہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیتی۔ دوسری سسٹروں میں سرگوشیاں ہونے لگتیں اور وہ بڑی مدر کو شب بخیر کہہ کر جلدی سے اپنے گروپ کے بچوں کو رات کی دُعا کرانے چلی جاتی۔ اور ننھے مُنّے بچے اس کی آواز سے آواز ملا کر گانے لگتے ———

اے مقدس باپ، ہمیں نیکی کا راستہ دکھا۔

اے مقدس باپ، گناہوں اور بُرائیوں سے ہمیں دُور رکھ۔

اے مقدس باپ، تری جناب میں کوئی کمی نہیں،

اے مقدس باپ ....

پھر سب بچے اپنے اپنے بستروں میں گھس جاتے اور وہ اسی دُعا کو گنگناتی ہوئی گرجے میں آجاتی۔ دوسری سسٹرز اس وقت وہاں سے لوٹ رہی ہوتیں۔ وہ کنواری ماں اور حضرت عیسےٰؑ کے مجسموں کے سامنے موم بتیاں جلانے کے بعد عیسےٰؑ کے قدموں میں سر رکھ کر دیر تک روتی رہتی —— اپنے آنسوؤں سے اپنی رُوح کو پاک کرتی رہتی۔ اور رات گئے جب اُسے محسوس ہوتا کہ اس کی دُعائیں عرشِ عظیم تک پہنچ گئی ہیں تو وہ نئی موم بتیاں جلانے کے بعد اپنے کمرے میں آجاتی۔ اور مناجات گاتی ہوئی خداوند یسوع مسیح کو اپنے تصور میں سمو کر لیٹ جاتی۔

دُنیا کے جھمیلوں میں جب ایک تھکا ماندہ دِن گزر جاتا ہے۔

تو ہم اپنے خداوند کے حضور میں جاتے ہیں۔

مقدس باپ، اپنے بچوں کی مدد کر

لافانی باپ، انھیں سکون عنایت فرما۔

پھر کمرے میں اس کے سرہانے صلیب کے پیچھے لگا ہوا نیلا بلب روشن ہو جاتا۔ اور وہ صلیب کے سائے میں بہت دیر تک بے چینی سے کروٹیں بدلتی رہتی۔ اس کے پُرسکون ذہن میں ننھے ننھے بلبلوں کی طرح خلا ابھر اُبھر کر پھوٹتے رہتے اور وہ سوچتی کہ یہ بلبلے کہاں سے آتے ہیں اور آکر کیوں اس کے ذہن میں بم کے مانند پھٹتے ہیں۔ پھر ان بموں کی آواز اسے لوریاں دینے لگتی اور وہ دُنیا کے جھمیلوں میں گزرے ہوئے تھکے ماندے دِن کی طرح رات کی گود میں سو کر اپنے لافانی باپ کے حضور میں حاضر ہو جاتی ——

—— لاوارث باپ اسے تھپکیاں دیتے لیکن ان کا چہرہ اسے کبھی صاف نظر نہ آیا۔
ریورنڈ مدر نے اسے بتایا تھا کہ اس کے والدین فوت ہو چکے ہیں اور کلیسا نے اسے یتیم خانے سے لے کر پالا تھا۔ مگر یہ حقیقت نہیں تھی۔ اس کے والدین فوت نہیں ہوئے تھے اور اسے اپنے ذہن سے، قبر پر چڑھائے ہوئے پھولوں کے مانند بھلا کر انگلستان میں بڑے اطمینان سے اپنے چار بچوں کے ساتھ زندگی بسر کر رہے تھے اور مدر نے اُسے یتیم خانے سے لے کر نہیں پالا تھا بلکہ حقیقت یہ تھی کہ شادی سے پانچ سال بعد تک بینی ڈکٹا کے والدین کے ہاں کوئی بچہ نہ ہوا تھا۔ پھر کسی کے کہنے پر انھوں نے گرجا میں جا کر منت مانی تھی کہ وہ اپنا پہلا بچہ کلیسا کی خدمت کے لیے وقف کر دیں گے۔ یہ بینی ڈکٹا کی بدقسمتی تھی یا خوش قسمتی کہ وہ پیدا ہو گئی اور والدین نے اُسے کلیسا کی نذر کر دیا۔ ان دنوں ریورنڈ مدر کی مامتا جوان تھی۔ اور اُس نے بڑے پادری سے کہہ کر اُسے اپنی تحویل میں لے لیا۔ وہ بالکل چھوٹی سی تھی کہ مدر کے ساتھ ہندوستان آگئی اور تب سے یہیں تھی۔

وہ بہت پیاری بچی تھی اگر اسے معلوم ہوتا کہ اس کی چھوٹی سی ناک افریقی کوے کی ناک بن جائے گی اور اس کی خوبصورت آنکھوں پر خول چڑھ جائیں گے تو وہ اپنے بچپن کو تیتریوں کی طرح جال میں قید کرنے کی پوری کوشش کرتی۔ لیکن اس کا بچپن مدر کی جھریوں میں کھو گیا۔ اب اس کی ناک چہرے سے گرتی گرتی اٹک گئی اور اس کی چمکیلی آنکھیں عینک کے پیچھے اصل سے ڈیڑھ گنا دکھائی دینے لگیں۔ اس کو اپنی بدصورتی کا بہت احساس رہتا تھا۔ کچھ تو دوسری سسٹرز اس سے اس لیے کتراتی اور محض رسمی گفتگو کرتی تھیں کہ وہ مدر کی بڑی چہیتی تھی اور انھیں خدشہ تھا کہ کہیں کوئی نامناسب بات اس کے کانوں میں پڑ کر مدر کے کانوں تک نہ پہنچ جائے۔ اور کچھ اس لیے بھی کہ وہ اسے اس قابل ہی نہ سمجھتی تھیں کہ وہ ان کے ساتھ رہے اور ان کے کمروں میں ابھرتی ہوئی سرگوشیاں سُنے۔
سسٹر بینی ڈکٹا کو سب کچھ معلوم تھا لیکن اس نے ان کی سرگوشیاں سُننے کی کبھی

کوشش نہیں کی تھی۔ وہ تو بس ہر وقت اپنا نچلا ہونٹ چوستی ہوئی انجیل مقدس پڑھا کرتی۔ مناجات گنگنایا کرتی اس کی کرسی مینار کے سائے کے ساتھ ساتھ کھسکتی رہتی اور وہ اندر ہی اندر سسکتی رہتی تھی۔ پھر جب گرجا کا مینار رات سے ہمکنار ہو جاتا تو وہ حضرت عیسےٰؑ کے قدموں پر گر کے رویا کرتی گھٹنوں سے ٹکرا کے آگے آگے جھومتی ہوئی صلیب کے پیچھے چلتی ہوئی اپنے بکھرے ہوئے سکون کو سمیٹا کرتی —— وہ سکون جس میں بلبلے اُبھرتے رہتے تھے۔

اسے رات کو بے شمار خواب آتے، جس میں وہ کسی نہ کسی حالت میں مقدس باپ کے نیاز حاصل کرتی۔ مگر اسے ان کا چہرہ صاف نظر نہ آتا —— بلکہ دھندلایا ہوا، دُور دُور ان پہاڑیوں کی طرح جن پر ہر وقت دھند چھائی رہتی تھی۔

شروع شروع میں وہ اپنے خواب دوسری سسٹروں کو سناتی تھی جس سے وہ اور بھی جلنے لگی تھیں، اور آخر ایک دن ان میں سے ایک نے کہہ ہی دیا کہ وہ بہت بڑی فراڈ ہے۔ انھیں متاثر کرنے کے لیے یہ خواب گھڑ کر سناتی ہے جب اس نے آنسو بہاتے ہوئے مدر سے کہا کہ وہ اس کا مذاق اُڑاتی ہیں تو انھوں نے بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں بیٹی —— مجھے تم پر یقین ہے —— تم اور بھی زیادہ عبادت کرو تاکہ تمھیں اصلی سکون میسر آئے۔"

اس کے بعد اس نے اپنی روحانی کیفیت کبھی کسی سے بیان نہ کی اور سکون سے فارغ اوقات میں گرجا میں رہنے لگی۔ ساری ساری رات وہیں گزار دیتی اور جب سورج کی پہلی کرن محرابوں سے داخل ہو کر کنواری ماں اور بیٹے کی قدم بوسی کرتی تو مدر آ کر موم بتیاں بجھاتی اور سسٹر بینی ڈکٹا کے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہتی۔

"بس میری بیٹی —— اپنی صحت کی قیمت سے روح کو نہ خریدو، روح اور جسم دونوں

کو آرام کی ضرورت ہوتی ہے۔"

سسٹر بینی ڈکٹا واقعی دُبلی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن وہ خوش تھی کیونکہ اب حضرت عیسیٰؑ کا چہرہ اسے واضح دکھائی دینے لگا تھا —— وہی مخصوص تاثر لیے جو لینارڈو ڈیا مائیکل اینجلو کی تصویروں میں ہوتا ہے۔

وہ دیکھتی کہ وہ بڑی دیر سے فضا میں پرواز کر رہی ہے۔ اس کے اردگرد بادل تیر رہے ہیں وہ تھک ہار کے گرنے ہی والی ہے کہ بادلوں میں سے دو پُر نُور ہاتھوں نے بڑھ کر اسے تھام لیا ہے اور پھر وہ انتہائی مسرت کے کیف میں ڈوبی حضرت عیسیٰؑ کا دامن تھامے آسمان کی نیلاہٹوں میں گھل رہی ہے۔ یا پھر حضرت عیسیٰؑ بہت دُور ایک نوکیلی چٹان پر کھڑے ہیں اسے دیکھتے ہی اُنھوں نے بازو پھیلا دیے ہیں اور وہ راستے کی صعوبتیں جھیلتی تھکی ہاری ان کے قدموں میں گر گئی ہے اور انھوں نے اسے اٹھا کر اپنے سینے سے لگا لیا ہے۔ اور یا پھر وہ گرجا کے مخروطی مینار کے سائے میں ان کے سینے سے لگی کھڑی ہے اور وہ بڑی شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہے ہیں —— "میں تمہارا محافظ ہوں ——"

اسے ہر رات کچھ اسی قسم کے خواب آتے۔ حالانکہ مریم اور عیسیٰؑ کا بہت گہرا تعلق ہے لیکن جانے کیوں اسے خواب میں کنواری ماں کبھی دکھائی نہ دیتیں —— وہ ہر روز پہلے سے زیادہ مسرور نظر آتی اور دل ہی دل میں دوسری سسٹروں کے حال پر اسے ترس آتا کہ اس سے زیادہ بدقسمتی اور کوئی نہیں کہ وہ اس قسم کی نعمت سے محروم رہیں پھر اس کی روحانی طاقت اتنی بڑھ گئی کہ اگر کسی رات اتفاق سے وہ گرجا سے جلد لوٹ آتی تو بھی اُسے پُورے تاثر سے خواب آتے —— لیکن خلا اب بھی اس کے پُرسکون ذہن میں بلبلوں کی طرح اُبھر اُبھر کر پھوٹتے رہتے تھے —— بُلبلے جو پہلے سے کچھ بڑے ہو گئے تھے اب بھی اُنھوں نے اس کا پیچھا نہ چھوڑا۔ وہ تو جیسے اس کے دماغ کے ساتھ گھنگھروؤں

کی طرح چمٹ کر رہ گئے تھے۔

حسبِ معمول ایک رات بچّوں کو مناجات کرانے کے بعد انہیں بستروں میں لٹا کر اپنے کمرے میں آئی تاکہ وہاں سے موم بتیاں لے کر جامیں جائے کہ اسے ایک بچّے کے رونے کی آواز آئی وہ فوراً ڈارمیٹری میں گئی جہاں ہسپتال کے وارڈوں کی طرح، دو قطاروں میں بستروں پر کچھ بچّے سو رہے تھے اور کچھ سونے کی کوشش کر رہے تھے۔ سسٹر ٹینی ڈکٹا نے پوچھا۔

"کیا ہوا؟"

ایک نے جواب دیا "کچھ نہیں سسٹر —— ڈر گیا ہے شاید"

بچّوں کے ہونٹوں پر مخصوص شریر مُسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ دوسرے نے کہا۔

"آج ہی آیا ہے نا بے چارہ"

"خاموش، شریر کہیں کا —— کوئی بات نہیں بچّے، شاباس، شاباش۔ ڈرنے کی بات ہی کیا ہے۔ تین مرتبہ یسوع مسیح کا نام لے کر اپنے سینے پر ہاتھ سے صلیب بناؤ۔ اس طرح —" سسٹر ٹینی ڈکٹا نے صلیب بناتے ہوئے کہا" اور انجیل کو تکیے کے نیچے رکھ کر بے دھڑک سو جاؤ —— اچھے بچّے ڈرا نہیں کرتے —— یسوع اپنی بھیڑوں کے رکھوالے ہیں"

اور وہ بچّہ سسکیاں لیتا ہوا بستر میں لیٹ گیا۔ خدا معلوم کیا بات تھی، شاید ڈارمیٹری میں پھیلی ہوئی پراسرار روشنی اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو گئی تھی یا سامنے کی کھڑکی سے نظر آتے ہوئے بھوتوں کی طرح ایستادہ چیل کے درخت "سکریچ اول ویچ" کامک کے کرداروں کے مانند اسے خوف زدہ کر رہے تھے کہ لاکھ بار بند کرنے کے باوجود اس کی آنکھیں کھل کھل جاتیں۔ سسٹر ٹینی ڈکٹا ابھی گرجا میں نہ پہنچی تھی کہ اُسے پھر چیخوں کی آواز سُنائی دی۔ اپنے روزمرہ کے پروگرام میں اس خلل اندازی کے باوجود اس کے ماتھے پر

کوئی بل نہ آیا اور وہ بہت ہی بے چین ہو کر ڈارمیٹری میں لوٹ آئی۔ اس بچے نے سسٹر کے سینے سے چمٹ کر کہا۔

"سسٹر، سسٹر۔۔۔ میں کبھی اکیلا نہیں سویا۔ مجھے بہت ڈر لگتا ہے۔ امّی امّی۔۔۔ کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

سسٹر بینی ڈکٹا نے اسے بہت سمجھایا۔ مگر وہ رُوں رُوں کرتا کہے جارہا تھا۔۔۔ "میں اکیلا کبھی نہیں سویا، امّی، امّی۔"

جب کوئی اور چارہ نہ رہا تو وہ اسے اپنے کمرے میں لے آئی اور اپنے بستر پر لٹا کر مناجات گاتی ہوئی اسے تھپکیاں دے کر سلانے لگی۔ اس کے سونے کے بعد وہ گرجے میں جاکر جلد ہی لوٹ آئی۔ مبادا وہ بچہ نیند میں پھر ڈر جائے۔ پہلے تو اس نے سوچا کہ اسے اُٹھا کر اس کے اپنے بستر پر چھوڑ آئے لیکن پھر اس خیال سے کہ کہیں جاگ نہ اُٹھے کپڑے تبدیل کر کے اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی۔

اس نے سرہانے کی طرف صلیب کے پیچھے لگا نیلا بلب روشن کر دیا۔ اور صلیب کے مجرّد سائے نے اسے اپنے دامن میں لے لیا۔ کچھ دیر تک وہ اس دھندلی روشنی میں سوئے ہوئے معصوم سے بچے کو دیکھتی رہی۔ پھر اسے سینے سے لگا کر آنکھیں موند لیں اور گرجا میں لگی تمام تصویریں اینجلو کا "پاِیٹا"، رافیل کی "میڈونا اینڈ دی چائلڈ"، بروگل کی "ہولی فیملی" اس کے ذہن میں بجھولا جھولتی رہیں اور پھر آہستہ آہستہ دبے پاؤں اس کی آنکھوں میں نیند اتر آئی۔

اس رات اُسے کوئی خواب نہ آیا۔ پھر ہر رات اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی بچہ سونے لگا اور پھر کبھی اسے کوئی خواب نہ آیا۔۔۔ اور خلاؤں کے بلبلے اس کے ذہن سے یوں غائب ہو گئے جیسے سردیوں میں مُنہ سے نکلتی ہوئی بھاپ فضا میں۔۔۔

تیسری تکبیر

بازار کی طرف کا دروازہ کھول کر مَیں بیٹھک میں اخبار پڑھ رہا تھا۔

پروفیسر اسد کی بیوی آئی اور مجھے سلام کر کے بڑی تیزی سے اندر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد میری بیوی نے آ کر مجھے بتایا کہ پروفیسر اسد کے ہاں اس کے بیٹے مجی کو پکڑنے کے لیے پولیس آئی ہے۔ مَیں نے اس کی وجہ پوچھی تو میری گھبرائی ہوئی بیوی نے کہا کہ مجی کی ماں نے اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا اور وہ لوگ مجھے بلا رہے ہیں —— معاملہ محلے داری کا تھا اس لیے میرا جانا بہت ضروری تھا۔ مَیں نے فوراً اخبار بند کر دیا اور پروفیسر اسد کے ہاں چلا گیا۔

اس کے گھر کے سامنے محلے کے چیدہ چیدہ آدمی جمع تھے۔ سب انسپکٹر اور دو سپاہی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ سپاہی پروفیسر اسد کا حقہ گڑگڑا رہے تھے، میاں امین سب انسپکٹر کو کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور پروفیسر اسد محلے داروں سے مصروفِ گفتگو تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ میری طرف لپکا۔

"دیا۔ غضب ہو گیا، یہ لڑکا بہت بدمعاش ہے، کم بخت نے آج یہ دِن بھی مجھے دکھایا۔"

پروفیسر اسد سے کچھ پوچھنے کی بجائے مَیں نے سب انسپکٹر کو اپنا نام و نسب بتا کر اس ہنگامے کی وجہ پوچھی۔ اس نے خدا معلوم کس کو گالیوں سے نوازتے ہوئے پرچہ میرے ہاتھ میں پکڑا دیا۔۔۔۔۔۔۔ مجیب اسد ولد پروفیسر اسد علی سکنہ ہاشمی محلہ، ہمارے ہمسائے مسٹر اکمل کو سیٹیاں مارنے کے الزام میں ماخوذ تھا۔

بات بڑی دلچسپ تھی کیونکہ مسٹر اکمل پچاس پچپن برس کا آدمی تھا۔ لیکن مجی سے اس بچپنے کی اُمید نہ کی جا سکتی تھی۔ وہ خاصا سلجھا ہوا انسان تھا، جانے کس ترنگ میں آ کر اُس نے یہ حرکت کی تھی۔

مَیں نے ایس۔ آئی سے کہا۔

"جناب یہ کوئی قابل مواخذہ بات نہیں۔ اس میں کیا تُک ہے کہ سیٹی بجانے پر کسی کو گرفتار کر لیا جائے۔ بالفرض اگر اس نے مسٹر اکمل کی طرف دیکھ کر سیٹی بجائی بھی تھی تو کونسی آفت آ گئی۔ مَیں بھی دو بچوں کا باپ ہوں، میرے سر کے بال قریب قریب سفید ہو چکے ہیں۔ اگر کوئی مجھے سیٹی مارے تو بجائے تھانے میں رپورٹ لکھوانے کے بجائے کسی رقص گاہ میں جا کر ناچوں گا کہ مَیں ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔"

"آپ نے یہ تو پڑھا نہیں۔"

یہ دوسری رپورٹ تھی۔ مجی، مسٹر اکمل کا لیٹر بکس کھول کر خط نکالنے کے الزام میں بھی ماخوذ تھا۔ اس سے اس حرکت کی اُمید نہ تھی۔۔۔۔۔۔۔ بہرحال اگر اس نے کسی وجہ سے خط نکالے تھے تو یہ قضیہ بھی آپس میں طے ہو سکتا تھا۔

مسٹر اکمل اور پروفیسر اسد محلے کے شریف ترین آدمیوں میں شمار ہوتے تھے۔ جانے مسٹر اکمل نے کس وجہ سے پروفیسر اسد کی عزت گندی نالیوں میں بہائی۔ میری سمجھ میں ابھی تک کچھ نہ آیا تھا۔ مجی کو اس کے لواحقین نے کہیں روپوش کر دیا تھا۔ اور اب سب انسپکٹر

اس کو ساتھ لے جانے پر مصر تھا۔

مسٹر اکمل ابھی تک نہیں آیا تھا۔ مَیں نے آگے بڑھ کر اس کے مکان کی طرف دیکھا، اس کی بیوی دروازے کی چق اُٹھائے دیکھ رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ پیچھے ہٹ گئی۔ میں نے میاں امین کو مسٹر اکمل کے گھر بھیجا کہ اس کو بُلا لائے اور خود معاملہ رفع دفع کرانے کے لیے سب انسپکٹر کو سمجھانے کی کوشش کرنے لگا۔

مسز اکمل نے میاں امین سے کہلوا بھیجا کہ آدھا گھنٹہ ہُوا وہ دفتر گئے ہیں۔ مسٹر اکمل کا اتنی جلد دفتر جانا غیر معمولی بات تھی۔ مَیں نے اس کے دفتر ٹیلیفون کر کے پوچھا تو چپڑاسی نے بتایا کہ ابھی تک چپڑاسیوں کے سوا کوئی نہیں آیا۔

مَیں نے سب انسپکٹر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر معنی خیز انداز میں اس کا کندھا دبایا اور اُسے تھوڑی دُور تک اپنے ساتھ لے گیا۔ چند ایک منٹوں کے بعد جب ہم لوٹے تو اُس نے سپاہیوں سے کہا:

"اب یہاں کون اتنی دیر تک مغز ماری کرے، اور کام بھی تو کرنے ہیں —— کل آئیں گے۔"

پھر اس نے پروفیسر اسد کو تاکید کی کہ مجرم کل یہاں موجود ہونا چاہیے۔ سپاہیوں نے ہتھکڑی اُٹھائی۔ حقے کے لمبے لمبے کش لیے اور چلے گئے۔

محلے کے لوگوں میں طے پایا کہ شام کے وقت میاں امین کے گھر میں مسٹر اکمل اور دیگر احباب کو بلا کر سمجھوتہ کرا دیا جائے۔

مسٹر اکمل کی حالت بہت قابلِ رحم تھی کیونکہ وہ اپنی بیوی کے سامنے یوں ہو جاتا جیسے لومڑی کے سامنے خرگوش۔ وہ زن مرید تو نہ تھا لیکن کوئی نہ جانتا تھا کہ اس کی بیوی اس کے ساتھ بالکل سوتیلے بچوں جیسا سلوک کرتی ہے۔ جب وہ نئے نئے اس محلے میں آکر بسے تھے تو محلے کی عورتوں کا خیال تھا کہ مسز اکمل ایسی اچھی اور نیک دل خاتون شاید

ہی کوئی ہو۔ وہ اس کے سلیقے اور خوش نما لباس سے زیادہ اس کے برتاؤ سے متاثر تھیں۔ مسٹر اکمل بڑا فرمانبردار قسم کا خاوند تھا اور سب عورتوں کا خیال تھا کہ سب بیویوں کے خاوند ایسے ہی ہونے چاہئیں۔

اس کی تینوں جوان بیٹیاں سردیوں کے دنوں میں بالکنی میں بیٹھ کر دھوپ سینکا کرتیں۔ گرمیوں کی شامیں بھی وہ اسی بے پردہ جگہ میں گزارتیں اور باہر آنے جانے والے کو دعوتِ نگاہ دیتیں۔ جب وہ بن سج کے کسی غرض سے باہر نکلتیں تو محلے کے نوجوانوں کی آنکھیں مجبور ہو جاتیں کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم ایک نگاہ اُٹھا کر ہی دیکھ لیں۔

یُوں اور بھی کئی نوجوان بڑی دُور سے سونگھتے ہُوتے آتے اور سارا دن بالکنی کی طرف نظریں گاڑے، بلوں کے مانند، بالکنی میں بیٹھی ان چڑیوں کی طرف بھُوکی نگاہوں سے دیکھتے۔ مسٹر اکمل کی چڑیاں ان آوارہ بِلوں سے بہت لُطف اندوز ہوتیں۔

جب محلے میں ان بِلوں کی آمد و رفت زیادہ ہو گئی اور ان کی نگاہیں دوسرے مکانوں کی طرف بھی اُٹھنے لگیں تو لوگ دبی دبی زبان میں اعتراض کرنے لگے۔ مسٹر اکمل اپنی بیوی سے باز پُرس کیے بغیر جس طرح بھی ممکن ہوتا ان لوگوں کو مطمئن کر دیتا۔ شاید اس لیے کہ اپنی بیوی کے ساتھ اس موضوع پر گفتگو کرنے کی اس میں جرأت نہیں تھی۔ لیکن جب مسٹر اکمل کی غیر حاضری میں ان کے دروازے کے سامنے ہر روز نئی چمکیلی کاریں آنے لگیں تو محلے کی بڑی بوڑھیوں نے مسز اکمل کی شرافت، سلیقے اور برتاؤ کو نظر انداز کرتے ہُوئے صاف طور پر اس سے کہہ دیا کہ بہن!۔ اپنی بیٹیوں کے چلن ٹھیک کرو۔ ان کے باعث محلے کے شرفا کی عزّت کو گھن لگ رہا ہے۔

مسز اکمل یہ سُن کر مصنوعی سناٹے میں آگئی۔ "آپ یہ کیا کہہ رہی ہیں۔ میری بیٹیاں اور ایسی ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہُوئی ہے۔ اگر میری بچیاں میک آپ کر کے باہر جاتی ہیں تو کوئی حرج نہیں، آج کل سب لڑکیاں بناؤ سنگار کرتی ہیں ۔۔۔ کون ہے جو اپنے کو سنوارنے

کی کوشش نہیں کرتا۔ ماشاء اللہ میری لڑکیاں خوبصورت ہیں اسی لیے آپ لوگ جلتی ہیں اس محلّے میں کوئی بھینگی، کوئی لنگڑی ـــ کسی کا سر بڑا ہے تو کسی کا رنگ توے کے مانند ـــ جبھی تو لوگ میری بیٹیوں کو ٹیڑھی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔"

جب ان چمکیلی کاروں کا حوالہ دیا گیا تو مسز اکمل نے انھیں بتایا کہ ان کاروں میں اس کے وہ رشتہ دار آتے ہیں جن کے ساتھ بعض خاندانی جھگڑوں کے باعث تعلقات بگڑ چکے تھے۔ لیکن بفضل خدا اب تعلقات سنور چکے ہیں ـــ اور کھاتے پیتے آدمی ہیں۔

مسز اکمل نے ہر طرح انھیں قائل کرنا چاہا، لیکن بڑی بوڑھیاں مطمئن نہ ہوئیں۔ بلکہ شام کے وقت محلّے کے معززین مسٹر اکمل سے ملے اور اس کی شکایت کی۔ اس نے بہت نادم ہو کر کہا۔

"میں اپنی بیوی سے دریافت کروں گا۔"

مسٹر اکمل نے بڑی ہمت کر کے اپنی بیوی سے پوچھا، تو وہ برس پڑی۔ "میں نے تم سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ میرے معاملات میں دخل نہ دیا کرو۔"

"بیگم، عزّت کا سوال ہے۔"

"بھاڑ میں جائے تمھاری عزّت ـــ گھر میں جوان لڑکیاں بیٹھی ہیں، ان کا خیال نہیں؟ ساڑھے تین سو روپیہ ماہوار میں کس کس کی شادی کرو گے ـــ؟ اپنی عزّت کے ساتھ بیاہو گے کیا ـــ؟"

"تمھارے اسی قسم کے دلائل نے مجھے پہلا محلّہ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب یہاں کی بنی بنائی عزّت کو تو تباہ نہ کرو۔"

"شادی پیسے کے ساتھ ہوتی ہے عزّت کے ساتھ نہیں۔ لوگ دیکھتے ہیں میرے والدین نے تمھارے پاس رقم دیکھ کر کی تھی۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ تم چند ہی سالوں میں کنگلے ہو جاؤ گے ـــ ورنہ میں تم سے کبھی شادی نہ کرتی۔"

اور حقیقت بھی تھی۔ اگر مسز اکمل کو علم ہوتا کہ اس کی تیسری بیٹی کی پیدائش تک مسٹر اکمل کی ساری جائیداد بک جائے گی اور نوکری کرنا پڑے گی تو وہ کبھی اس کے ساتھ شادی نہ کرتی۔ اس میں مسٹر اکمل کا کوئی قصور نہ تھا۔ کیونکہ اس کی مسز نے اس کی محبت کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے دل کھول کر فضول خرچی کی اور اپنی سب عادتیں چھوڑ کر ریس کھیلنے کی عادت کو برقرار رکھا۔ پھر اس کی پہلی دو بیٹیوں کے باعث اخراجات میں اضافہ ہو گیا۔ اس زمانے میں فراوانی تھی اس لیے ہر چیز پر کھلا خرچ ہوتا تھا۔ لیکن جب تیسری لڑکی پیدا ہوئی تو مسٹر اکمل قریب قریب دیوالیہ ہو چکا تھا۔ اس لیے اپنے آبائی شہر میں اپنی جائیداد کا آخری مکان بیچا اور یہاں چلا آیا۔ مہینہ دو مہینے بے کار رہنے کے بعد اسے پرائیویٹ فرم میں نوکری مل گئی۔

مسز اکمل کے لیے نہ جائے رفتن نہ پائے ماندن والا حساب تھا۔ وہ اپنے میکے اس لیے نہ جا سکتی تھی کیونکہ وہاں طبلے کی تھاپ پر جوانی بکتی تھی اور اس کی جوانی کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ مسٹر اکمل کی ساڑھے تین سو کی آمدن میں گزارہ مشکل تھا۔ وہ ہر روز اپنے خاوند کو جلی کٹی سناتی، طعنے دیتی۔ وہ خاموش رہتا اور پھر کئی کئی دن تک ان کی آپس میں گفتگو نہ ہوتی۔

اب مسز اکمل کی صرف ایک خواہش تھی کہ اس کی بیٹیاں پریوں کا روپ دھار لیں۔ وہ سارا روپیہ اپنی بیٹیوں کو خوبصورت بنانے میں صرف کرتی، جس سے اس کو دماغی سکون حاصل ہوتا اور وہ یوں محسوس کرتی گویا اپنے چہرے پر ماضی کا غازہ تھوپ رہی ہے۔ اپنی تیسری بیٹی کے جوان ہونے پر مسز اکمل نے بہترین لباس پہننا شروع کر دیا۔ مسٹر اکمل کی غیر حاضری میں اس کی پہلی بیٹی کے تین چار دوست اس سے ملنے کے لیے آنے لگے۔ آخر کب تک محلے والے سب کچھ جان گئے اور پھر مجبوراً انھیں وہ محلہ چھوڑنا پڑا۔

مسٹر اکمل اپنے محلے والوں کی طرح جانتا تھا کہ ساڑھے تین سو روپے میں اتنے اچھے لباس اور میک اپ کا قیمتی سامان کیونکر آ سکتا ہے۔ اور اس کی بیوی ریس کورس کیونکہ

جاسکتی ہے؟ خدا معلوم انھوں نے اپنی بیوی کو ڈانٹنے کی بجائے خاموشی مناسب کیوں سمجھی؟
مسٹر اکمل نے دوسرے محلّے میں آتے ہی اپنی شرافت کی دھاک بٹھا کر مختلف گھروں میں جھانکا کہ ایسا گھر مل جائے جس پر وہ اپنے دانت تیز کر سکے لیکن اس کو بہت مایوسی ہوئی کیونکہ محلّے میں کوئی بھی اتنا دولت مند نہیں تھا جس کے بیٹے اس کی بیٹیوں کو شاپنگ کرا سکتے اور اسے ریس کورس لے جا سکتے اور یہی وجہ تھی کہ اس کو ان لوگوں پر کوئی اعتراض نہ تھا جو اس کی بیٹیوں کا پیچھا کرتے ہوئے انھیں گھر تک چھوڑنے آتے تھے —— مبادا کسی کے ساتھ کوئی سلسلہ ہو جاتے۔ مسٹر اکمل کو اپنی مسز کے مشاغل سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہے۔ دینے کو تو وہ طلاق بھی دے سکتا تھا، لیکن اُسے اپنی تین بیٹیوں کا خیال آجاتا تھا۔ اور اس رات اس نے پہلی مرتبہ اپنی بیوی سے اس سلسلے میں دریافت کیا تھا تو اس نے بیٹیوں کی شادی کے مسئلے کو ڈھال بنا کر سامنے رکھ دیا تھا جس پر مسٹر اکمل کے وار بے اثر تھے۔
اگلے دن مسٹر اکمل محلّے داروں کو کوئی تسلّی بخش جواب نہ دے سکے۔ ان لوگوں نے اس سے تعلقات قریب قریب منقطع کر لیے اور مسٹر اکمل کی حیثیت محلّے میں بالکل ایسی ہو گئی جیسے حقّے میں سڑے پانی کی۔
محلّے کے نوجوانوں کی ہر محفل میں کسی نہ کسی بہانے مسٹر اکمل کی ان بچیوں کا ذکر ضرور ہوتا لیکن مجی ہمیشہ خاموش رہتا۔ اس کے دوست اسے مذاق کرتے، پھبتیاں کستے اور وہ یہی کہتا "مجھے ان میں سے کسی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں" یہ کہتے ہوتے اُسے بڑا دکھ سا ہوتا، کیوں کہ اس کے ذہن میں ہر وقت یہ سوال گونجتا رہتا تھا کہ یہ لڑکیاں ایسی کیوں ہیں؟ پھر بھی وہ اپنے دل کے دُکھ کو اپنے دوستوں کے سامنے اس جواب کی صورت میں زبان پر لا کر خود کو بہت ہلکا محسوس کرتا۔ پھر وہ سوچتا اس میں ان بیچاری لڑکیوں کا کیا قصور ہے؟ مسٹر اکمل نے ان کی لچکیلی ٹہنیاں جس شکل میں موڑ دیں، مڑ گئیں۔ پھر اس کے ذہن میں ایک اور

سوال اُبھرتا۔ اگر کوئی چاہے تو کیا ان ہڈیوں کو اپنی اصلی صورت میں نہیں لا سکتا؟

جب بھی وہ مسز اکمل کے گھر کے سامنے سے گزرتا تو اس کی آخری تکبیر کی گنگناہٹ اس کا تعاقب کیا کرتی لیکن وہ ہمیشہ یہی سمجھتا کہ یہ تکبیر بھی ایک عام دعوتی رقعہ ہے۔ اس کے پاس کتنی مرتبہ کلثوم کی نگاہوں کے پریس میں چھپے ہوئے رقعے آتے، جانے کس وجہ سے وہ ان کے پروف تک نہ پڑھ سکا۔

ایک دن محلے کے تمام گھروں میں مسٹر اور مسز اکمل کی طرف سے ان کی دو بڑی بیٹیوں کی شادی کے دعوت نامے موصول ہوئے۔ دونوں کی شادی میں ایک ہفتے کا وقفہ تھا۔

محلے کی اکثریت کی طرح مجی کا ارادہ بھی شادی میں جانے کا نہیں تھا۔

پہلی لڑکی کی شادی سے ایک روز پہلے وہ اس کے گھر کے سامنے اور میاں امین کے گھر کے نیچے گامے کی دوکان سے سگریٹ خرید کر واپس آ رہا تھا کہ مسٹر اکمل کے نوکر نے اس کو ایک کاغذ دیا۔ مجی کے استفسار پہ لڑکے نے مسٹر اکمل کے مکان کی طرف دیکھا اور جواب دیے بغیر بھاگ گیا۔ مجی نے اس مکان کی طرف نظریں اٹھائیں، بالکنی میں کلثوم کھڑی تھی۔ مجی نے فوراً رقعہ پڑھا، لکھا تھا "آپ کل شادی میں ضرور آئیں" اس نے دوبارہ کلثوم کی طرف دیکھا — کلثوم کی نگاہیں مجی کے دل میں اترنے لگیں۔ "آپ ضرور آئیں، آپ کو آنا چاہیے" اس نے کاغذ جیب میں رکھا اور چلا آیا۔

وہ سوچتا رہا کہ اسے جانا چاہیے یا نہیں۔ جب اس کے دل میں التجا سے بھری دو آنکھیں اُترنے لگیں تو وہ اپنے دل کو ٹٹولتا اور فیصلہ کر لیتا کہ ضرور جائے گا۔ لیکن جب اس کی ماں اور چمکیلی کاروں کا تصور ذہن میں آتا تو وہ کہتا "یہ سب بکواس ہے، فراڈ ہے۔ کلثوم میرے لیے نہیں، وہ خالصتاً اپنی ماں کی جائداد ہے جس کو میں خرید نہیں سکتا، اور اس کی ماں کے نزدیک محبت کی کوئی قیمت نہیں"

صبح تک اس کا ارادہ جانے کا نہیں تھا۔ مگر جانے پھر کس خیال سے اس نے وہ سوٹ نکال کر پہنا جو اس نے نوکری کے انٹرویو کے لیے پہنا تھا، اور مسٹر اکمل کے ہاں چلا گیا۔

وہ لوگ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ مسٹر اکمل نے پروفیسر اسد کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ طبیعت خراب ہونے کے باعث نہیں آ سکے۔ مسٹر اکمل سمجھ گیا کہ مجی جھوٹ بول رہا ہے۔

شادی کا انتظام بہت اچھا تھا۔ مسز اکمل بہت خوش تھی اور اس کی خوشی نواب زادہ اکبر علی کے ساتھ آئے ہوئے بینڈ کی صورت میں چیخ رہی تھی اور اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی اپنی رُوح مجلہ عروسی بن گئی ہے۔ اس کی سالہا سال کی محنت کا پھل، اس کی اپنی پہلی تکبیر کی آواز کے رس کی صورت میں ٹپک رہا تھا۔

باراتی کھانا کھا رہے تھے شہنائیاں چیخ رہی تھیں، کلثوم نے نوکر کے ذریعے مجی کو بلایا اور اوپر اپنے کمرے میں لے گئی۔ اس کی ماں نچلی منزل میں مہمانوں کے پاس تھی۔

مجی نے کہا۔

"فرمائیے"

"آپ کو ہمارے ہاں آ کر خفت تو محسوس نہیں ہوئی"

مجی خاموش تھا۔ کلثوم نے کہا۔

"مجھے اپنی امی پسند نہیں، مجھے اپنے گھر سے نفرت ہے، میں یہاں سے کہیں چلی جانا چاہتی ہوں ـــــ اب امی کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھنے کی میری باری ہے ـــــ مجھے شوکت سے نفرت ہے"

پھر کلثوم نے مجی کو بتایا کہ اس کو اس سے بہت محبت ہے اور وہ اس کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔

اس دِن مجی کو پہلی مرتبہ احساس ہُوا کہ کلثوم کی نگاہوں کے پیغام صرف اسی کے لیے تھے۔ وہ اپنی بہنوں سے مختلف ہے، وہ اپنی ماں کی ضد ہے، وہ اس کو غلط سمجھتا رہا ہے —— آذر کے ہاں اب بھی ابراہیم پیدا ہو سکتے ہیں، مسز اکمل ایسی عورتوں کے ہاں کلثوم ایسی لڑکیاں پیدا ہو سکتی ہیں، مریم کی طرح پاک اور میرا بائی کی طرح مقدس —— کلثوم کو اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔

ایک ہفتے کے بعد دوسری تکبیر بھی بڑی دھوم دھام سے پڑھ دی گئی۔

مسز اکمل کی موجودگی میں ان دونوں کا آپس میں ملنا قریباً ناممکن تھا۔ اس لیے یہ ایک دوسرے کو طویل خط لکھ کر اپنے ذہنوں کی پیاس بجھاتے رہے۔ پھر مجی نے اس سے کہا کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے کے بہانے اس سے ملنے آجایا کرے۔ کلثوم کی کوئی سہیلی نہ تھی، شوکت بی۔اے کے امتحان میں مصروفیت کے باعث صرف دوپہر کے وقت کھانے پر ملنے کے لیے آیا تھا۔ کلثوم نے کہا کہ وہ شام کے وقت شوکت سے ملنے کے لیے اس کے ہوسٹل جایا کرے گی۔ اس کی ماں نے اس کو اجازت دے دی۔

وہ شوکت سے ملنے کے بہانے مجی کے ساتھ سیر کرنے کے لیے جاتی رہی۔ مسز اکمل اپنی بیٹی کی طرف سے مطمئن تھی کیونکہ آخر وہ اپنی بڑی بہنوں کی طرح مسز اکمل ہی کی بیٹی تھی۔ اس لیے اس نے شوکت سے اس کی شاموں کے بارے میں کچھ نہ پوچھا —— اور شوکت کو ضرورت ہی نہ محسوس ہوئی تھی کہ وہ شام کے بارے میں امتحان کے دِنوں میں سوچتا۔

پھر اس کے امتحان ختم ہو گئے اور وہ دوسرے ہی دِن دوپہر کے علاوہ شام کو بھی آیا۔ مسز اکمل نے حیرانی سے کہا "وہ تو آپ ہی سے ملنے گئی ہے" شوکت نے لاعلمی کا اظہار کیا تو مسز اکمل نے متفکر ہو کے پُوچھا "تو کیا وہ کل بھی آپ کے ہوسٹل نہیں آئی ——؟"

اس نے نفی میں سر ہلا دیا اور مسز اکمل کا تجربہ کار ذہن معاملے کی تہ تک پہنچ گیا۔

اُس رات کلثوم لَوٹی تو اس کی ماں نے اُسے خوب پیٹا۔ جب اس کے جسم پر نیلے

نشان پڑ گئے تو اس نے بتایا کہ وہ مجی کے ساتھ جاتی رہی ہے۔ مسز اکمل نے اس کے دودھیا جسم پر اور نیلے داغ ڈالے تو اس نے مجی کے لکھے ہوئے تمام خطوط اس کے حوالے کر دیے۔ مسٹر اکمل دوسرے کمرے میں اپنے دفتر کا کام کرتے ہوئے سب کچھ سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔

"بچی کو ختم کر کے دم لو گی کیا ۔۔۔؟"

مسز اکمل چیخی ۔۔۔ "تم اپنے کام سے کام رکھو جی ۔۔۔ بکواس نہ کرو۔"

اور مسٹر اکمل مزید بکواس کیے بغیر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

کلثوم اس دن کے بعد پھر کبھی مجی سے ملنے کے لیے نہ آئی۔ کیونکہ مسز اکمل کبھی اس کو نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے دیتی تھی۔ مجی نے دو ایک مرتبہ نوکر کے ذریعے اس کو خط بھیجے لیکن کوئی جواب نہ ملا اور پھر جب شوکت کی نیلی اولڈس موبیل کنورٹیبل ہر وقت مسز اکمل کے ہاں رہنے لگی اور دونوں ماں اور بیٹی اس کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے جانے لگیں تو مجی کو ایسا محسوس ہوا جیسے کلثوم کے وعدے اور محبت اس کے اصلی کردار پر میک اپ تھے جس کو شوکت کے سرمائے نے دھو دیا ہے۔

مسز اکمل اپنے اس امام کے ذریعے سے جلد از جلد تیسری تکبیر پڑھنا چاہتی تھی لیکن اس کو ان خطوں کا فکر کھائے جا رہا تھا جو کلثوم نے مجی کو لکھے تھے۔ مبادا مجی ان خطوں کی آڑ میں کلثوم کو اس کے سسرال میں بدنام کرنے کی کوشش کرے اور شادی کے بعد ردِ عمل کے طور پر اس کی زندگی اجیرن کر دے ۔۔۔ وہ دن رات اس سے خط حاصل کرنے کی ترکیبیں سوچتی رہتی۔ مگر اس کا تجربہ کار ذہن اس عقدے کو حل کرنے سے قاصر تھا۔

ایک دن مجی اپنے کمرے میں بیٹھا ماضی کے دھندلکے میں یادوں کے دیئے جلا رہا تھا کہ کلثوم نے نوکر نے آکر ایک خط دیا۔ خط بہت مختصر تھا۔ وہ فوراً اس کے گھر گیا۔ اس کے آتے ہی کلثوم نے بڑی درشتی سے کہا ۔۔۔ "مجیب صاحب میرے خط لوٹا دیجیے۔"

لیکن اس کی آنکھوں میں وہی پیار اور حدت تھی جو مجی کے لیے مخصوص تھی، اور جیسے مجی

بہت دُور سے محسوس کر لیا کرتا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا —— "لیکن کلثوم ——"

"میں کچھ اور سُننا نہیں چاہتی —— بس آپ میرے خط واپس کر دیجیے۔" اس نے آنکھوں کے پیار کو حدت میں جلانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے کہا۔

جب مجی کسی طرح نہ مانا تو اس نے بڑی التجا سے کہا۔ "میرے مستقبل کو تباہ نہ کیجیے —— اگر آپ کو مجھ سے محبت ہے تو میرے خط لوٹا دیجیے ——"

"تمھارے خط میری زندگی کا سرمایہ ہیں، میری زندگی ہیں —— کلثوم ایمں مجبور ہوں۔"

پھر اس نے کہا "بس، اس لیے بُلایا تھا۔"

کلثوم کی آنکھوں میں پیار حدت کی شدت سے پگھل کر بہہ نکلا جب اس نے نظریں اٹھائیں تو مجی جا چکا تھا۔ اور اس کی ماں دروازے کا پردہ اُٹھا کر کمرے میں داخل ہوئی۔

"تم نے خود ہی اپنا مستقبل تباہ کیا ہے —— نہ اس حرامی سے یارانہ رکھتیں نہ آج یہ دن دیکھنا پڑتا۔ اب میں اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہوں کہ اس سنپولیے کو تمھارے لیے میں نے خود بُلایا تھا۔" مسز اکمل نے کچھ اس انداز سے کہا جس انداز سے وہ مسز اکمل بننے سے پہلے گفتگو کیا کرتی تھی۔

اس کے بعد اس نے مجی کو مختلف لوگوں کے ذریعے بدنام کرنا شروع کر دیا کہ شاید مجی اس سے متاثر ہو کر خط واپس کر دے۔ پروفیسر اسد کے پاس نت نئی شکایتیں آنے لگیں۔ جس کے باعث وہ اپنے بیٹے سے بہت تنگ آ گیا۔ وہ اپنے بیٹے سے ان شکایات کی صداقت کے بارے میں دریافت کرتا، مگر مجی خاموش رہتا۔ جب وہ اپنے باپ کے سوالوں سے اکتا گیا تو اس نے کہا۔

"اگر آپ کو ان باتوں پر یقین ہے تو ٹھیک ہے۔"

پروفیسر اسد کو مجی سے یہ اُمید نہ تھی کہ وہ اپنے شریف باپ کی عزت کو اس طرح داغے گا۔ محلے کے نوجوان جب بھی اس سے ملتے تو کہتے —— "یار تم تو بڑے چھپے

رستم نکلے ؟"

"خوب عیش کرتے ہو۔"

"اور سُناؤ تمہاری ساس کا کیا حال ہے ؟"

وغیرہ وغیرہ

مجی یہ سب کچھ سُن کر مُسکرا دیتا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ کلثوم اس کو کیوں بدنام کر رہی ہے اور اس کے محلہ داروں کا انداز طنزیہ کیوں ہے۔ وہ دِل ہی دِل میں کہتا ــــ "کچھ بھی ہو کلثوم ــــ ان خطوں کو مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا، تمہارے خط میری رُوح ہیں۔"

جب مسز اکمل کی مجی سے خط حاصل کرنے کی ساری ترکیبیں بالکل اسی طرح اکارت گئیں جیسے کلثوم کے دِل سے مجی کا نقش مٹانے کی تو اس نے پولیس میں رپورٹ درج کرا کے اپنا آخری حربہ استعمال کیا۔ مسٹر اکمل اپنی بیوی کے احکام اس طرح بجا لایا جیسے وہ کوئی غیر مرئی ہستی تھی۔ وہ اسی وقت گیا اور جو کچھ اس کی بیوی نے اس کو سکھایا تھا اس نے طوطے کے مانند رٹا ہُوا سبق تھانے میں دُھرا دیا۔ اور مسز اکمل نے ادھر مجی کو پیغام بھیج دیا کہ اگر وہ خط لوٹا دے تو رپورٹ واپس لی جا سکتی ہے۔ مجی کے سر پر ضد کا بھوت سوار تھا۔ وہ روپوش ہو گیا اور اب پولیس اُسے ڈھونڈ رہی تھی۔

سہ پہر کے وقت معززین میاں امین کے گھر میں جمع ہوتے چونکہ مسٹر اکمل اپنی بیوی کے منع کرنے کے باعث نہ آیا تھا اس لیے کوئی فیصلہ نہ ہو سکا تھا۔

دِن ڈھلے مجی گھر آیا، پروفیسر اس کو دیکھتے ہی ڈانٹنے لگا۔ وہ خاموشی سے سب کچھ سُنتا رہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ پروفیسر کے سامنے دلائل پیش کرنے کا کوئی فائدہ نہیں پروفیسر اسد نے آخر میں کہا۔

"آخر تم اس بازاری عورت کی بازاری لڑکی کے پیچھے کیوں پڑے ہُوتے ہو ــــ تمہاری وجہ سے مَیں اتنا بدنام ہوا ہُوں۔ اگر تم اس لڑکی کو نہیں چھوڑ سکتے تو تم ایسے نامجاز

کے لیے میرے گھر میں کوئی جگہ نہیں "۔

وہ خاموش تھا۔

"تم جو چاہو اپنے ساتھ لے جا سکتے ہو۔"

پروفیسر اسد نے خدا معلوم غصے میں کہا تھا یا سنجیدگی سے، بہر حال مجی اٹھا۔ اس نے اپنی الماری کھول کر کلثوم کے خطوط لیے اور اپنے باپ سے کچھ کہے بغیر مکان سے باہر آگیا۔ وہ خود اس قبرستان میں نہیں رہنا نہیں چاہتا تھا جہاں اس کو ہر وقت اپنی محبت کی قبر پہ جلتی ہوئی اگر بتیوں کی خوشبو آتی رہتی تھی۔

کلثوم کے خط اس کے سینے کی جیب میں دھڑک رہے تھے، وہ آخری بار اس سے ملنا چاہتا تھا، آخری بار ——— پھر شاید زندگی میں اس سے کبھی نہ مل سکے ——— وہ اس کو صرف بتانا چاہتا تھا کہ دیکھ کلثوم ——— تمہارے لیے میں اپنے گھر سے بھی نکال دیا گیا ہوں اور تم ——— آخر تم لڑکی ہو، قلوپطرہ اور ہیلن آف ٹرائے کی جنس سے ——— جو کسی کی بھی نہ ہو سکیں۔

پھر آدھی دُنیا کو آسمان سے اُبلتے ہوئے اندھیروں نے لپیٹ لیا۔ اور وہ اس کے گھر کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے ملنے کے پیچیدہ مسئلے کا حل سوچنے لگا۔ اس نے کلثوم کے نوکر کو دیکھا جو ہاتھ میں کٹورا پکڑے دودھ دہی کی دوکان سے آرہا تھا۔ اس نے کاغذ پر کچھ لکھا اور اس کے نوکر کو بلا کر دے دیا۔ قریباً پانچ منٹ بعد نوکر نے آکر کہا۔

"گیارہ بجے احاطے میں۔"

گیارہ بجے مکان کی پچھلی طرف احاطے میں کلثوم آئی۔ مجی لمحہ بھر کے لیے اپنی نگاہوں سے اس کے دِل کو ٹٹولتا رہا۔ پھر جانے اس کو کیا سوجھی کہ اپنی جیب سے تمام خط نکال کر اسے دیتے ہوئے کہا:

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم بھی اپنے آپ کو اپنی بہنوں کی طرح شوکیس میں بکنے

کے لیے رکھ چھوڑا ہے ــــ مجھے افسوس ہے کہ مَیں قیمت ادا نہ کر سکا۔"

"مجی ــــ! مجھے دُنیا کی سب سے عزیز چیز کی قسم، مجھے تمہاری قسم مَیں بے قصور ہُوں۔"

"اپنی ماں سے کہو کہ تمہارے خط فریم کرا کے ڈرائینگ روم میں لٹکا دے، تاکہ لوگ دیکھ سکیں کہ اس کی بیٹی محبت کرنے میں کتنی ماہر ہے۔"

"مجی ــــ"

"مَیں جا رہا ہُوں ــــ"

"کہاں ـ؟"

"مجھے علم نہیں۔"

یہ کہہ کر وہ جانے کے لیے مڑا۔ کلثوم نے اس کا بازو تھام کر کہا:

"مَیں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

دوسری صبح جب مسٹر اکمل کو معلوم ہُوا کہ تیسری تکبیر کوئی دوسرا امام پڑھ گیا ہے تو اس کو یُوں محسوس ہُوا جیسے اس کے گنبدوں میں تریڑیں آ گئی ہیں۔

مسٹر اکمل اسی روز اپنے تباہ شدہ معبد کو لے کر کسی دوسرے محلّے میں چلے گئے۔

زرد کونپل

کچھ ایسے ہی دِنوں میں جب کہ شبنم میں گھُلی ہُوئی صبحیں اپنے لحاف اتار کے نیم گرم دِنوں کے صندوقچوں میں بند کر رہی تھیں۔ کچھ ایسے ہی دنوں میں جب کہ باہر باغیچے کی ننھی ننھی کیاریوں میں نونائیدہ کلیوں کی آنکھیں کھل رہی تھیں اور نرم نرم سبزی مائل زرد کونپلیں زندگی کا پہلا سانس لینے کی کوشش کر رہی تھیں اور گلاب کی خشک بانہوں میں مارچ نے گہرے سُرخ کنگن پہنا دِیے تھے تو اسی کمرے میں کھڑکی سے دبے پاؤں داخل ہوتی ہُوئی بہاروں کی خوشبو نے ڈیٹول کی بُو کو گلے لگایا تھا اور یہیں پہ میری خشک بانہوں کو بہاروں نے مارچ کے ذریعے سُرخ چوڑا تحفتاً دیا تھا۔ کچھ ایسے ہی دِن تھے جب اسی کمرے میں ایک زرد کونپل نے زندگی کا پہلا سانس لیا تھا اور میرے ڈوبتے ہُوتے سانس میں گھُل کر اُسے نئی باس بخشی تھی۔

مَیں آج بھی اسی کمرے میں اُداس بیٹھی ہُوں اور میری نظریں پریشان ہَواؤں کی طرح کبھی گھبرا کر جلدی جلدی اور کبھی مایوسی میں آہستہ آہستہ باغیچے میں پھر رہی ہیں

اور پتی پتی کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کے پوچھ رہی ہیں کہ میری کونپل کہاں ہے جس نے کہ تمھارے ساتھ ہی پہلی مرتبہ آنکھ کھولی تھی اور جس نے تمھاری ہی رفاقت میں مُسکرانا سیکھا تھا۔ لیکن ہر کلی، ہر پتی مجھے حیرانی سے دیکھتی ہے —— تم کس کی باتیں کر رہی ہو، ہم تمھیں نہیں جانتیں —— ہم تمھاری کونپل کو بھی نہیں جانتیں —— ہم تو کل ہی اس دنیا میں آئی ہیں —— ہمارے قدموں میں بکھرے ہوئے ان خشک پتوں میں دیکھو —— ان سے پوچھو کہ تمھاری کونپل کہاں ہے۔

مَیں نے ان خشک پتّوں سے بھی پوچھا ہے لیکن ان کے چہرے بھی زرد ہیں۔ انھیں بھی تمھارے متعلق کوئی پتا نہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شاید تُم ان پتّوں میں چھپے ہو جو کہ ان کے اپنے بوجھ تلے دبے ہیں —— ان کے نیچے کئی تہیں ہیں —— سات، آٹھ، دس، خدا معلوم کتنی —— مگر ان تہوں کو بھی تمھارا کیا پتا ہوگا کیونکہ بہاریں تمھیں ان کے ساتھ لائی تھیں۔ اور انھوں نے تمھیں مُسکرانا بھی سکھایا تھا لیکن تب میرے بازو پودوں کی بانہوں سے زیادہ طاقت ور تھے۔ کہ خزائیں بہاروں کے اس تحفے کو چھین نہ سکیں —— اگر مجھے پتہ ہوتا کہ خزائیں دس سال کے عرصے میں تمھیں چاٹ چاٹ کے ختم کر دیں گے تو میں —— تو مَیں —— تو پھر بھی مَیں کیا کر سکتی تھی!

کتنی عجیب سی بات ہے کہ ابھی پچھلے ہفتے آج ایسی اداس صبح کو تم نے مُسکرا کے مجھ سے کہا تھا۔

"امّی جی! آپ ہر وقت اُداس رہا کرتی تھیں نا —— فکر مند سی —— کل سراج بابا نے مجھے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ نمازیں بے حد رویا بھی کرتی ہیں، تو آج رات مَیں نے بھی سچے دل سے دُعا کی کہ اللہ میاں مجھے اچھا کر دے تاکہ میری اُمّی اداس نہ رہا کریں —— دیکھیے —— اب مَیں ٹھیک ہو گیا ہُوں۔"

تم نے بستر پر کہنیاں ٹیک کر اُٹھنے کی کوشش کی تھی اور مَیں نے تکیے کا سہارا

دے کر بٹھا دیا تھا اور پھر جلدی سے تمھیں تھرمامیٹر لگایا تھا —— تمھارا بخار ننانوے سے ذرا اُوپر تھا۔ میں نے تمھارے زرد گالوں پر ہلکی سی سُرخی دیکھ کر فوراً ایک اور سیاہ بکرا صدقہ کیا تھا اور ——

اور کتنی عجیب سی بات ہے کہ اُسی تاریک سی شام نے تمھارے چہرے کی سُرخی چھین کر تمھاری آنکھوں کو اپنی تاریکی دے دی تھی۔ تم بستر پر سوئے ہُوئے تھے۔ تمھاری بڑی اور چھوٹی خالہ اور دوسرے لوگ جانے کیوں اتنی بُری طرح رو رہے تھے۔ تمھارے ابا کا رومال بھی بار بار ان کی آنکھوں تک جاتا تھا۔ مَیں نے تمھارے سرہانے بیٹھی روتی ہُوئی منّی (تمھاری چھوٹی خالہ کی لڑکی) کو گود میں لیے یہ سب کچھ خواب میں دیکھ رہی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ منّی کو بھی کیا ہو گیا ہے۔ وہ اس طرح رو رہی تھی جیسے اس کے سارے کھلونے ٹوٹ گئے ہُوں۔ مَیں نے ان سب کو رونے سے منع بھی کیا کہ کل تمام دن کی تڑپ اور پھر تھوڑی سی نیند کے بعد آج شام تو تم اتنے سکون سے سوئے ہو۔ مگر ان لوگوں کو کچھ خیال نہ تھا۔ شاید اس لیے کہ میرے سوا اور کوئی بھی تمھاری اَمّی نہیں تھی۔ اگر ہوتی تو یقیناً ان کی اُنگلیوں میں بھی تمھاری نبض ضرور دھڑکتی —— مجھے حیرت تو یہ ہے کہ تم سے اتنے پیار کے باوجود تمھارے اَبا بھی ان لوگوں میں مل گئے تھے۔

مَیں اسی کمرے کی کھڑکی میں کھڑی تمھیں پپی سے کھیلتے دیکھ رہی تھی کہ میری نظریں کوٹھی کے دروازے کی طرف اُٹھ گئیں۔ بہت سے لوگوں کے آگے، چار آدمی کٹہرے والی چارپائی پر کسی کو سیاہ چادر تلے چھپائے لیے جا رہے تھے —— ان میں تمھارے اَبا بھی تھے —— آہستہ آہستہ —— سازشیوں کی طرح —— چپ چپ —— صرف قدموں کی سرگوشیاں تھیں۔ مَیں نے ان روتے ہُوئے قدموں سے گھبرا کر پھر دلان میں دیکھا۔ پپی اپنی دونوں اگلی ٹانگوں پر سر رکھے اداس سا بیٹھا تھا —— تم وہاں نہیں تھے۔ میری نگاہیں چیخ چیخ کر تمھیں پکارتی رہیں۔ تمھیں ان پھولوں میں ڈھونڈتی رہیں جن میں تم

چاندنی راتوں میں پپی کو ساتھ لے کر چھپی ہوئی پریاں تلاش کیا کرتے تھے ــــ میری نظریں اب بھی لان میں آوارہ پھر رہی ہیں، اب بھی ان پھولوں میں تمھیں ڈھونڈ رہی ہیں ــــ شاید تم واقعی ان پریوں میں جا ملے ہو جو تمھارے اپنے قول کے مطابق چاندنی راتوں میں پھولوں کی پنکھڑیوں میں آنکھ مچولی کھیلا کرتی ہیں اور جنھیں کوئی دیکھے تو نظروں سے غائب ہو جاتی ہیں ــــ پپی اب بھی اسی طرح چاندنی راتوں میں پھولوں کی کیاریوں میں گھوما کرتا ہے اور حسبِ معمول سارا سارا دن اپنی اگلوں ٹانگوں پر منہ رکھے تمھارے سکول سے لوٹنے کا منتظر رہتا ہے ــــ فرق صرف اتنا ہے کہ اب اس کی چمکیلی آنکھیں سیلاب میں رہنے کی وجہ سے بجھ سی گئی ہیں ــــ مَیں تو یہ سوچتی ہوں کہ جب چاند بھی تمھارا انتظار کر کے چلا جائے گا اور ٹمٹماتے ہوئے ستاروں کی رفاقت کے باوجود بجھتی ہوئی راتیں سیاہ ہو جائیں گی تو پپی کیا کرے گا؟ مَیں کیا کروں گی؟ اندھیری راتوں میں تو پریاں نہیں اُترتیں نا (کیونکہ چاندنی کی رتھ جانے کہاں چلی جاتی ہے)۔

سُورج تو رات کے من میں آگ لگاتا رہا ہے اور لگاتار ہے گا، لیکن رات کے آنسو کسی کو بھی تر نہیں کریں گے ــــ ستاروں کو بھی نہیں، رات کی آنکھوں کو بھی نہیں کیونکہ یہ آنسو خاک ہیں۔ کبھی کبھی چاندنی راتیں بھی سیاہ ہوتی ہیں اور پریاں اندھیری راتوں میں نہیں اُترا کرتیں ــــ مارچ ہمیشہ بہاروں کو تحفہ دیتا رہا ہے اور دیتا رہے گا۔ لیکن خزائیں اس تحفے کو چرا لے جاتی ہیں ــــ مَیں خزاں ہوں اور پپی تمھارا کُتا ہے ــــ وہ کسی کے ہاتھ سے دُودھ نہیں پیتا۔ جب تم سکول سے آؤ گے تو وہ دُودھ پی لے گا۔ مَیں تمھاری امّی ہوں، تم بہاروں کے تحفے تھے اور مَیں نے مارچ سے وعدہ کیا تھا کہ ہمیشہ تمھیں سنبھال کر رکھوں گی اور کوئی تحفہ نہ لُوں گی مُبادا تمھاری طرف سے غفلت ہو جائے۔ اس کے بعد مَیں نے ہمیشہ مارچ کو مایوس کیا ہے ــــ اور اب تو مَیں خزاں ہوں۔

میرے زین! میرے لال! تم اسکول سے کب لوٹو گے؟ کھانا میز پر پڑا ٹھنڈا ہو رہا ہے اور مجھے بڑی شدت سے بھوک لگی ہے لیکن مجھے تمہارے بغیر کھانے کی عادت نہیں ہے، تمھیں یاد ہے نا کہ اپنے سکول سکاؤٹنگ کیمپ کے سلسلے میں تم گرمیوں کی چھٹیاں پہاڑ پر گزارنے کے لیے گئے تھے۔ جب اسکول کی بس تمھیں لینے کے لیے آئی تھی تو پپی تمہاری نیکر کا پائنچہ نہیں چھوڑتا تھا۔ اور جب تم بڑی مشکل سے سوار ہوئے تھے تو وہ مجھ سے زنجیر چھڑا کر بس میں چڑھ گیا تھا اور پھر تمہارے انگریز ہاؤس ماسٹر نے جانے کس جذبے کے تحت پپی کو تمہارے ساتھ جانے کی اجازت دے دی تھی۔ سمر کیمپ میں جانا تمھارے لیے ضروری نہیں تھا۔ لیکن جمی (تمھارے ابا) کا خیال تھا کہ گرمیوں کے میدانوں کی نسبت پہاڑ پر تمہاری صحت بہتر رہے گی اور تم دوسرے لڑکوں کے ساتھ مل کر اچھی طرح پڑھ بھی سکو گے۔ ان کا یہ خیال ٹھیک تو تھا۔ لیکن میں —— جانے مائیں اتنی جذباتی کیوں ہوتی ہیں۔ تم سے جدائی کے تصور ہی سے میں اتھاہ خلاؤں میں گھر جاتی تھی کہ میں تمھارے بعد کیا کروں گی۔ میں نے جمی سے کہا کہ صحت کا کیا ہے۔ سبھی لوگوں کے بچے تو پہاڑوں پر نہیں جاتے، رہا پڑھائی کا سوال، تو یہاں ٹیوشن رکھی جا سکتی ہے —— جمی کچھ بگڑ سے گئے کہ میں تمہاری عادتیں خراب کر دوں گی، تم سے خود اعتمادی چھین لوں گی —— بچوں کو والدین سے علیحدہ رہنے کی ٹریننگ بھی ہونی چاہیے۔

ان کا یہ کہنا بھی درست تھا کیوں کہ زندگی کا کچھ پتا نہیں ہوتا، جانے کس وقت سکوت کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ تمھارے لیے میرے اور جمی کے بغیر زندگی گزارنے کا فن سیکھنا ضروری تھا —— عمر کی قبر میں جتنے سال اترتے ہیں اتنی ہی یہ قبر چھوٹی ہو جاتی ہے۔ تمھاری نسبت ہمارے زیادہ سال اس قبر میں اتر چکے تھے۔ اسی لیے میں بھی جمی کی اس بات کی بھی قائل ہو گئی۔ اور اگر نہ بھی ہوتی تو تمھیں کیوں کر انکار کر سکتی تھی۔ تم نے جو اتنی معصومیت سے منت بھرے لہجے میں کہا تھا —— امی پلیز! میرا جانے کو بہت جی چاہتا ہے میں

وعدہ کرتا ہوں کہ رات کو اوولٹین ملک پینا نہیں بھولوں گا ـــــ کھانے کے بعد مینا ڈیکس ضرور پیوں گا اور اچار بالکل نہیں کھاؤں گا۔

مَیں نے اپنے دِل سے تمہارے پیار کا سارا بوجھ اُٹھانے کی کوشش کرتے ہُوئے تمھیں اجازت دے دی تھی اور اس وقت، جب کہ پپّی ضد منوا کر تمہارے ساتھ ڈیزل کے دُھوئیں میں اوجھل ہو گیا تھا۔ تو مَیں تمہارے انتہائی پیارے سے چہرے پر پھیلی ہوئی الوداعی مسکراہٹ کو اپنی آنکھوں میں سنبھال کے بھاگتی ہُوئی کمرے میں لَوٹ آئی تھی اور بلا مقصد دوسرے کمروں میں پھرتے ہُوئے تمہارے پُر اعتماد الفاظ دُہرائے تھے۔

ـــــ "اُمّی! آپ بالکل اُداس نہ ہوں۔ مَیں آپ کو ہر روز ایک خط لکھا کروں گا ـــــ اور مَیں بھی بالکل اُداس نہیں ہوں گا ـــــ" تمہاری آواز بڑی صاف تھی۔ لیکن مَیں جانتی تھی کہ تمہارا گلا ضرور رندھا ہو گا۔ تم محض اس لیے مُسکرا رہے تھے کہ کہیں مَیں اُداس نہ ہو جاؤں۔ تُم نے مجھے تسلّی دینے کی خاطر ضرور اپنے آنسو پیئے ہوں گے ـــــ کیونکہ مَیں نے بڑی مشکل سے اپنے آنسوؤں سے اپنے حلق کو تر کیا تھا۔ اور جب مَیں کمروں میں اور لان میں پھر پھر کے (یہ سوچتی ہُوئی کہ مجھ سے تو پپّی اچھا ہے) تھک گئی تھی تو تمہارے پلنگ پر بیٹھ کے بے حد روئی تھی۔ جمی بھی دفتر گئے ہُوئے تھے۔ اور اتنے بڑے گھر میں میری آنکھیں خشک کرنے والا کوئی نہ تھا۔ تمہارے بچپن کے کھلونے بھی میرا دل نہ بہلا سکے (اگر مَیں جمی کی بات مان لیتی تو تب میرے پاس کم از کم دو اور تم ایسے جیتے جاگتے کھلونے ہوتے ـــــ لیکن مَیں نے محض تمہاری خاطر وہ کھلونے نہ لیے۔ مگر تم ـــــ تم چلے گئے۔ کیوں کہ تم اتنی نہیں تھے۔ میرے لعل تھے) ـــــ جب شام کو وہ آئے تو ان سے باتیں کر کر کے بڑی دیر بعد میرے دِل کا بوجھ ہلکا ہُوا تھا۔ لیکن کھانا پھر بھی نہ کھا سکی۔ ـــــ کیوں کہ تمہارے بغیر کھانا کھانے کی مجھے عادت نہیں۔

تم کیا جانو ـــــ مَیں نے تمھیں کتنی مشکلوں کے ساتھ اللہ میاں سے حاصل

کیا تھا۔ اتنی منتیں مانیں —— اتنی نیازیں دیں —— لیکن تم تھے کہ تمہارا ہیولا نہ بنتا تھا۔ پھر بہت عرصہ بعد لیڈی ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ میرے جسم میں دوسرا دل دھڑکنا شروع ہو گیا ہے۔ جمی نے میرے کمرے میں انتہائی خوبصورت بچوں کی لاتعداد تصویریں لا کر لٹکا دیں تاکہ ان خوبصورت تصویروں کا خوشگوار تاثر میری آنکھوں سے تم تک پہنچے اور تمہارا چہرہ بھی انہی بچوں میں سے کسی ایک کی طرح پیارا ہو —— جانے کیوں مجھے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ کہیں خدانخواستہ میرے دل کو ٹھیس نہ لگ جائے —— بند نہ ہو جائے، بچی —— میں نے آج تک اپنے دل کی بھی اتنی پرواہ نہیں کی تھی (اگر تمہیں یقین نہیں آتا تو جمی سے پوچھ لو کہ پہلی مرتبہ جب میرے آپا اور امی نے انہیں یہ کہہ میرا رشتہ دینے سے انکار کر دیا تھا کہ ہم اپنی ذات میں شادی کرتے ہیں تو میرے دل نے کتنی ہمت سے اس ٹھیس کو برداشت کیا تھا لیکن تمہاری تو بات ہی اور ہے تم تو میری رُوح اور میرے وجود ہی کے ایک حصے ہو —— میں اکثر تنہائی میں بیٹھی اپنے دوسرے دل کی دھڑکن سُنتی رہتی اور تمہارے لیے ننھے ننھے پوتڑے سیتی ہوئی سوچتی رہتی کہ تم بڑے ہو کر ڈاکٹر بنو گے، انجینئر بنو گے —— وزیرِ اعظم بنو گے —— خیالوں کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ بادشاہوں کی ماؤں سے لے کر اتنے سارے گداگروں کی ماؤں تک ہر ایک کی ایسی ہی خواہشات ہوتی ہوں گی۔

پھر ایک دن تم تشریف لے آئے اور اس دن مجھے تخلیق کے صحیح معنی معلوم ہوئے۔ اگر کسی کے جسم کے حصے کو کھینچ کر علیحدہ کیا جائے تو اسے کتنی تکلیف ہو بس مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ میرے وجود کے ساتھ جڑے ہوئے ایک دوسرے وجود کو علیحدہ کیا جا رہا ہے —— درد —— چیخیں —— آنسو —— لمحہ بھر کے لیے مجھے اپنے آپ سے بھی خوف زدہ نفرت سی ہو گئی۔ پھر ایک تخلیق کے احساس سے مجھے عجیب طرح کا سکون ملنے لگا۔ لیکن آہستہ آہستہ —— رفتہ رفتہ ——

میرے آنسو مُسکرانے لگے اور مجھے اتنی مسرت حاصل ہُوئی کہ اللہ میاں کو دُنیا بنانے میں بھی حاصل نہیں ہُوتی ہو گی، تمھارے آنے سے پہلے بہت سے سوچے ہُوئے ناموں سے ایک اچھا سا نام تمھارے لیے چنا —— تم زین العابدین تھے —— زین۔

زَین —— زَین، میرا زین —— میرا لعل، میرا راجہ —— اللہ میاں کو اپنی تخلیقات کتنی پیاری ہیں، جبھی تو اس نے اس دُنیا ایسی اور کوئی دُنیا نہیں بنائی۔ اس دُنیا سے اتنی مایوسی کے باوجود اسے تباہ نہیں کیا —— تخلیق آخر تخلیق ہے، خالق چاہے انسان ہو یا خُدا —— اتنی محنت اور صعوبتوں کے بعد انسان کوئی چیز حاصل کرے تو اس سے اتنی شدید محبت ہو جاتی ہے کہ تمام تر توجہات اسی پر مرکوز ہو جاتی ہیں —— اگرچہ تم میری اُمیدوں کے برعکس میرے کمرے میں لٹکی ہُوئی بچّوں کی تصویروں کی طرح نہ تھے —— بلکہ بے حد کمزور —— بہت ہی زرد۔ مگر پھر بھی تم میرے تھے —— میرے اپنے —— شاید اس لیے بھی میں دوسری تخلیق کی قائل نہیں تھی —— مُبادا پہلا احساس ہٹ جائے —— اور بھی زرد ہو جائے۔

سب سے پہلی جو تمھاری چیز پسند آئی وہ تھی تمھاری موٹی موٹی آنکھیں —— سیاہ —— گہرے، بے حد گہرے سمندر —— ذہانت کے سیپ چھپائے —— تم سب کو یُوں گھورتے تھے جیسے انھیں اچھی طرح جانتے ہو۔ جب تمھیں بھوک لگتی تھی تو تم عام بچّوں کی طرح رونے کے بجائے اپنی ننھی مُنّی مٹھیوں سے میرے سینے کو جگاتے۔ میں نے تمھیں کبھی روتے نہیں دیکھا تھا۔ جب بھی تمھیں کوئی تکلیف ہوتی تو تم مجھے بڑی رحم طلب نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ کبھی کبھار جب میں تم سے دُور ہوتی اور تمھیں میری ضرورت ہوتی تو تم مجھے چیخ چیخ کر بلاتے (رو کر نہیں) اور مجھے دیکھتے ہی خاموش ہو کر اپنی مخصوص تکلیف زدہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگتے تھے۔ ایک مرتبہ جب تمھیں پیٹ کی بے حد تکلیف تھی (جس کا احساس تم نے مجھے اپنے پیٹ پر مٹھیاں مار مار کر دلایا تھا

اور تم تب بھی نہیں روئے تھے) تو میں نے ساری ساری رات کمرے میں چکر لگاتے ہوئے گزار دی تھی۔ سبھی مائیں ایسی ہی کرتی ہوں گی۔ لیکن میں صرف اس لیے جاگتی رہتی تھی کہ تمھیں رونے کی عادت نہیں تھی۔ جانے اور بچوں کی طرح تمھارے پاس رونے کی زبان کیوں نہیں تھی۔ شاید اس لیے کہ تم نے پہلا سانس نرس کے تھپکانے کے باوجود روتے ہوئے نہیں لیا تھا۔ اور منہ کے ذریعہ تمھارے پھیپھڑوں کو زندگی دی گئی تھی۔

جمّی کے اصرار کے باوجود میں نے تمھارے لیے کوئی آیا نہیں رکھی تھی۔ میری سہیلیوں کو سوشل شاموں سے میری غیر حاضری کے متعلق بڑی شکایت تھی۔ سبھی یہی کہتی تھیں کہ تم نے کوئی انوکھا بچہ جنا ہے —— لیکن وہ نہیں جانتی تھیں کہ اتنی محنت اور تکلیف کے بعد حاصل کی ہوئی چیزوں کو دوسروں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا —— آیاؤں کی ممتا میرے زین کے لیے کتنی ہوگی —— میرے زین کی زبان کو کون سمجھ پاتا۔ جن احساسات اور جذبات سے میں اپنے لعل کے زرد چہرے کے لیے گلاب کی سرخی اور بہاروں کی باس کو اپنے بس میں کر سکتی تھی اور کون کر سکتا تھا۔ مجھے تو ان امیوں پر حیرانی ہوتی ہے جن کی روح اپنے زینوں سے زیادہ سوشل حلقوں سے رس حاصل کرتی ہے جن کے زین آیاؤں کی سرد گودیوں سے حدت حاصل کرنے کی کوشش میں لاشعور کی گود میں سو جاتے ہیں۔ اور تمام عمر اپنے ذہن کی پرامبولیٹر میں لیٹے انگوٹھا چوستے رہتے ہیں —— میں تمھیں ایک عظیم انسان دیکھنا چاہتی تھی، تمام منفی احساسات سے پاک —— وہ منفی احساسات جو کہ جھولے کی گود سے جنم لیتے ہیں اور انسان کو بڑے کربناک انداز سے دھکیلتے ہوئے قبر کی کوکھ تک لے جاتے ہیں۔ غالباً ہر ماں کی یہ خواہش ہوتی ہوگی کہ ان کے بچے عظیم انسان بنیں —— لیکن میرے زین! کتنی مائیں اس کے لیے اپنی مسرتوں کو قربان کرتی ہوں گی، کتنی آیائیں تشنہ گودیاں لے کر بچے کھلاتی ہوں گی —— کتنے بچوں کو سرد لبستر میں اپنی امیوں کا انتظار نہیں کرنا پڑتا ہوگا تم یہ نہ سمجھنا کہ میں نے تمھیں اپنی ممتا کے جھولے میں

سلانے کی کوشش کی تھی، مَیں نے تو جُھولے کے ہلکوروں سے تمھیں زندگی کی اونچ نیچ سمجھائی تھی ــــ وہ جُھولا، جو کہ مَیں نے خود جُھلایا تھا۔ وہ لوریاں جو کہ مَیں نے خود گائی تھیں۔ مَیں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا تھا ــــ مَیں نے تو اپنی ممتا کے سیلاب کے ریلے بند باندھے تھے۔ شاید اسی پیار اور محبت کا نتیجہ تھا کہ تم نے آج تک میری اور جمّی کی حکم عدولی نہیں کی تھی۔ تم ہلکی سی ضد بھی کرتے تھے لیکن جب مَیں تمھیں بڑے پیار سے تمھاری بہتری کے بارے میں سمجھاتی تو تم فوراً سمجھ جاتے کہ مجھے تم سے پیار ہے اور انسان اپنی پیاری چیزوں کے لیے ہمیشہ بہتری سوچتا ہے (تم کتنے اچھے تھے) ــــ مجھے یاد ہے کہ جب تم بہت چھوٹے تھے تو ایک مرتبہ تم نے آتش دان میں سُلگتے ہُوئے انگاروں کی روشنی سے متاثر ہو کر اپنی ننھی سی انگلی سے اشارہ کیا تھا اور گھٹنوں پر چلتے چلتے وہاں تک پہنچ بھی گئے تھے اور بڑی حیرانی سے میری طرف دیکھ کر کچھ کہا تھا۔ تم نے دوبارہ آتشدان کی طرف گھٹنے بڑھائے تو مَیں سمجھ گئی کہ تم انگاروں سے کھیلنا چاہتے ہو۔ مَیں نے تمھیں اپنی گود میں بٹھا کر بڑی خوف زدہ آواز میں کہا ــــ "نہ بیٹے ــــ انگارا! جلا دے گا ــــ اُف ــــ اُوئی ــــ نہ ــــ نہ"

تم اور بھی حیران ہو گئے۔ شاید تم میرے چہرے کے خوف سے سب کچھ سمجھ گئے تھے۔ اور مجھے یُوں دیکھا تھا ــــ "سچ!"

"ہاں ــــ زین جی ــــ انگارہ!"

"اں ــــ آنغ ــــ ع ــــ؟"

تم نے بڑی عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے رہے، مگر تم نے ان کی دوبارہ خواہش نہ کی۔

اب بھی مَیں اس خالی آتشدان میں جلتے ہُوئے انگارے دیکھ رہی ہُوں ــــ تم ان کی طرف بڑھ رہے ہو۔

زین! نہ بیٹھے ـــــ انگارہ اچھال دے گا ـــــ تم جل جاؤ گے ـــــ میں جل جاؤں گی ـــــ میں جل گئی ہوں۔ راکھ ہو گئی ہوں ـــــ آتشدان خالی ہے ـــــ جب سردیاں آئیں گی تو بھی اس میں آگ روشن نہیں ہو گی ـــــ کیونکہ تم گھٹنوں پر چلتے ہوئے آگ کی طرف نہیں بڑھو گے ـــــ آتشدان کے سامنے بکینوتسیٹ اور دوسرے کھلونوں کی گراؤنڈ ویران ہو گی ـــــ تم اس کے سامنے بیٹھے اپنی کاپیوں کتابوں میں گھر سے سکول کا کام نہیں کر رہے ہو گے۔

تمھارا پپی سارا دن گراؤنڈ میں اپنے اگلے پیروں میں منہ دفن کیے بیٹھا رہے گا۔ چاندنی راتوں میں تنہا۔ مجھے بھی پھولوں کے تختوں میں پاگل کر دے گا اور تاریک راتوں میں سرد آتشدان کے سامنے میری طرح شعلوں کا ناچ دیکھا کرے گا ـــــ اسی لیے انگارے نہیں بھڑکیں گے کیونکہ میں راکھ ہوں ـــــ راکھ اور کیا جلے گی ـــــ پپی کوک بھرا کھلونا ہے۔ وہ ہر حرکت اتنی باقاعدگی سے کرتا ہے جیسے تم اُس کے ساتھ ہو لیکن یہ کمرہ اُس وقت منجمد رہے گا اُس وقت تک قبرستان بنا رہے گا، جب تک تم سکول سے نہیں لوٹتے ـــــ

زین! تم نے تو کبھی اتنی دیر نہیں کی تھی۔

تمھارے اسکول میں یقیناً کوئی تقریب ہو گی (مگر تم تو ہمیشہ مجھے بتا کر جایا کرتے تھے، تم بڑے نافرمانبردار ہو گئے ہو) جب تم لوٹو گے تو میں تمھیں گھر سے دیر تک باہر رہنے کی بُرائیاں ایک بار پھر سمجھاؤں گی۔

تمھیں سکول میں داخل ہونے کا کتنا شوق تھا ـــــ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب ساتھ والی کوٹھی کے مسٹر و مسز عارف کے بچوں کے لیے اسکول بس آیا کرتی تھی تو تم پلنگ پر کھڑے ہو کر کھڑکی سے انھیں بڑی دلچسپی کے ساتھ دیکھا کرتے تھے۔ اور ان کے جانے کے بعد تم پوچھا کرتے تھے کہ لالی، پپو اور گگو کہاں گئے ہیں۔ میں تمھیں سمجھاتی کہ اس بس میں بیٹھ کر یہ سب اس جگہ گئے ہیں جہاں سے یہ بڑے ہو کر اور بہت قابل بن کر نکلیں گے۔

تم اپنے کھلونوں کو اکتائی ہوئی نگاہوں سے دیکھ کر پوچھتے۔

"امّی ——— میں وہاں کب جاؤں گا؟"

"ابھی ——— بس تھوڑے ہی دِنوں میں۔"

اس وقت تم چار سال کے تھے۔ تمہارا شوق دیکھ کر میں نے تمہیں نرسری کلاس میں داخل کرا دیا تھا۔ یُوں تو ہر امّی کا یہی خیال ہوتا ہوگا کہ ان کا بچّہ سب سے ذہین ہے، لیکن تمہاری استانی کا بھی یہی خیال تھا کہ اس نے تم ایسا بچّہ کبھی نہیں دیکھا ——— جانے بعض وقت مجھے تمہاری ذہانت سے اتنا خوف کیوں آتا تھا ——— تمہارا اتنی جلد چیزوں کو سمجھ لینا ——— تمہارے دُنیا میں آنے سے لے کر پرندوں کی اڑانوں تک مختلف سوالات ——— مجھے محسوس ہوتا کہ تم میرے سامنے کھڑے کھڑے بوڑھے ہو گئے ہو۔

جب تک تم اسکول میں رہتے، گھر میں بڑی ویرانی سی چھائی رہتی۔ میں یُونہی نادان بچّوں کی طرح تمہارے کھلونوں والی الماری کے سامنے کھڑی رہتی۔ پھر دوپہر کو میں خود تمہارے لیے کھانا تیار کر کے کار میں لے کر تمہارے سکول جاتی۔ تمہارے بارے میں مجھے سوائے اپنے اور کسی پر اعتبار نہیں تھا۔ وہ ایک ایک لمحہ جو میں نے تمہارے لیے صرف کیا ہے وہ ایک ایک پل جو میں نے تمہارے انتظار میں گزارا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کے اَن گنت سالوں سے بھی زیادہ عزیز ہے ——— تمھیں ایک بڑی عجیب سی بات بتاؤں زین اپنا ہے جب میری شادی ہُوئی تھی اور ہنی مون کے بعد جمی دفتر جایا کرتے تھے تو ان کی غیر موجودگی میں بھی مجھے اپنا گھر بالکل ایسا ہی ویران دکھائی دیتا تھا ——— ایسی رُوح کو زخمی کرتی ہُوئی خاموشی، کمرے کی سمٹتی ہوئی دیواریں ——— اور جب میں گھبرا کے باہر باغیچے میں ٹہلنے لگتی تو شریر پھُولوں کی آنکھوں میں بھی خلا بھر آیا کرتے تھے۔ اتنے نوکروں کے باوجود جمی کا ہر کام میں خود ہی کرتی۔ تم پوچھو گے کیوں امّی! آخر آپ کیوں اتنی تکلیف اُٹھاتی تھیں۔؟

میرے لعل! اپنے لیے کام کر کے بھی کبھی کسی کو تکلیف ہوتی ہے ــــ جمی میرے جسم میں دھڑکتی ہوئی رُوح ہیں۔ اور تم ــــ تم میرے جسم اور اس رُوح کا نچوڑ ــــ تو پھر میری جان! مجھے تکلیف کیوں محسوس ہوتی ــــ تُمھیں تو میری اس اداسی اور بیقراری کا کوئی احساس نہیں، مگر جمی میری اداسی اور بے چینی کے احساس سے خود بھی پریشان ہو جاتے ہیں ــــ ہے نا بچوں والی بات ــــ انھوں نے مجھے مسز عارف سے متعارف بھی کرایا تاکہ میں ان کی غیر موجودگی میں اُداس نہ ہوا کروں لیکن میں مسز عارف کے پاس بیٹھی بیٹھی چلی آیا کرتی تھی ــــ واقعی انتظار میں ایک عجیب سا لطف ہوتا ہے!

جانے تمھارے آنے کے بعد جمی یہ کیوں محسوس کرنے لگے کہ میں اُن سے غافل ہو گئی ہُوں۔ شروع میں وہ مجھ سے کھنچے کھنچے رہنے لگے ــــ جانے اُنھیں یقین کیوں نہیں آتا تھا کہ ان کے لیے میری محبت ہمیشہ سحر ہی رہے گی ــــ سچ زرین! مجھ میں کوئی فرق نہیں آیا ــــ ہاں، یہ ضرور ہے کہ پہلے اُن کے لیے بے چین اور اُداسی رہتی تھی اور اب تمھارے لیے رہتی ہوں۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے۔ آخر تم ان کے بھی تو ایک جزو ہو۔ بس، وہ یہی کہتے کہ میں ان پر تمھیں ترجیح دیتی ہُوں اور ــــ اور ایسے ہی بے تُکے سے شکوے کیا تم نے خود کبھی غور نہیں کیا تھا کہ وہ میرے سامنے تم سے بڑی روکھائی برتتے اور جب میں پاس نہ ہوتی تو تم سے بے حد پیار کرتے (میں ایک دفعہ یکدم کمرے میں آئی تو وہ تمھیں سینے سے لگائے ہُوئے تھے۔ اس کے بعد میں نے دو ایک مرتبہ پردوں کے پیچھے چھپ کر بھی دیکھا تھا) اور پھر جب میرے سامنے تم سے پُوچھتے۔

"تمھیں ابا اچھے لگتے ہیں یا امی؟"

"دونوں ــــ" تم فوراً کہتے

"نہیں ــــ ایک بتاؤ۔"

تُم پہلے میری طرف اور پھر ان کی طرف دیکھ کر کچھ سوچتے اور پھر مُسکرا کر میری

طرف دیکھتے ہوئے کہتے۔

"ابا —"

"دیکھ لو —— بڑا بیٹا بنائے پھرتی ہو —— تم اسے جتنا بھی چاہو۔ اسے
میں ہی اچھا لگوں گا" یہ کہہ کر جیسے تم کو بڑا سکون حاصل ہوتا۔ میں جان بوجھ کر اداس
ہو جاتی۔ میں جانتی تھی کہ تم علیحدگی میں میرے گلے میں بانہیں ڈال کر کہو گے ——
"میں نے یوں ہی کہا تھا —— دراصل آپ مجھے بہت اچھی لگتی ہیں" —— مائیں تو یہ
سب کچھ جانتی ہوتی ہیں لیکن باپوں کو جانے کیا ہو جاتا ہے کہ اپنے بچوں میں ایک نظر انداز
کیے گئے بچے ایسا احساس طاری کر لیتے ہیں —— لیکن شکر ہے خدا کا، کہ تمہاری فرمانبرداری
اور قابلیت سے رفتہ رفتہ متاثر تمہارے لیے میرے پیار کے عادی ہو گئے۔ اپنے دوستوں
سے تمہارا ذکر اکثر کرتے، بڑے فخر سے تمہیں ان کے ساتھ ملاتے —— اور جب وہ لوگ
تمہارے اخلاق و آداب اور گفتگو سے مرعوب ہو کر تمہاری تعریف کرتے تو جیسے سینہ پھلا
کر مجھ سے کہتے —— "آخر کس کا بیٹا ہے!"
انہی دنوں کی بات ہے کہ گرمیوں کی ایک تاریک سی رات کو جب ہم باہر چارپائیاں
بچھائے ہوئے سونے کی کوشش کر رہے تھے تو تم نے مجھ سے کہا تھا۔
"امی جب چاند نہیں ہوتا تو یہ اتنے سارے ستارے کہاں سے آجاتے ہیں"
"چاندنی کی موجودگی میں ستارے تو وہیں رہتے ہیں لیکن ان کی چمک ماند پڑ جاتی
ہے۔"

چاند کی روشنی ان ستاروں سے زیادہ تیز ہوتی ہے نا"۔
"چاند کی روشنی ان ستاروں سے زیادہ تیز ہوتی ہے اور سورج کی چاند سے بھی زیادہ۔
—— اب تم سو جاؤ۔ تمہارے ابا نے چادر اوڑھتے ہوئے کہا تھا۔ میں جانتی تھی کہ تم اس
جواب سے مطمئن نہیں ہو گے اور صحیح جواب کے بغیر تم سو نہیں سکو گے۔ اس لیے میں

نے تمہاری طرف کروٹ لے لی تھی اور تم نے سرگوشی میں پوچھا تھا۔

"اُمّی ــــ! یہ اتنی ساری روشنی کہاں سے آتی ہے؟"

"یہ ساری روشنی انہیں اللہ میاں دیتا ہے" ــــ اس کے علاوہ میں اور کیا جواب دیتی۔

"اچھا ــــ! اُمّی۔ ہم وہاں جا سکتے ہیں۔؟"

"ہماری دُنیا بھی تو ایک ستارہ ہے"۔

"سچ۔!"

"اس لیے ان ستاروں میں جانے کی کیا ضرورت ہے" میں نے عجیب غیر مرئی احساس سے کانپتے ہوئے کہا تھا۔ کیونکہ میں نے بچپن میں پڑھا تھا کہ جب انسان ہمیشہ کے لیے سو جاتا ہے تو رات کو فرشتے انہیں آخری بیڈ رُوم سے نکال کر ستاروں کی سیر کے لیے لے جاتے ہیں اور اس وقت تک سیر کراتے رہیں گے جب تک سارے ستارے ہماری طرح نہیں سو جاتے۔

"نہیں امّی ــــ! میں نے یہ ستارہ تو دیکھ لیا ہے۔ اب میں یہ سارے ستارے دیکھنا چاہتا ہوں"۔

میں نے بڑے اعتماد سے اپنے آپ کو یقین دلاتے ہوئے کہا تھا ــــ "نہیں زین جی ــــ ابھی نہیں۔ جب تم ایک ہزار سال کے ہو جاؤ گے تو پھر تم خود ہی وہاں کی سیر کر لو گے"۔

"اچھا ــــ!" تم جانے کیوں ہنس دیے تھے۔

"تمھیں نیند نہیں آئی؟"

تُم نے میری بوجھل آنکھوں کو غور سے دیکھنے کے بعد مُسکراتے ہوئے کہا تھا ــــ

"مجھے بھی نیند آرہی ہے۔ اور تم نے اچھے اچھے خواب "وِش" کرنے کے بعد شب بخیر کہہ

کرآنکھیں موند لی تھیں۔ آدھی رات کو چادر اوڑھانے کے لیے میری آنکھ حسبِ معمولی خود بخود کھل گئی تھی تو تم بستر پر نہیں تھے۔ میرا دِل یکدم بیٹھ گیا۔ میں نے گھبرا کر تمہارے کمرے کی طرف دیکھا تو تمہارے کمرے میں جلتی ہوئی روشنی نے مجھے دوبارہ زندگی کی حرارت دی۔

——تم اپنی میز پر جھکے کچھ لکھ رہے تھے —— "ذین۔!"

"جی ——" تم نے چونک کر قلم رکھ دیا تھا۔

"کیا ہو رہا ہے —؟"

"امّی۔! میں نے آج ایک نظم پڑھی تھی —— میں نے ٹیچر جی سے پُوچھا تھا کہ یہ نظمیں کِس طرح لکھتے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ جو بھی خیال آتا ہے، پوئٹس انھیں لکھ لیتے ہیں۔ مجھے آج بڑے خیال آ رہے تھے۔ میں نے سوچا کہ میں بھی ایک نظم لکھوں۔ یہ دیکھیے اَمّی!"

میں نے دِل ہی دل میں تم پر واری ہو کر تمہارے ہاتھوں سے کاغذ لے لیا۔ تم نے لکھا تھا۔

ستارے آسمان کی کیاری کے پھُول ہیں۔
چاند ان کیاریوں کا مالی ہے۔
جو ان پھولوں کے کھلنے تک ان کی حفاظت کرتا ہے۔
اور جب یہ کھل جاتے ہیں تو انھیں نوچ کر
سُورج کے ڈرائینگ رُوم میں سجا دیتا ہے۔

ستارے ہماری دُنیا کی طرح دوسری دُنیائیں ہیں (جن کی آنکھیں زیادہ تر روشنی میں چندھیا جاتی ہیں۔)

جب زیادہ روشنی نہیں ہو گی اور میں ایک ہزار سال کا ہو جاؤں گا۔

تو مَیں ان دُنیاؤں کی سیر کراؤں گا۔
آسمان کی کیاری کے پھولوں میں پریوں کا ناچ دیکھوں گا۔
پھر واپسی پر چاند کی طرح ان پھولوں کو توڑ کے
اپنے ڈرائینگ روم میں سجاؤں گا۔
ستارو! تم میرا انتظار کرنا

تم نے میرے ہاتھ سے کاغذ لے لیا "بس امّی، آخری لائن رہتی ہے" اور تم نے لکھا تھا۔

کاش یہ ہزار سال، ہزار دِن بن جائیں۔

"اچھی ہے نا" میری سمجھ میں نہ آیا کہ مَیں کیا کہوں۔ مَیں نے تمھیں اپنے سینے سے چمٹا کر صرف بے حد چُوما تھا، پیار کیا تھا —— تم واقعی ہزار سال کے معلوم ہو رہے تھے۔ —— پھر تم بڑے اطمینان سے سو گئے۔ اور مَیں تمھاری نظم اپنے ہاتھ میں لیے جانے کیوں روتی رہی۔ آج تک میرے لیے اس رات کے آنسو مُعمّہ بنے رہے ہیں —— میرا جی چاہتا تھا کہ بس روتی ہی جاؤں، بے مقصد —— بلا وجہ —— تب تُم آٹھ سال کے تھے۔

اس کے بعد تم نے کتنی نظمیں لکھیں، پھولوں، پریوں، اپنے کھلونوں، پپی، میرے اور جمّی کے بارے میں تمھارا ارادہ تھا کہ جب تم بڑے ہو گے تو ان کی ایک کتاب چھپواؤ گے۔ —— تم ذہین تو تھے مگر اتنی ذہانت بھی کیا ہُوئی کہ اتنی چھوٹی سی عُمر میں تم نے ایسی باتیں شروع کر دیں۔ جمّی تم سے بہت خوش تھے انھیں تم سے صرف ایک شکایت تھی کہ جماعت میں تمھاری پوزیشن اچھی نہیں آتی۔ ان کا خیال تھا کہ تم ایسا لڑکا ہمیشہ اوّل آنا چاہیے۔ لیکن مَیں جانتی ہُوں کہ امتحان قابلیت کا معیار نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ مجھے ایک اور اطمینان بھی تھا کہ تمھیں کسی کی نظر نہیں لگے گی۔ اگر تم اوّل بھی آنے لگتے تو یقیناً تمھیں کسی کی نظر کھا لیتی،

یوں بھی میں اماں کے کہنے پر ہفتے میں دو تین مرتبہ تم پر سے مرچیں وار کے چولہے میں پھینکتی تھی)۔
مجھے اس چیز کا بڑی شدت سے احساس تھا کہ تم کبھی کبھی گھر میں بہت تنہا محسوس کرتے ہو۔ تم نے ایک مرتبہ مجھ سے پوچھا بھی تھا کہ دوسرے لوگوں کی طرح تمہارے بھی بہن بھائی کیوں نہیں۔ میں نے تمہیں بتایا تھا کہ بہن بھائی پیدا کرنا اپنے بس میں نہیں ہوتا۔ یہ تو اللہ میاں کی مرضی ہوتی ہے ——— یہ میں کیونکر بتاتی کہ اللہ میاں کی مرضی کے ساتھ میری مرضی بھی ضروری تھی ——— بُرا نہ منانا زین! تمہاری خاطر ——— صرف تمہارے لیے میں نے تم کو ایسے کھلونے تمہیں نہیں دیے گئے کیونکہ اس طرح تمہارے لیے میرے احساسات بٹ جاتے میری ممتا تقسیم ہو جاتی اور پھر تم بھی جمی کی طرح تنہا تنہا محسوس کرتے ———
اگر یوں ہو جاتا تو تمہارا خیال ہے کہ تم ایک عظیم انسان بن جاتے۔ تمہاری تنہائی کا کیا ہے۔ ہم ہیں! تمہارے دوست اور مسز عارف کی بچیاں ہیں۔ پپی ہے جو کہ مسز عارف نے تمہیں جنم دن کا تحفہ دیا تھا ——— پپی کے ذکر سے مجھے یاد آیا کہ تم اپنے نویں جنم دن پر بہت خوش تھے (غالباً اسی لیے اس دن کا ہر واقعہ مجھے اچھی طرح یاد ہے) تمہارے سب دوست اور سہیلیاں آئے ہوئے تھے۔ میں نے ہمیشہ کی طرح تمہارے ساتھ مل کر تمام کمروں کو سجایا تھا۔ اس دن تمہاری خالائیں آئی تھیں، اور جانتے ہو، اس دن بڑی عجیب سی بات ہوئی۔ تمہاری چھوٹی خالہ نے اپنی منّی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تمہیں سینے سے لگا کر مجھ سے کہا تھا کہ تم ان کے بیٹے ہو ——— میں تمہاری خالہ کا مطلب سمجھ گئی تھی اور ہم دونوں بہنیں کھلکھلا کر ہنس دی تھیں۔ پھر میں نے ان سے کہا کہ ہم پڑھے لکھے پرانے لوگوں کی طرح باتیں نہیں کرنا چاہتیں۔ زین جب بڑا ہو گا تو اپنے لیے کوئی بہتر فیصلہ کر سکے گا۔ لیکن پھر بھی تمہاری خالہ نے مجھ سے وعدہ لے لیا تھا کہ اگر میں نے کوئی فیصلہ کیا تو وہ منّی کے حق میں ہو گا ——— منّی بے حد پیاری، نیلی آنکھوں اور گھنے سیاہ بالوں والی ایک معصوم سی لڑکی ہے بڑی کلچرڈ سی ——— تمہارا اور اس کا جوڑا بہت اچھا

رہے گا۔ تمہارے لیے تمہاری خالہ کا تحفہ بہت اچھا ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ تم بڑے ہو کر بھی اس تحفے کو بہت پسند کرو گے کیونکہ جنم دِن کی شام کے وقت جب سارے بچے باہر لان میں مختلف کھیلوں میں مصروف تھے تو تم مُنّی کو اپنے کمرے میں جمع کی ہوئی ٹکٹیں، تتریوں کے پَر اور ٹافیوں کے کاغذ وغیرہ دکھا رہے تھے۔ وہ تُم سے بہت مرعوب نظر آتی تھی اور تُم بھی غالباً (اپنے قول کے مطابق) اس پر خاص طور سے رُعب جمانا چاہتے تھے۔ پھر تم نے اُسے (صرف اسے ہی) اپنی نظمیں بھی سُنائی تھیں۔ اور میری آنکھ کھل کو نہ جانے کیا ہُوا کہ تُم اور مُنّی تو غائب ہو گئے اور تمہاری جگہ مجھے ہنسی آتی ہے۔ کتنی عجیب سی بات تھی۔ مُنّی نے پوچھا تھا۔

"زین بھائی —— مَیں بھول گئی ہُوں۔ آپ کا کتنواں برتھ ڈے ہے؟"

"نوواں۔"

"نو سال کتنے ہوتے ہیں؟"

"تم جانتی ہو کہ ایک دِن کتنا بڑا ہوتا ہے؟"

"جی "

"تو پھر ایسے ہی تین سو پینسٹھ دِنوں کو نو سے ضرب دو۔"

"اچھا —— تو پھر آپ بہت بڑے ہُوئے —— پتا ہے مَیں صرف چھ سال کی ہُوں۔"

"مجھے معلوم ہے —— مُنّی! آؤ باہر دُوسروں کے پاس چلیں۔"

"نہیں —— مجھے یہاں بہت مزا آ رہا ہے —— مجھے اور کُچھ دکھائیے۔"

تم نے پُورے پُورے شاعر بنتے ہُوئے کہا تھا "آج پُورا چاند نکلے گا ڈنر کے بعد جب سب چلے جائیں گے تو تُم یہیں رہنا اور پھر ہم دونوں پپی کو ساتھ لے کر پھُولوں میں پریاں ڈھونڈیں گے۔"

"اچھا" منّی جیسے تمھاری ہر بات ماننے کے لیے پہلے ہی سے تیار بیٹھی تھی میں نے تم دونوں کو اپنے بازوؤں میں لے کر بڑی دیوانگی سے چوما تھا اور تم دونوں پہ جلدی سے مرچیں وار دی تھیں۔ تم اس کی وجہ پوچھنے کے بعد منّی کو پپی کی زنجیر تھما کے اور خود منّی کا ہاتھ پکڑ کر باہر چلے گئے تھے —— چلے گئے ہو۔ ابھی ابھی —— کیوں کہ دروازے کے پردے ہل رہے ہیں۔ باہر ریکارڈوں پہ ہلکی ہلکی موسیقی ہو رہی ہے اور تم سب بچے فلڈ لائٹ کی روشنی میں "کوکلا چھپا کے" کھیل رہے ہو۔ پپی، منّی کی پیٹھ پیچھے سے رومال اٹھا کر لے بھاگا ہے۔ منّی اس سے رومال حاصل کرنے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے بھاگ رہی ہے —— تم بڑے غصے میں چیخ رہے ہو "پپی —— پپی کے بچے —— ایڈیٹ" پپی اور منّی گیٹ سے باہر نکل گئے ہیں اور تم بھی ان کے پیچھے باہر چلے گئے ہو —— باہر بے حد تاریکی ہے کیونکہ سڑک پہ بجلی کے کھمبے کا بلب فیوز ہو گیا ہے۔ اور اندھیرا فلڈ لائٹ کو نگل رہا ہے —— تم پپی اور منّی کے پیچھے پیچھے بھاگتے بھاگتے ان دونوں کی طرح تاریکی میں کھو گئے ہو —— کھو گئے ہو۔ اور میرا دل دھک دھک کر رہا ہے۔ اس تاریکی میں غروب ہو رہا ہے اور میں بہت گھبرا گئی ہوں کیونکہ شام کے وقت اندھیرے میں سڑک پر سانپ وغیرہ ہوتے ہیں —— زین! زین —— لوٹ آؤ پپی خود ہی رومال لے کر آجائے گا —— باہر لان میں بچوں کا اتنا شور ہے کہ میری آواز تم تک نہیں پہنچتی۔ زین —— منّی۔ زین سے کہو لوٹ آئے۔ —— میری آواز کوئی نہیں سنتا۔ زین جی، تم بھی نہیں —— اندھیرا شاید ہر چیز کو نگل لیتا ہے۔ میں سراج بابا کو بلاتی ہوں کہ وہ تمھاری حفاظت کے لیے جائے —— سراج۔! سراج۔!"

"جی۔ بی بی۔ جی"

"وہ دیکھو زین یہاں ——"

میں نے کھڑکی سے باہر اشارہ کرتے ہوئے سڑک پہ تمھیں دیکھنا چاہا ہے۔ سڑک ویران

پڑی ہے۔ غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں نیم گرم سڑک کو چاٹ رہی ہیں۔ درختوں اور پودوں سے رات کا اندھیرا نکل نکل کر پھیل رہا ہے۔ لان میں بجتی ہوئی ہلکی ہلکی موسیقی اور بچوں کے شور کو یہ اندھیرا نگل رہا ہے —— پپی اس اندھیرے سے گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا ہے اور بے حد اکتایا ہوا لان کے گھاس کی ایک پتی کو سونگھ رہا ہے۔ مَیں نے شرمندہ سی ہو کر سراج کو دیکھا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بڑی شفقت ہے کیونکہ میرا بچپن اور جوانی اس کے ہاتھوں میں گزری ہے۔ وہ خدا سے صرف اس لیے اور زندگی مانگتا ہے کہ تم بھی اس کے ہاتھوں میں جوان ہو —— اُس کی آنکھوں میں آنسو ہیں —— مَیں اس کے آنسوؤں کا مطلب نہیں سمجھ سکی —— جانے کیوں زیرِ لب ایک مرتبہ پھر مَیں نے "زین" کہا ہے۔ سراج آنسو پینے کی کوشش کر رہا ہے۔

"بی بی جی —— زین میاں ابھی تو اسکول سے نہیں آئے۔"

"سراج بابا —— مَیں نے تم سے کئی مرتبہ کہا ہے کہ اسکول سے پتا کرو۔ تم خود جاتے ہو نہ مجھے ہی جانے دیتے ہو —— خدا معلوم جی کب آئیں گے۔"

چار دن کا ٹور تھا —— انشاء اللہ کل آجائیں گے۔ وہ آپ کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے، اگر آپ چلی جاتیں تو بہتر تھا۔"

"اور زین کو گھر میں تنہا چھوڑ جاتی۔!"

"بی بی جی —— زین میاں تو —— وہ تو" سراج بابا رو دیا ہے "وہ تو اسکول کے —— سمر کیمپ میں گئے ہیں۔"

مارچ میں سمر کیمپ کہاں ہوتا ہے —— اور پھر وہ مجھ سے پوچھے بنا کہیں نہیں جاسکتا۔ پرسوں اس کا برتھ ڈے ہے۔ اس نے کہا تھا کہ سارا انتظام وہ خود کرے گا۔ اور اب تم کہتے ہو کہ وہ سمر کیمپ پر چلا گیا ہے؟

سمر کیمپ —— سمر کیمپ —— یہ دو الفاظ ہمیشہ زہر بن کر میرے کانوں میں اترتے

رہیں گے۔ سراج ۔ ! میرے سامنے سمر کیمپ کا نام آئندہ کبھی نہ لینا ۔ یہ سنتے ہی میرے ذہن میں ایسی جگہ کا تصور آجاتا ہے جہاں زندگی پر پھپھوندی جمنا شروع ہو جاتی ہے ــــ اب میں اپنے زین کو وہاں ہرگز نہ جانے دوں گی ــــ چاہے تم کتنی ہی ضد کرو زین ! ــــ وہیں سے تو تمہارا خط آیا تھا کہ یک لخت تمہارے دائیں کان میں بڑی شدت سے درد شروع ہو گیا ہے ۔ یہ پڑھ کر میں بہت پریشان ہوئی تھی ۔ یہ پچھتاوا مجھے رہ رہ کر کھانے لگا کہ میں نے تمہیں وہاں پر تنہا کیوں بھیجا ۔ جمی نے مجھے بڑی تسلیاں دیں کہ کان کا معمولی سا درد ہو گا ۔ مگر جانے یہ درد میرے دل میں بیٹھ گیا تھا ۔ میں نے اسی وقت تمہارے ہاؤس ماسٹر کو فون کیا ۔ اس نے بتایا کہ درد کی دوا لینے کے بعد اب تم سو رہے ہو اور کل صبح اٹھتے ہی تم مجھے فون کرو گے ــــ جمی سے تمہارے متعلق باتیں کرنے کے بعد میں بڑی شرمندہ سی ہوئی کہ کان کے اتنے معمولی سے درد نے مجھے خواہ مخواہ پریشان کر دیا ــــ پھر بھی جانے اس اطمینان میں بے چینی کے بلبلے کیوں پھوٹتے رہے ۔ کوئی انجان سا احساس مجھ پر چھوٹے چھوٹے زخم لگاتا رہا ۔

اگلی صبح تمہارا فون آیا کہ تم بالکل ٹھیک ٹھاک ہو اور مجھے پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ۔ ورنہ تم مجھ سے روٹھ جاؤ گے ۔ تم کھانے کے بعد باقاعدہ اوولٹین دودھ اور ریناڈیکس پیتے ہو ۔ اور اچار بالکل نہیں کھاتے ۔ اور اگر اب بھی میں تمہارے بارے میں متفکر رہی تو پھر ــــ کٹی ۔

تمہارے خیریت کے خطوں اور ٹیلیفونوں کے باوجود کبھی کبھی میں بہت پریشان ہو جاتی تھی ۔ مجھے تمہارا خط ابھی تک زبانی یاد ہے ۔ جس میں تم نے لکھا تھا ــــ .....

آج ہم نیچر سٹڈی کے لیے گئے تھے ۔ امی ! میں نے ایک بڑی عجیب سی بات نوٹ کی ہے ۔ یہ کہ

کونپلیں جب پھوٹتی ہیں تو ان کا رنگ زرد ہوتا ہے

اور جوانی کے بعد جب ان کا آخری وقت قریب آتا ہے
تو سبز رنگ آہستہ آہستہ پھر زردی میں تبدیل ہونے لگتا
ہے۔ میں نے ٹیچر سے اس کی وجہ پوچھی تھی تو انھوں نے
بتایا تھا کہ پیدائش اور خاتمے کے وقت کلوروفل نہیں
ہوتی —— امی! ویسے تو یہ بات ٹھیک ہے لیکن مجھے
محسوس ہوتا ہے کہ اس کی وجہ صرف کلوروفل ہی نہیں
بلکہ کوئی اور بات ہے جسے ٹیچر جی بھی نہیں جانتے۔ آپ
نے میری ہر مشکل حل کی ہے۔ آپ ہی مجھے بتا دیجیے
تاکہ کلوروفل والی بات مجھے سچی کیوں نہیں لگتی۔ کونپلوں
اور بوڑھے پتوں کی زردی کے بارے میں میرا احساس
کیا ہے ...."

اس کے بعد تم نے ایک نظم بھی لکھی تھی "زرد کونپل" اب تک اپنی آخری نظم، کہ ——

نرم و نازک ننھی کونپل کا، سبز ڈالی کے جھولے میں
یہ پیلا پیلا چہرہ، جو
رفتہ رفتہ سنہری میں ڈھل جاتا ہے اور وہ اپنی زردی کو بھول کر
کومل ہواؤں کی دُھن پر ناچتی ہے، جیسے یہ زردی کبھی لَوٹ کر نہ آئے گی
جیسے وہ کبھی ناتواں نہ تھی، اور نہ پھر کبھی ہو گی۔

ننھی کونپل جب تُو ہواؤں کی دھن پر ناچتی ناچتی
تھک کے زرد ہو جائے گی۔
اور اپنے نغموں کے بدلے میں کومل ہوائیں

تجھے ڈالی کے جھولے سے چھین لیں گی (اور تجھے انجانی دنیا میں لے جائیں گی)
تو تم مجھے اپنے زرد بچپن کا، اپنے زرد بڑھاپے کا،
راز ضرور بتانا

تمھاری اتنی عجیب و غریب نظم پڑھ کر میری روح ان گنت خلاؤں میں اتر گئی تھی۔ میں نے تمھارے سوال کے بارے میں بہت سوچا لیکن میں بھی تمھارے ٹیچر کی طرح بے بس ہوں۔ میں تمھیں ایک بار پھر کہتی ہوں کہ اتنی بے معنی سی باتیں نہ سوچا کرو، نہ لکھا کرو تمھاری عمر کے لڑکے ایسی باتیں نہیں کرتے۔ تمھارے منہ سے ایسی باتیں سن کر میری آدھی جان نکل جاتی ہے ——— کیوں؟ ——— کاش تم عورت ہوتے، ماں ہوتے تب تمھیں پتا چلتا کہ بہت سی ہونے والی باتوں کا ہیولہ پہلے ہی ماؤں تک پہنچ جاتا ہے۔ زین! میں اب بھی تمھاری نظم دہرا رہی ہوں۔ اس کا مطلب سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں مگر ہر کوشش پر میرے ذہن میں ایک دھند سی چھا جاتی ہے جس میں بہت سی زرد کونپلیں پھوٹتی نظر آتی ہیں۔ پھر دھند تیز آندھیوں میں تبدیل ہو جاتی ہے اور چاروں طرف بوڑھے بوڑھے زرد زرد پتے اڑنے لگتے ہیں۔ انہی تیز ہواؤں کے شور میں دبی ہوئی تمھاری دھیمی آواز فون پر سنائی دیتی ہے۔

"امی پچھلے دو دنوں سے میرے کان میں متواتر درد ہو رہا ہے ——— پہلے بھی ہوتا تھا۔ مگر اتنا شدید اور متواتر نہیں۔ میں نے آپ کو پہلے اس لیے نہیں بتایا تھا کہ آپ خواہ مخواہ فکر کرنے لگتی ہیں"

"تم ——— تم ——— ہسپتال نہیں گئے؟"

"گیا تھا جی ——— ڈاکٹر کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا وہ کان میں دوا ڈال کر کوڈو پائرین کھلا دیتے ہیں"

"اب۔ اب ——— تمھارا کیا حال ہے؟"

"جی اب —— امی! میں واپس آنا چاہتا ہوں۔ کیمپ کے ختم ہونے میں تو ابھی ایک مہینہ ہے۔ آپ فکر بالکل نہ کریں۔ میں اب ٹھیک ہوں۔" غالباً درد کی شدت سے تم نے اپنا ہونٹ دانتوں میں لے لیا تھا۔

ہواؤں کا شور پھر بڑھ جاتا ہے اور تمھاری آواز دبتی جاتی ہے۔ نیچے —— بہت نیچے میں ہواؤں کے شور سے گھبرا کر اپنے دل میں تمھاری نظم لپیٹ کر رکھ دیتی ہوں اور پپی کو گود میں بٹھا کر پیار کرنے لگتی ہوں۔

اس رات پھر نیند میری آنکھوں کی راہ بھول گئی تھی۔ جمی نے ایک بار پھر مجاہدوں کی ماؤں کا ذکر کیا۔ میں نے ان تنکوں کا سہارا لے تو لیا لیکن مجھے پتا تھا کہ کان کے معمولی درد (جو کسی وجہ کے بغیر اتنی تشویش ناک صورت اختیار کر لے) اور جہاد میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ اگر تمھیں کسی جہاد میں جانا ہوتا تو میں یقیناً تمھیں ان مجاہدوں سے زیادہ بنا سنوار کے بھیجتی۔ لیکن تمھیں تو تکلیف تھی۔ اپنے دل کی دھڑکن کو معمول پر لانے کے لیے میں نے وہ رات جائے نماز پر گزاری اور (اگرچہ جمی کو اعتقاد نہ تھا) سراج بابا کے کہنے پر میں نے ایک سیاہ بکرا صدقہ کیا تھا۔

دوسری صبح جمی کو دفتر چھوڑ کے میں تمھیں لینے کے لیے خود اسٹیشن پر گئی۔ تمھارے دائیں کان پر روئی کی گدی رکھ کر پٹی باندھی گئی تھی۔ اور تمھارا چہرہ —— بالکل زرد کونپل تھا۔ جیسے تم ابھی ابھی پیدا ہوئے تھے —— "اگر بچے سے احتیاط نہ برتی گئی تو ——" میرا جی چاہتا تھا کہ تمھیں دبیز کمبل میں لپیٹ کر گود میں اٹھاؤں۔ جولائی کی گرمی کے باوجود تم سویٹر پہنے ہوئے تھے (ہاؤس ماسٹر نے ہدایت کی ہوگی) میں نے تمھیں اپنے سینے سے بھی نہ لگایا، تمھارا منہ بھی نہ چوما، مبادا تتریوں کی طرح تمھارے چہرے کی زردی جھڑ نہ جائے۔ تم نے گاڑی سے اترتے ہی کہا تھا "اس وقت میں بالکل ٹھیک ہوں۔" میں نے تصور ہی تصور میں پلیٹ فارم پر شکرانے کا سجدہ کر کے ایک اور بکرا صدقہ کرنے

کا عہد کیا تھا۔ تم اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ میرے کندھے کا سہارا لے کر باہر کار تک آئے ہیں تمھاری بہادری کی خاموش داد دیتی رہی کہ محض میری پریشانی کا خیال کرتے ہوئے تم نے مجھے اپنی تکلیف کی باقاعدہ اطلاع نہیں دی —— اور تمھیں اس درد کی ذرا پروا نہیں۔ تمھارے نزدیک اس تکلیف کو کوئی اہمیت نہیں —— ابھی ٹھیک ہو جائے گی —— ابھی اَمّی! آپ کیوں خواہ مخواہ پریشان ہوتی ہیں ——

اسی دن ہم تمھیں ای۔این۔ٹی اسپشلسٹ کے پاس لے کر گئے۔ اس نے آدھ گھنٹہ تک معائنہ کرنے کے بعد نسخہ لکھتے ہوئے کہا تھا کہ بظاہر تو کچھ نہیں —— یہ دوائی استعمال کر دیجیے۔ جلد ہی آرام آجائے گا۔ دوائی کھانے کے باوجود اس رات تمھیں بہت درد ہوتا رہا۔ جس کی شدت کا اندازہ مَیں نے صرف تمھارے دانتوں میں بھنچے ہوئے ہونٹ سے کیا تھا۔ تم کراہتے تو نہیں تھے کیوں کہ اپنے قول کے مطابق تم مرد تھے —— اتنے بڑے کہ ہزار سال کے۔

پُورے دو ہفتے اسپشلسٹ نے فیسیں وصول کیں کہ اُس کی ہدایت کے مطابق اس کو تمھاری حالت سے ہر روز آگاہ کرنا ضروری تھا اس عرصے میں سوائے گنتی کے چار پانچ دِنوں کے، دوائی نے تم پر کوئی اثر نہیں کیا تھا۔ اس کے بعد ڈاکٹر نے کان کا ایکسرے کروانے کے لیے کہا۔ ایکس رے دیکھنے کے بعد اس نے کان کے درمیانی حصّے کی (Infection) تشخیص کی چنانچہ اس بیماری کا علاج شروع ہو گیا۔

تمھارے لیے ہر وقت چارپائی پہ لیٹے رہنا ضروری تھا۔ کان کے درد کی وجہ سے تم کچھ چبا بھی نہ سکتے تھے۔ شاید اسی لیے تم اور بھی کمزور ہو گئے تھے۔ تم ہر وقت چارپائی پر لیٹے کچھ نہ کچھ پڑھتے رہتے۔ مَیں نے تمھیں کتنی مرتبہ منع بھی کیا کہ یُوں نظر کمزور ہوتی ہے لیکن تمھارا خیال تھا کہ تم کتابوں میں اپنا درد بھول جاتے ہو۔

ایک روز تم نے کوئی رسالہ پڑھتے پڑھتے اسے بند کر کے سینے پہ رکھ کر آنکھیں موند

لی تھیں۔ مَیں نے تمھاری طرف غور سے دیکھا تو تمھاری آنکھوں کے کونوں میں پانی سا چھلک رہا تھا —— آنسو —— ! تمھاری آنکھوں میں —— ؟ مَیں نے زندگی میں پہلی بار (اور آخری بار) تمھاری پلکوں کو گیلا دیکھا تھا۔

"زین —— !" مَیں نے ہولے سے تمھارے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں پکڑتے ہوئے کہا تھا "کیا بات ہے —— زین جی ؟"

تم نے یکدم آنکھیں کھول دی تھیں —— "کچھ نہیں امّی —— کچھ بھی تو نہیں"

تم نے فوراً رومال سے آنکھیں خشک کی تھیں اور جلدی سے رسالہ اٹھا کر اپنے سرہانے کے نیچے رکھ لیا تھا اور پھر ہم دونوں ایک دوسرے کے سینے سے لگ کر اتنا روئے تھے کہ ساون میں آسمان بھی کیا روتا ہو گا۔

"کیا ہوا ہے زین —— درد بڑھ گیا ہے ؟"

تم نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

"تو پھر ——"

"کچھ نہیں امّی جی —— یونہی بس —— آئندہ نہیں روؤں گا۔ آپ ہی تو کہا کرتی تھیں کہ اچھے بچے رویا نہیں کرتے۔"

لیکن مَیں ایک اچھی امّی نہیں ہوں۔ جانے میری آنکھوں میں اتنا پانی کہاں سے آجاتا ہے تم نے کہا تھا "امّی جی —— اچھی امّیاں بھی تو نہیں رویا کرتیں۔"

"تو پھر مجھے وجہ بتاؤ ——" تم نے لیٹے لیٹے مڑ کر اس رسالے کو اور بھی اپنے سرہانے کے نیچے چھپا دیا تھا —— "کیا اس رسالے میں کوئی بات ہے ؟"

"نہیں امّی ——"

"تو پھر تم روئے کیوں تھے —— ؟"

"آئندہ نہیں روؤں گا"

اس وقت تمہارے آنسو بھی تمہاری نظم کی طرح ایک معمہ بن کر رہ گئے تھے تمہارے یہ کہنے پر کہ اچھی اُمیاں ضد بھی نہیں کرتیں ـــــ میں خاموش ہوگئی تھی اور تم نے تھوڑی پر چپ رہنے کے بعد کہا تھا۔

"امی جی ـــــ میں اس کان کا کیا کروں ـــــ آپ کو اس طرح اُداس اور پریشان دیکھ کر مجھے بہت دُکھ ہوتا ہے۔ میں آپ کو اس طرح غمگین نہیں دیکھنا چاہتا۔"

"نہیں میرے لعل ـــــ مجھے کیا غم ہے۔ تم میرے اتنے بہادر بیٹے ہو۔"

"ابا جی سے کہیں کہ وہ بھی پریشان نہ رہا کریں ـــــ مجھے یوں نہ دیکھا کریں۔"

(وہ تو دفتر سے بھی دو تین مرتبہ مجھ سے تمہارا حال پوچھتے تھے۔)

تمہارا اسکول کھل گیا تھا۔ تم اتنی تکلیف کے باوجود اسکول جانا چاہتے تھے کہ کہیں لڑکے پڑھائی میں تم سے آگے نہ نکل جائیں لیکن ہاؤس ماسٹر نے (جو کہ تمہاری قابلیت کا بہت قائل تھا) آکر تمہیں تسلی دی کہ تمہارے صحت یاب ہونے پر وہ خود ہی تمہاری کمی پوری کرا دے گا۔ ہر روز تمہارا کوئی نہ کوئی دوست تم سے ملنے کے لیے آتا۔ تم اس سے مل کر بہت خوش ہوتے۔ وہ تمہیں اس دن کی پڑھائی کے متعلق بتاتے اور تم وہ سبق ضرور پڑھتے۔ ایک دن چھوڑ کے دوسرے دن منّی امی کے ساتھ آتی تھی اور ہمیشہ تمہارے لیے پھولوں کا گلدستہ لاتی۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ مجھ سے بھی بڑھ کر اس کی خواہش تھی کہ تم جلد اچھے ہو جاؤ کیونکہ تم اس کے سب سے اچھے دوست تھے۔ پھر ایک دن منّی نے بتایا تھا کہ کل اُس کا جنم دن ہے۔ تم نے کہا تھا کہ تم ضرور جاؤ گے۔ ہم سب کے منع کرنے کے باوجود تم اس کے برتھ ڈے پر گئے کیوں کہ تم آج تک غیر حاضر نہیں ہوئے تھے۔ اگرچہ تم نقاہت کے باعث اس کی دعوت کا انتظام نہ کر سکے لیکن پھر بھی تم نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے چیزوں کو سجانے کی ہدایات دی تھیں۔ سہ پہر کے وقت چائے شروع ہوئی تو جانے تمہارے کان میں درد کہاں سے ٹوٹ آیا تھا۔ تمہارے دانتوں میں نچلا ہونٹ دیکھ کر میں گھبرا گئی تھی۔

اور میں نے تمھیں گھر چلنے کو کہا تھا۔ تم نے انکار کر دیا۔

"امّی ـــــ اتنا مزہ آرہا ہے۔ کوئی بات نہیں میں ابھی ٹھیک ہو جاؤں گا ـــــ اگر میں چلا گیا تو منی بور ہو گی۔"

میں نے تمھیں درد کی گولی کھلائی (جس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا) تکلیف کے باعث تم اس تمام رات نہ سو سکے۔ مجھے وہاں لے جانے سے پہلے ہی خدشہ تھا کہ تمھارے کان پر رُوئی کے باوجود سرد ہوا تمھیں تنگ کرے گی۔ صبح کے وقت کہیں جا کر تمھاری آنکھ لگی تھی۔ اسی رات سے تمھیں بخار بھی رہنے لگا تھا۔ تمھارے ابا بھی بہت متفکر تھے۔ دن چڑھتے ہی وہ بڑے غصے میں ڈاکٹر کے پاس گئے اور جب وہ لوٹے تو ان کا سر کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا۔ انھیں اس طرح دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔

"ڈاکٹر کیا کہتا ہے۔؟"

"ہمارے زین کا یہاں کے ڈاکٹروں کے پاس کوئی علاج نہیں ـــ کان کی ہڈی کی Infection غالباً دماغ کی جھلیوں تک پہنچ گئی ہے رات جو لمبر پنکچر سے ہسپتال میں مواد حاصل کیا تھا اس سے ڈاکٹر نے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے ـــــ اسی لیے بخار بھی شروع ہو گیا ہے۔" انھوں نے میرے کندھے کو تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا۔

کان کا اتنا معمولی سا درد، اور اس کا یہاں کوئی علاج نہیں ـــــ! میرے کان بند ہو گئے، میری آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ ان تمام ڈاکٹروں کی ڈگریاں پھاڑ دوں۔ میں گھبرا کر تمھارے کمرے میں آئی ـــــ تم سو رہے تھے۔ میں نے بہت آہستہ تمھارا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا جیسے اپنے ہاتھوں سے تمھارے ہاتھوں میں زندگی تھما رہی ہوں۔

تمھیں سوئے ہوئے تیرہ گھنٹے ہو گئے تھے تم آج تک اتنا نہیں سوئے تھے۔ میں نے تمھیں اٹھانا چاہا لیکن شاید تم اُٹھنا نہیں چاہتے تھے۔ جمی نے بے حد متفکر ہو کے

ڈاکٹر کو فون کیا۔ اس نے بتایا کہ اس بیماری میں ایسا ہو جایا کرتا ہے۔

جب تم اُٹھے تو پہلے سے کچھ بہتر تھے۔ تمہیں بھوک لگی تھی۔ مَیں نے کانپتے ہاتھوں سے تمہیں دودھ کا گلاس پلایا۔ مجھے ابھی تک ڈاکٹر کی بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ تمہارا مرض لاعلاج ہے مجھے تمام علاجوں سے بڑھ کر اپنی دُعاؤں پر اعتماد تھا —— اور پھر اتنا ظالم تو کوئی نہیں ہو سکتا تھا کہ میرے اکیلے زین کو جو کہ اتنا اچھا بچّہ تھا، جو کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا تھا، مجھ سے اتنی بے دردی سے چھین لے۔ اور مَیں نے بھی تو کسی کا کوئی قصور نہیں کیا تھا کہ میری زندگی اس طرح مجھ سے چھین لی جاتی —— مَیں دُعاؤں اور صدقوں کے سہارے تمہارے لیے زندگی حاصل کرتی رہی —— تمہیں دیر سے ہونے والے درد اب اکثر لوٹا کرتے تھے۔ اور ہر درد کے بعد تم گہری لمبی نیند میں اُتر جاتے تھے۔ جانے مَیں نے بھی زندگی تمہارے لیے نارمل کیوں سمجھ لی تھی۔ میرے نزدیک سب ڈاکٹر بکواس کرتے تھے کہ یہ ناقابلِ علاج بیماری ہے۔ میرا خیال ہے کہ خدا نے تمہارے لیے زندگی کا یہی طریقہ سوچا تھا۔

پھر تم نے میرے اس نظریے کی پختہ عمارت کو بھی گرا دیا اس روز مجھے پہلی مرتبہ احساس ہوا تھا کہ ڈاکٹر صحیح کہتے ہیں میرے اعتقادیت کے تھے تم جب اپنی لمبی نیند سے اٹھے تھے تو تم نے مجھے بتایا تھا کہ تم نے بڑا عجیب سا خواب دیکھا ہے۔ کہ وہ پریاں جنھیں تم چاندنی راتوں میں ڈھونڈا کرتے تھے اور جو دیکھنے پر نظروں سے غائب سی ہو جاتی تھیں۔ وہ ایک ایسی ہی چاندنی رات میں پھولوں سے نکل کر خود ہی تمہارے پاس آگئی ہیں اور تمہارے انکار کے باوجود کہ میں تمہارے بغیر اُداس ہو جاؤں گی تمہیں اپنے ساتھ لے گئی ہیں —— خواب سنانے کے بعد تم نے کہا تھا۔

"امی اگر وہ پریاں مجھے اپنے ساتھ لے گئیں تو آپ بالکل اداس نہ ہوئیے گا مَیں ان سے پوچھ کر آپ سے ملنے آیا کروں گا۔"

"نہیں زین جی ——— میں تمھیں نہیں جانے دوں گی۔"

میں نے تمہارا ہاتھ اس قوت سے پکڑا تھا۔ جیسے وہ تمہیں لیے جا رہی ہوں۔ میری گھبراہٹ اور پریشانی دیکھ کر تم نے کہا تھا۔

"امی آپ کیوں اس طرح ہو رہی ہیں ——— خواب تو خواب ہوتے ہیں۔"

اپنے ابا کی طرح تمھیں بھی تسلیاں دینے کی بڑی عادت ہے۔ میں تمھاری اپنی باتوں کا سہارا لینے کی بجائے اور کیا کرتی ——— اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ میں کیا کروں۔ تمھارے ابا نے تمھیں امریکہ یا لندن لے جانے کی بہت کوشش کی لیکن حکومت کی طرف سے اجازت نہیں ملتی تھی۔ کیونکہ ڈاکٹروں نے ہمیں بتانے کے باوجود محکمے والوں کو یہ نہیں لکھا تھا۔ کہ اس مرض کا علاج یہاں نہیں ہو سکتا۔ شاید وہ اس میں اپنی ہتک سمجھتے تھے۔

درد کی وجہ سے تم دو دو دن نہیں سوتے تھے۔ اور جب سوتے تھے تو پہروں پتہ نہیں چلتا تھا کہ تم کہاں کھو گئے ہو۔ زین! میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آیا کہ انسان ایسے حالات میں بے بس کیوں ہو جاتا ہے۔ انسان تو انسان مائیں بھی اپنے بیٹوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتیں ... تم جب جاگ رہے ہوتے تو لیٹے لیٹے نہ جانے تم میں اتنی طاقت کہاں سے آجاتی تھی کہ تم ایک دم اُٹھ کر میرے سینے سے لگ جاتے۔ پھر علیٰحدہ ہو کر مجھے اتنی عجیب سی نگاہوں سے دیکھتے کہ میں خود بخود ہی کپنے لگتی۔

"نہیں زین ——— تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گے۔"

"ہاں امی ——— بہت جلد ——— میں جانتا ہوں۔" تم کروٹ لے کر منہ دوسری طرف کر لیتے اور میں ——— بس وہاں کرسی پر بیٹھی تمھیں دیکھتی ہی رہتی۔ بالکل پپی کی کی طرح ——— پپی جو تمھاری چارپائی کے قریب ہی بیٹھا تمھارے اُٹھنے کا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اور جو کہ چاندنی راتوں میں تنہا ہی باہر گھوما کرتا تھا۔

پھر ایسے ہی دن آ گئے جب کہ شبنم میں گھلی ہوئی صبحیں اپنے لحاف اتار کے نیم گرم دنوں کے صندوقچوں میں رکھ رہی تھی۔ اور مارچ نے گلاب کی خشک بانہوں میں سرخ کنگن پہنا دیے تھے۔ جانے اتنے خوبصورت دنوں میں تمہاری نیندیں اتنی لمبی کیوں ہو گئیں — ایک شام تم نے اشاروں سے مجھے بتایا کہ میں تکیے کے نیچے سے تمہیں رسالہ نکال کر دوں۔ تم نے وہ رسالہ کھول کر دوبارہ میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور اس میں چھپی ہوئی ننھی سی لڑکی کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بڑی مشکل سے کہا —— "آپ بھی اس کی امی کی طرح رہیے گا —— اگر آپ غمگین ہوئیں تو ——"

تم تھک گئے تھے میں وہ رسالہ بند کر کے اٹھی اور دودھ پلانے کے بعد تم کو آرام کرنے کے لیے کہا۔ تم نے آنکھیں موند لیں اور میں ریڈرز ڈائجسٹ میں "گبرائیلی" پڑھنے لگی۔ جس میں ایک ماں نے اپنی بیٹی کو بھولنے کی کوشش کی تھی۔ اور میری سمجھ میں سب کچھ آ گیا کہ تم اس روز زندگی میں پہلی اور آخری مرتبہ کیوں روئے تھے۔ تم نے نصیحت کی تھی کہ میں بھی "گبرائیلی" کی امی کی طرح صابر اور شاکر رہوں۔

دوسرے روز تم نے مجھ سے پوچھا۔

"امی —— آپ کو کہانی پسند آئی"

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

تم نے وقفے کے بعد کہا تھا "آپ اللہ میاں سے دعا کیجیے گا۔ کہ وہ آپ کو مجید جیسا اور زرین دے دے۔ میں تو اب اتنا پرانا —— بے کار سے ہو گیا ہوں کہ ——"

میری آنکھوں کے آنسو ختم ہو چکے تھے۔ میری آواز بھی آنسوؤں سے خشک تھی۔ میں نے تمہیں یقین دلایا تھا۔

"اچھے بچے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے —— کون کہتا ہے کہ تم پرانے ہو گئے ہو"

"میں بہت تنگ آ گیا ہوں —— مجھے جلد آرام آ جائے گا نا؟"

"ہاں۔ ہاں۔ بہت جلد ــــــ"

تم یُوں مُسکرائے تھے جیسے میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ پھر تم نے میری ہتھیلی پر گال رکھ کر آنکھیں موندلیں تھیں ــــــ ہم دونوں ایک دوسرے کو تسلیاں دیتے ہوئے مکڑی کے جالوں کے تار تھامے ایک دوسرے کو سہارا دیتے ہوئے تند ہواؤں میں کھڑے تھے۔ تند شوریدہ ہوائیں جو کہ درختوں کے ساتھ اٹکے ہوئے چند ایک آخری زرد پتوں کو نوچ رہی تھیں۔ تم میرے ہاتھ میں لرز رہے تھے ــــــ زرد ــــــ دیئے کی لَو ــــــ زرد ــــــ کونپل ــــــ زرد پتے ــــــ "زین ــــــ ز ــــــ ے...... ن......" تم پہلے تو کبھی نہیں چیخے تھے ــــــ اب تمہیں یقیناً حد سے زیادہ درد ہو رہا ہوگا ــــــ نچلے ہونٹ کو دانتوں میں چباتے چباتے اس پر سُرخ نگینے اُبھر آئے ہیں۔ زین۔ یہ درد تم میرے کانوں میں اتار دو۔ او پلیز ــــــ! اللہ میاں تم نے تو میرے پیروں میں جنّت بنادی تھی۔ اب اس کے باسی کو کیوں چھین رہے ہو ــــــ اللہ میاں ــــــ! عزرائیل تمہاری نافرمانی کرنے آرہا ہے ــــــ ورنہ مجھے پتا ہے کہ تم بڑے رحیم ہو۔ تم میرے زین کی تکلیف مجھے دے دو۔ اگر نہیں تو میرے پیروں میں ڈالی ہوئی جنّت واپس لے لو۔ اللہ میاں ان تیز ہواؤں کو روک دے۔ اس وقت جب کہ زین ایک زرد کونپل تھا اور اُس کی زندگی کی کوئی اُمید نہ تھی تو تم ہی نے اسے زندگی دی تھی۔ لیکن اب تم نے اس کونپل کو جوانی سے بھی پہلے زردی دے دی ہے ــــــ کیوں ــــــ کیوں ــــــ؟

جانے میری آنکھوں کے سیلاب میں اُمیدوں کی کشتیاں میری دُعائیں لیئے خدا تک پہنچی تھیں یا نہیں ــــــ مگر تیز ہوائیں رُک گئیں۔ درد کے مارے بستر پہ اپنا جسم ٹکراتا ہوا پتا ساکت تھا۔ تم تمام دن کی تڑپ کے بعد اب سوئے تھے ــــــ مَیں نے گھبرا کر تمہاری نبض پہ ہاتھ رکھا تھا۔ نبض چل رہی تھی، آہستہ آہستہ ــــــ دھیرے دھیرے ــــــ میری اُنگلیوں کے ذریعے مجھے زندگی دے رہی تھی ــــــ اگلی صبح تم نے مُسکراتے ہوئے

مجھے سلام کیا، میں نے ساری رات آنکھوں میں گزار دی تھی۔ تم نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا تھا۔

"امی —— آپ ہر وقت اُداس سی رہا کرتی تھیں۔ فکر مند سی —— میں نے بھی اللہ میاں سے دُعا کی ہے کہ —— "

تمہارے چہرے پر ہلکی سی سُرخی دیکھ کر میں نے فوراً ایک اور سیاہ بکرا صدقہ کیا تھا۔

اور ——

اور کتنی عجیب سی بات ہے کہ اس تاریک سی شام نے تمہارے چہرے کی ہلکی سی سُرخی چھین کر تمہاری آنکھوں کو تاریکی دے دی تھی۔ پپی تمہارے چارپائی کے نیچے بیٹھا بُری بُری طرح رو رہا تھا۔ سراج بابا۔ بڑے غصے میں اسے گھسیٹتے ہوئے باہر لے گئے اور وہ جانے کیوں گھبراہٹ میں چکر لگاتا ہوا روتا رہا۔

پھر جانے اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے —— سب رو رہے تھے —— منی بھی میری گود میں بیٹھی رو رہی تھی —— لیکن میری انگلیوں میں تمہاری نبض دھڑک رہی تھی —— آہستہ آہستہ —— میری انگلیوں کے ذریعے مجھے زندگی دے رہی تھی —— پھر ان سب کو جانے کیا ہوا کہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے اور میں نے کھڑکی میں سے دیکھا کہ لوگ چارپائی پر سیاہ چادر میں چھپائے کچھ لیے جا رہے ہیں —— آہستہ آہستہ —— سازشیوں کی طرح —— چپ چاپ —— چپ چاپ۔

اتنا طویل خواب ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ اور میں نے دیکھا کہ پریاں تمہیں اپنے ساتھ لیے جا رہی ہیں۔ وہ بڑی خوش ہیں۔ تم بھی خوش ہو لیکن بار بار پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتے ہو —— اور ایک عجیب سی اُداسی تمہارے چہرے پر چھا جاتی ہے۔ خوشی اور اداسی کے امتزاج نے تمہارے چہرے کی ساری زردی اُتار دی ہے —— تمہارے ہلکے گلابی گالوں کو چھونا چاہتی تھی —— زرین —— زرین۔ میں تمہیں پکارتی ہوں —— تم کہتے ہو۔

"امّی ان پریوں سے پوچھ لیجیے۔"

"زبین ——"

میری آنکھ کھل گئی ہے —— یہ دوسری صبح ہے —— یہ سب چلے گئے ہیں۔ صرف تمھاری خالائیں اور ممّی ہیں جو غالباً ابھی ابھی سوئی ہیں —— "زبین !" میں تمھیں پکار رہی ہوں۔ جمی نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسکول گئے ہو —— سراج بابا کہتا ہے کہ تم سمر کیمپ میں گئے ہو۔ مَیں لان میں تمھیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں، لیکن نوزائیدہ کلیاں اور کونپلیں حیرانی سے دیکھتی ہیں —— "تم پاگل تو نہیں ہو گئیں —— ہم تو ابھی کل ہی اس دُنیا میں آئی ہیں ——"

مَیں ان جھاڑیوں کے قدموں میں جمی ہوئی خشک پتوں کی تہوں کو کھود رہی ہوں —— آٹھویں، نویں، دسویں تہہ —— کہاں ہے میرا زبین، اس نے تمھارے ہی ساتھ آنکھ کھولی تھی —— گلے ہوئے زرد پتوں کا رنگ اور بھی فق ہو گیا ہے۔

"زبین —— اسکول گیا ہے۔"

ساری کوٹھی گونج رہی ہے۔

"زبین سمر کیمپ میں گیا ہے۔"

تم سب جھوٹ بولتے ہو۔ میں جانتی ہوں میرا زبین کہاں گیا ہے —— وہ ان ستاروں کی سیر کرنے کے لیے گیا ہے جس کی خواہش اس نے اپنی پہلی نظم میں کی تھی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ ایک ہزار سال ایک ہزار دِنوں میں ختم ہو گئے ہیں، جب وہ لَوٹے گا تو آسمان کے یہ پھول توڑتا لائے گا اور اپنے ڈرائینگ روم میں سجائے گا —— لیکن کب ؟ کب۔

زبین ! یہ لوگ نہیں جانتے کہ ستاروں کی سیر کرتے ہوئے بھی میرے پاس ہوتے ہو —— لیکن جب تک تم سچ مچ نہیں لَوٹتے تو لوگ مجھ سے یہی کہتے رہیں گے کہ تم اسکول گئے ہو —— سمر کیمپ گئے ہو —— مَیں ہر روز صبح تمھارے منہ دھونے کے لیے پانی گرم کروں گی۔ کھانے پر تمھارا انتظار کیا کروں گی اور پپّی کو اپنی گود میں بٹھا کر تمھاری

نظمیں پڑھا کر دوں گی ـــــ اور پھر پرسوں تمہارا جنم دِن بھی تو ہے۔ تمہیں جانے کی اتنی جلدی کیوں تھی آج تمہیں پریوں کے دیس میں گئے ایک ہفتہ ہو گیا ہے۔ پرسوں تمہارا برتھ ڈے ہے۔ تم تھوڑے عرصہ ہی کے لیے آجاؤ ـــــ محض ایک دِن کے لیے ـــــ اب مجھے کیا پتا کہ اتنے سارے غبارے کہاں لٹکانے ہیں۔ دیکھو! منّی بھی (جس کا تمہیں کتنا خیال تھا) بہت اداس ہو گی، مَیں وعدہ کرتی ہوں کہ تمہیں ایک دِن سے زیادہ نہیں روکوں گی ـــــ مَیں یہ بھی وعدہ کرتی ہوں کہ تمہاری خاطر مارچ سے بہاروں کا ایک تحفہ لے لوں گی اور "گبرائیلی" کی امّی کی طرح اپنے غموں پر مسکراہٹوں کا پردہ ڈال دوں گی (لیکن اس شرط پر کہ تم ضرور آؤ گے)۔ اور ہاں! اب تو تمہیں اپنے زرد کونپل والے سوال کا جواب مل گیا ہو گا۔ جب آؤ گے تو مجھے بھی بتانا ـــــ مَیں حمی، منّی اور دوسرے سب، کیک پر دس موم بتیاں جلا کر تمہارا انتظار کریں گے۔ اگر تم نہ آئے تو مَیں تم سے روٹھ جاؤں گی ـــــ کُٹّی کر دوں گی، اور پھر اس وقت تک تم سے نہیں بولوں گی جب تک تم مجھے بھی ستاروں کی سیر کرانے نہیں لے جاتے ـــــ

سیاہ جھنڈا

سفید گنبد کی چوٹی پر سیاہ رنگ کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اس سیاہ جھنڈے کی چھاؤں میں زندگی مجسّم دُعا بن کر دروازوں سے لپٹی ہوئی تھی۔

انسانوں کا سیلاب تھا کہ اُمڈا چلا آتا تھا کیونکہ آج ان کے پیر و مرشد حضرت کاڑے شاہ رحمتہ اللہ علیہ کے پہلے عرس کا پہلا دن تھا۔ شہری مریدوں نے سجادہ نشین پیر سلامت شاہ کی رضامندی سے مزار سے ذرا دُور ہٹ کر باہر سے آنے والے زائرین کی رہائش کے لیے اور ثواب حاصل کرنے کی خاطر میدان میں خیمے نصب کروا دیے تھے کیونکہ سردیوں کے دن تھے اور زائرین کے لیے رہائش کا کوئی انتظام نہ تھا۔

مزار کی پچھلی طرف اینٹیں رکھ کر بنائے گئے چولہوں میں راکھ پڑی تھی۔ ایک طرف پانی سے بُجھی شُوں شُوں کرتی لکڑیوں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ دیگوں سے نیاز کا کھانا نکال کر تقسیم کیا جا رہا تھا اور باورچی دوپہر کے کھانے سے فارغ ہونے کے بعد چارپائیوں پر بیٹھے حُقّہ گڑگڑاتے ہُوئے شام کے لیے چاول چُن رہے تھے۔

گنبد کے گرد بنی ہوئی چار دیواری یعنی مزار کی عمارت کے داخلی دروازے پر ٹنگے ہوئے پھولوں کے ہار مہک رہے تھے اور مزار کے اندر عود و عنبر کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ اندر بائیں طرف، لوگ درویشوں کے حجروں پر ٹوٹے پڑتے تھے کیونکہ وہاں خاص تبرک، پھلیاں، بتاشے اور ریوڑیاں تقسیم کیے جارہے تھے۔

ایک بند دروازے کے سامنے خلقت، پیر سلامت شاہ کی زیارت کے لیے بے قرار کھڑی تھی اور بند دروازے کے پیچھے پیر سلامت شاہ قالین پر لیٹے چھمو طوائف سے (جو عرس کی خاطر دو چار دن پہلے ہی آگئی تھی اور عقیدت کے باعث ہر جمعرات کو آیا کرتی تھی) سر دبوا رہے تھے۔ چھمو کی شاگرد فیروزہ ان کی پنڈلیاں سہلا رہی تھی۔ شاہ صاحب کی بوجھل آنکھوں میں سرخ ڈورے تیر رہے تھے اور ٹکٹکی لگائے فیروزہ کو دیکھ رہے تھے جیسے وہ اس کے چہرے میں زندگی کے معمے کا حل ڈھونڈ رہے ہوں۔ جب ان کی آنکھیں فیروزہ کے چہرے کو ٹٹولتی ٹٹولتی تھک گئیں اور آنکھوں میں تیرتے ہوئے سرخ ڈورے ڈوب گئے تو چھمو نے باہر جا کر فضل لوہار سے کہا ـــــ ''لوگوں سے کہہ دو کہ شاہ صاحب اس وقت مراقبے میں ہیں اور شام کی محفل میں تشریف لائیں گے۔''

اور فضل لوہار جو اپنا پیشہ ترک کر کے مجذوب ہو گیا تھا اور اب درویشوں میں شمار ہوتا تھا، بڑے اعتقاد سے آنکھوں کو نیم وا کر کے تسبیح کے دانے انگلیوں میں گھماتے ہوئے آیا اور یہ خبر دے گیا ـــــ چہرے مایوسی سے لٹک گئے۔ تب لوگ پاس ہی اگربتیوں کی خوشبو سے نہائے ہوئے ایک وسیع برآمدے میں چلے گئے اور انتظار کی گھڑیاں گزارنے کے لیے نعت خوانی شروع ہو گئی۔

پھر ریتلے ٹیلوں اور خشک جھاڑیوں کے سائے لمبے ہونے شروع ہو گئے اور صحرائی شام کی خنک ہوائیں آہستہ آہستہ مزار کے جھروکوں میں سرسرانے لگیں۔ فضل لوہار چرس کا دم لگائے دوسرے درویشوں کے ساتھ مل کر قوالوں کو سونف اور الائچیوں

میں اُبلی ہوئی پتّی کی دیہاتی چائے پلانے میں مصروف تھا اور شاہ صاحب نہانے کے بعد آنکھوں میں سُرمہ لگائے گاڑھے رنگ کا چُغہ اور تہہ بند پہنے چھمّو سے سر اور داڑھی میں تیل لگوا رہے تھے۔ ان کے پاس ہی دیہاتوں کے کچھ معززین اور شہری بھی بیٹھے تھے۔ جن میں سے چند ایک زیرِ لب درُود شریف پڑھ رہے تھے۔

جب آسمان کی کوکھ تاریکیوں کو جنم دینے لگی اور مشرق سے بڑھتی ہوئی تاریکیوں کے دوش پر جگنوؤں کی طرح جھلملاتے ہوئے ستارے بھی بڑھنے لگے تو سفید گنبد کے چاروں طرف ستاروں کی طرح جگمگاتے ہوئے چراغ روشن ہو گئے اور مزار روشنی کے دریاؤں کا منبع بن گیا، جن میں انسان دعاؤں کے سہارے ڈوب رہے تھے ——— دیواروں کی جالیوں سے چمٹے ہوئے۔

پھر برآمدے میں طبلچی طبلے پر آٹا لگانے کے بعد ہارمونیم کے ساتھ تال ملانے لگا اور شاہ صاحب نے انگلیوں میں بڑے بڑے نگینوں والی انگوٹھیاں پہنتے ہوئے کہا۔

"چھمّو ——— آج میں بہت خوش ہوں ——— بہت ہی خوش ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

چھمّو نے ان کے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا پہنانے کے بعد انھیں دستار دیتے ہوئے کہا۔

"ہاں ——— ہاں ——— خوشی کیوں نہ ہو۔ آخر اپنے پیر و مُرشد کا عرس مُبارک ہے۔"

"نہیں ——— اِس لیے نہیں ——— ہاں اِسی لیے، اِسی لیے۔"

اور شاہ صاحب برآمدے میں چلے گئے ——— لوگ اُٹھ اُٹھ کر قدم بوسی کرنے لگے، گھٹنوں کو ہاتھ لگا لگا کر آنکھوں سے لگانے لگے۔ شاہ صاحب کی گردن تنی ہوئی اور ہونٹوں پر عجیب سی مُسکراہٹ تھی۔ وہ عجب شان بے نیازی سے اپنی داڑھی میں انگلیاں پھیرتے اور دوسرے ہاتھ میں تسبیح ہلاتے ہوئے بیٹھ گئے۔

فیروزہ کی نعت سے یہ محفل شروع ہوئی اور قوالی کی آخری غزل پر شاہ صاحب کے

وجد کے اختتام پر یہ محفل ختم ہوئی۔

سب کھانا کھا چکے تو سہرا بندی کے لیے شاہ صاحب کے حجرے سے ایک مختصر سے جلوس کی صورت میں لوگ گنبد کی جانب بڑھے۔ قوال گلا پھاڑ پھاڑ گا رہے تھے اور لوگ زار و قطار رو رہے تھے۔ سب سے آگے شاہ صاحب اپنے ہاتھوں میں تازہ پھولوں اور گوٹے کے تاروں سے گندھا ہوا سہرا لیے تھے۔ ان کی دائیں طرف فضل لوہار قبر کا نیا او چھاڑ لیے ہوئے ایک ہاتھ سے اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ رہا تھا جو اپنے پیر کی یاد میں بہہ رہے تھے۔ گنبد کے بڑے دروازے کی چوکھٹ پر شاہ صاحب نے اپنے دستِ مبارک سے سہرا باندھا اور قبر پر چادر چڑھائی۔ پھر وہیں پر قوالی شروع ہو گئی۔ لوگوں کی جیبوں سے روپے نکل نکل کر میرِ مجلس شاہ صاحب کے ہاتھوں سے ہوتے ہوئے قوالوں کی جیبوں میں جانے لگے ــــ شاہ صاحب کے نعرے اور رِقت آمیز چیخیں قوالوں کی آواز سے بھی زیادہ بلند ہونے لگیں اور جب شاہ صاحب نے یہ محسوس کیا کہ قوال اب بہت کما چکے ہیں، چراغ مدھم ہو رہے ہیں، لمبی لمبی موم بتیاں آخری سانس لے رہی ہیں اور حاضرین بھی جمائیاں لے رہے ہیں تو انھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

نزدیکی گاؤں کے باسی اپنے پیر کے قدموں کو بوسہ دینے کے بعد اپنے اپنے گاؤں کو چل دیے۔ بعض تھک کر وہیں دراز ہو گئے۔ باہر سے آئے ہوئے ملنگ اور سائیں حجروں میں چلے گئے۔ قوال اور باقی زائرین خیمے کے نیچے سو گئے اور چھمو اور فیروزہ نے شاہ صاحب کی خاص مرید ہونے کے باعث ان کے حجرے ہی کو نوازا۔ تب ہر سمت سناٹا چھا گیا۔ ایسا سناٹا جو روح کی گہرائیوں میں چیختا ہوا اتر جاتا ہے اور جو روح کو بے چین کر دیتا ہے۔ شاہ صاحب کی روح بے چین تھی۔ ایک عجیب سی تھکاوٹ اور اداسی ان کے جسم میں سرایت کر گئی تھی اور وہ بے قرار ہو کر بار بار کروٹیں بدل

رہے تھے۔

کھونٹی کے ساتھ لٹکے ہوئے گیس لیمپ کی روشنی تیل ختم ہونے کی وجہ سے مدھم ہو رہی تھی۔ پہلے شاہ صاحب نے فیروزہ کے کہنے پر گیس لیمپ بجھا دیا تھا لیکن بعد میں جب انھیں تاریکی بے حد بھیانک محسوس ہوئی تو انھوں نے دوبارہ روشنی کر دی تھی۔ چھمّو ساتھ والے پلنگ پر پگھلی ہوئی موم بتی کے مانند لیٹی تھی اور ایک طرف فیروزہ لحاف اوڑھے شراب کی خالی بوتل کی طرح اوندھی پڑی تھی۔ سب سو رہے تھے۔ لیکن نیند کی دیوی نے شاہ صاحب کو صرف سناٹے بخشے تھے، اور بے چینی عنایت کی تھی، انھیں یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اُن کی تمام مسکراہٹیں اور خوشیاں بالکل کھوکھلی تھیں۔ اُس کچی قبر کی طرح جس میں بارش کی زیادتی سے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔

"شکست، شکست" ان کے کانوں میں کوئی چیخ چیخ کر کہنے لگا اور شاہ صاحب کی بے چین رُوح اور بھی بے چین ہو گئی۔ وہ اُٹھ کر باہر چلے آئے کہ شاید طبیعت کو سکون مل جائے۔

باہر بھی وہی سناٹا مسلط تھا۔ کبھی کبھی پاس والی بستیوں کے ٹھنڈ کے مارے کتّوں کی دبی ہوئی چیخوں سے یہ خاموشی ٹوٹ جاتی۔ سیاہی مائل آسمان پر لاتعداد ستارے آنکھیں جھپکا رہے تھے۔ بادلوں کے ٹکڑے اپنے اندر نامعلوم ارادے چھپائے آوارہ گھوم رہے تھے اور خنک ہوا کے یخ بستہ جھونکے جسم کو کاٹ کاٹ جاتے۔ بادل کے ایک ٹکڑے سے پچھلے پہر کا چاند نکلا اور ساری کائنات چاندنی کے جھرنوں میں نہا گئی۔ بھیگی بھیگی کرنیں شاہ صاحب کے لیے ایک عجیب قسم کا احساس اپنے ساتھ لائیں ان کے موٹے موٹے ہونٹ ایک تلخ مسکراہٹ سے پھیل گئے انھیں اپنے جسم کے ایک ایک جوڑ میں درد محسوس ہونے لگا۔ آج جیسے ذہنی طور پر وہ تھک گئے تھے، نڈھال سے ہو گئے تھے اور یہ تھکاوٹ درد کی صورت میں ان کے

بھور بھوڑ میں اُتر آئی تھی۔ اور وہ کمبل کو ٹھیک سے اپنے کندھے پر جانے کے بعد ریت کے ٹیلے پر آ کر بیٹھ گئے اور کچھ سوچتے ہوئے آہستہ آہستہ ریت پر انگلیوں کے نشان بنانے لگے۔

"فریبی ——— ! تم ہمیشہ سے تو ایسے نہ تھے، جلتے ہوئے صحرا نہ تھے۔ تم نے اپنی آنکھیں خود ہی بند کر لی تھیں۔ تم نے گلاب ایسی دُنیا کے کانٹوں کو جلانے کے بجائے اپنی رُوح تار تار کر لی اور انہی کانٹوں نے تمہیں محمد سلیم سے پیر سلامت شاہ بنا دیا ——— تم ہمیشہ سے سراب نہ تھے، تم نے گلاب کی خوشبو کو چرس کی سڑاند سمجھ لیا تھا۔"

چاند کو ایک چھوٹی سی بدلی نے اپنے دامن میں چھپا لیا اور وقت کے صحراؤں سے ماضی کے ابوالہول دبے قدموں نکلے اور ان کے ذہن میں اُدھم مچانے لگے ———

"ہونہہ ———" کروٹ بدل کر اپنا بازو کھجاتے ہوئے کہا ———

"اُٹھتا ہوں ابا ———"

"تجھے تو سب سے پہلے اُٹھنا چاہیے اور اذان بھی دینی چاہیے۔ تجھے تو میرے بعد امامت کی گدی سنبھالنا ہے۔ اُٹھ جلدی۔ گدھا کہیں کا، سورج چڑھنے کو آیا ہے اور یہ ابھی تک خر خر کر رہا ہے۔"

اور مولوی صاحب اُسے آخری بار جگانے کے بعد مُصلے پر آ کر بیٹھ گئے۔ جب مؤذن نے تکبیر پڑھی تو وہ بھی جلدی سے وضو کر کے جماعت میں شامل ہو گیا۔

دُعا کے بعد مولوی صاحب درسِ قرآن دینے لگے اور وہ واپس مسجد کے ساتھ ملحقہ اس حجرہ نما کوٹھڑی میں آیا جس میں دونوں باپ بیٹا رہتے تھے اور جس میں ایک عجیب قسم کی مولویانہ بو بسی ہوئی تھی۔ اس نے کوٹھڑی سے گڑوی اُٹھائی۔ مولوی صاحب کی واسکٹ سے ایک اٹھنی نکالی اور گوالے کے ہاں چلا گیا۔ گاؤں میں چند ایک کے سوا باقی سب گھروں میں کوئی نہ کوئی بھینس ضرور تھی۔ جو گھر ان سے محروم تھے ان کے مکینوں میں مویشی رکھنے کی استطاعت ہی نہ تھی۔

گاتے بھینسوں سے ایک طرف ہٹ کر ایک ٹوٹے پھوٹے سے تخت پر چند ایک برتن پڑے تھے۔ گوالن زمین پر بیٹھی گوبر اکٹھا کر رہی تھی اور گوالا مویشیوں کو چارہ ڈالنے کے بعد دستی نلکے پر ہاتھ دھو رہا تھا۔ کچھ بچے دودھ کے انتظار میں اخروٹ کھیل رہے تھے۔ اگرچہ روشنی اتنی نہیں تھی مگر پھر بھی وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے اور بیچ بیچ کی آواز آنے لگتی۔ صحن کے ایک کونے میں دو تین نوجوان لڑکیاں کھڑی کھسر پھسر کر رہی تھیں اور تھوڑی دیر بعد نقرئی قہقہے گونجنے لگتے۔

اس کی نگاہیں چاروں طرف گھومنے کے بعد اس کونے میں اٹک گئیں، لیکن وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ وہ انگلیاں چٹختا ہوا تخت پر بیٹھ کر اخروٹوں کا کھیل دیکھنے لگا۔

تب پھلکاری کا آنچل فضا میں لہرایا، سنہری چوڑیاں گوری گوری کلائیوں میں چھنک اٹھیں، چھینٹ کا لہنگا جھولنے لگا اور کولھوں پہ جمی ہوئی گاگر جھومتی ہوئی تخت پر آ گئی۔ آنکھوں پر پڑے ہوئے غلافی پردے اٹھے۔ غصیلی نگاہیں ٹخنوں کے اوپر تک بندھی ہوئی شلوار سے لے کر بوسیدہ سی سرخ ٹوپی تک (جو میل کی وجہ سے سیاہ ہو رہی تھی، جس کا پھندنا غائب تھا اور جس نے اس کے کان ڈھیرے کر رکھے تھے) دوڑتی ہوئی کونے میں جا کر رک گئیں، کمان مارکہ بھنویں تن گئیں، شلوکے ہلے اور ایک تھوک اس کے پیر چاٹنے لگا۔ کونے میں سرگوشیاں ہوئیں۔ وہ چلی گئی تو ایک قہقہہ بلند ہوا اور وہ اپنی چھدری داڑھی کو کھجاتا سوچ کے گرداب میں اتر گیا۔

اس لڑکی کا گھر پکی اینٹوں کا ہے، اس کے باپ کے پاس دو مکان اور بہت سی زمین ہے ـــــ اور میرا مکان؟ میرا کوئی مکان نہیں۔ میں تو اپنے باپ کے ساتھ حجرے میں رہتا ہوں۔ اس کا باپ موٹی موٹی مونچھوں والا زمیندار ہے جو اپنی بھینسوں کا دودھ محض اس لیے نہیں پیتا کہ زیادہ گھی بنا کر بیچے ـــــ اور میرا باپ مولوی ہے جو گاؤں کے ٹکڑوں پر زندہ ہے ـــــ تو پھر مجھے اس سے محبت کیوں ہے ـــــ مجھے تو اس

سے نفرت کرنی چاہیے ــــ لیکن یہ میرے بس میں نہیں، میں کیا کروں، وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے ــــ اور نوری کا دل بے جان ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اس کے سینے میں لوہے کا ٹکڑا ہو۔ ممکن ہے یہ لوہا کسی دن نرم ہو جائے ــــ میں آج پھر لالو سائیں کے تکیے پر دیا جلاؤں گا ــــ

"مولوی جی، یہ لو" اور اس نے چونک کر گڑوی اٹھالی۔

اخروٹ اور نقرئی قہقہے ختم ہو چکے تھے۔ اس نے گڑوی اٹھائی، اس کی آنکھوں میں پھر جھلکاری جھولنے لگی اور وہ اس جھولے پر اپنے خیالات کو بٹھائے لوٹ آیا۔

اس رات لالو سائیں کے تکیے پر تمام دیوں سے الگ تھلگ ایک دیا جھلملاتا رہا اور قبر کے پیروں کی طرف بوسے اور سجدے پٹختے رہے۔

اور مولوی صاحب نے عشا کی نماز پڑھانے کے بعد حجرے کی طاق میں سلیم کے دل کی طرح کانپتی ہوئی دیے کی لو کو تیز کرتے ہوئے کہا۔

"آخر تجھے ضرورت کیا تھی اس سے بات کرنے کی ــــ! آج ہر طرف سے مجھ پر انگلیاں اٹھ رہی ہیں کہ مولوی محمد شریف کے بیٹے نے چودھری علی محمد کی لڑکی کو کیکر کے ٹھنٹھ کے پاس چھیڑا ہے۔ ابھی ابھی علی محمد پھر گالیاں بک کے گیا ہے کہ اپنے بیٹے کو منع کر لو ورنہ ہڈی پسلی ایک کر کے گاؤں سے نکال دوں گا ــــ"

سلیم نے ٹوپی اتار کر لپیٹتے ہوئے کہا۔

"محبت کرنا کوئی گناہ نہیں ــــ مجھے آپ سے محبت ہے، خدا سے محبت ہے، کوئی وجہ نہیں کہ میری اس محبت کو بری نگاہوں سے دیکھا جائے۔"

"خنزیر کے بچے ــــ! جب محبت کے جواب میں گالیاں ملیں اور باپ کی عمر بھر کی کمائی ہوئی عزت خاک میں ملنے لگے تو حرامی پن نہیں کرنا چاہیے۔" مولوی صاحب نے تیزی سے کہا ــــ "تجھے امام بھی تو بننا ہے ــــ"

"ہونہہ —— امام !" اس نے انتہائی آہستگی سے کہا، اور مولوی صاحب نے آنکھیں بند کر لیں۔

ابا! تم کیا جانو —— نوری مجھے اس لیے پسند نہیں کرتی کہ میری ایک انتہائی بیہودہ سی داڑھی ہے اور میری دوڑ صرف مسجد تک ہے —— میں اس کے چچا کے لڑکے ہیرو کی طرح بیل گاڑیوں کی دوڑ میں حصّہ نہیں لیتا —— بٹیر اور مینڈھے نہیں لڑاتا۔ —— کشتی نہیں لڑتا —— وہ ایک ایسے جوان کو چاہتی ہے جو شراب پی کر اسے ہیر کے بول سُنا سکتا ہو —— لیکن میرے لیے یہ ممکن نہیں —— میں مولوی ہوں اور تم بھی مولوی ہو —— لیکن خدا اُسے ضرور عقل دے گا، میری دُعاؤں کا اثر ضرور ہو گا ——

تب اس کے کانوں میں کیکر کے ٹھنٹھ کے پاس کہے ہوئے الفاظ گونجے ——

"کوئی عقل کی بات کرو —— تم کہتے ہو کہ میرے پیروں میں دولت کے ڈھیر لگا دو گے، مجھے دولت نہیں چاہیے —— مجھے ہیرو چاہیے، آئندہ میری طرف اس طرح دیکھا تو آنکھیں نکال لوں گی ——" پھر اس کے پیروں میں تھوک جم گیا تھا۔

اور لالو سائیں کے تکیے پر تمام دیئوں سے الگ تھلگ ایک دیا جھلملاتا رہا —— لیکن نوری کے سینے میں دھڑکتا ہوا لوہا نہ پگھلا۔

پھر درختوں میں آم پیلے پیلے قمقموں کی طرح لٹکنے لگے۔ ساون کی بارش ہونے کے بعد ہر چیز دُھل کر صاف ہو گئی سوائے گلیوں کے جن میں ٹخنوں تک کیچڑ چپک رہی تھی۔ پاس والی نہر کے کنارے بچّے آم اور تربوز کھا کر مٹی کے گھروندے بنا رہے تھے اور قریب ہی ہیرو کی قیادت میں گاؤں کے نوجوان کبڈی کھیل رہے تھے۔ سلیم حجرے میں بیٹھا قمیض سی رہا تھا۔ مولوی صاحب کالو کمہار کی لڑکی کا نکاح پڑھنے گئے تھے۔

حجرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس نے کنڈی کھولی، مولوی صاحب کیچڑ میں لت پت اندر داخل ہوتے ہی چارپائی پر گر گئے اور سلیم گھبرا کر ان کے پیر سہلانے لگا۔

اتنے میں کالو کمہار حکیم کو لے آیا۔ اُس نے وجہ پوچھی تو مولوی صاحب نے بتایا کہ تربوز کھانے کے بعد تھوڑی لسّی پی لی تھی۔ حکیم نے بغیر سوچے سمجھے فوراً بتا دیا کہ ہیضہ ہے۔

"ہیضہ ہے" مولوی صاحب نے چیخ کر کہا۔

اور چند گھنٹوں بعد جب گاؤں پر یرقانی دھوپ کی چادر تن گئی تو گاؤں کے قبرستان میں ایک اور قبر کا اضافہ ہو گیا۔

محمد سلیم مسجد کا امام بن گیا۔ لوگوں نے کیکر کے ٹھنڈ کے پاس والی حرکت بھلا دی اور اب وہ اپنے نئے مولوی صاحب کی شرافت کے پجاری تھے۔ لیکن نوری کے سینے کا لوہا اور بھی زیادہ سخت ہو گیا تھا۔

ایک اُداس سی شام کو نمازیوں کی زبانی اسے خبر ملی کہ عنقریب ہی نوری کی شادی ہیرو سے ہو رہی ہے۔ اس کی رُوح پھڑ پھڑانے لگی۔ تب وہ تمام رات لالو سائیں کی قبر کے ساتھ لپٹا رو رو کر دُعائیں مانگتا رہا لیکن قبر سے کوئی آواز نہ آئی۔ بوسے، سجدے اور دُعائیں لالو سائیں کو صدیوں کی نیند سے بیدار نہ کر سکے۔

پھر چند دن بعد نوری کے گھر سے ڈھولک کی آواز آنے لگی، اور ایک دن ہیر کے بول لہرانے والے ہیرو نے یہ لوہا پگھلا کر پانی بنا دیا اور سلیم کے سینے میں انگارے ناچنے لگے۔ اسے یہ شکوہ نہیں تھا کہ اُس کے باپ نے ہیرو سے کہہ کر نکاح پڑھنے کے لیے اسے کیوں نہیں بُلایا اور دوسرے گاؤں سے مولوی کیوں بُلایا۔ اُسے صرف اتنا ہی قلق تھا کہ کاش وہ یہ کہہ دیتی ـــ سلیم مجھے تم سے محبت ہے اور میں اس فقرے کو سینے سے لگائے ساری زندگی گزار دیتا۔ اسی فقرے کی خاطر اس نے کتنی راتیں نوری کے گھر کے چکر کاٹ کاٹ کر گزار دیں، شاید وہ اس سے مل جائے اور اتنا کہہ دے کہ سلیم مجھے تم سے محبت ہے۔ لیکن اس کے کان ان الفاظ کے لیے ترستے ہی رہے۔ شادی کے بعد بھی کھڑکی میں آنچل لہراتے رہے لیکن اس کے کان پیاسے ہی رہے اور وہ پھلکاری کو آنکھوں میں

سموئے چلّہ کاٹتا رہا۔ پھر ایک دِن اس کے گھر کا دروازہ کھُلا۔ بیرو کے ایک ہاتھ میں لالٹین تھی اور دوسرے ہاتھ میں لاٹھی۔ بیرو کی لاٹھی گھومی —— پھر اُسے علم نہیں کیا ہُوا۔

جب اُس نے نظریں اُٹھائیں تو سُرخی مائل سُورج یُوں اُبھر رہا تھا جیسے کٹے ہُوئے سر کو بالوں سے پکڑ کر آہستہ آہستہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ اس کے گاؤں کے گھر داغ بن کر زمین کے ساتھ چمٹے ہُوئے تھے اور زمین اس کے جسم کو چاٹ رہی تھی۔ وہ ہِلا تو اس کا جسم پکے ہُوئے پھوڑے کی طرح دُکھنے لگا۔ رات کے واقعات اس کے ذہن میں بیرو کی لاٹھی کی طرح گھوم گئے اور ایک تھوک اس کے پیروں میں جم گیا۔

وہ بڑی مشکل سے اُٹھا اور زخمی کوّے کی طرح لڑکھڑاتا ہُوا تیزی سے گاؤں کی مخالف سمت کو چلنے لگا اس گاؤں میں محمد سلیم کے لیے اب کوئی جگہ نہیں تھی۔

وہ بے حد غمگین تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا دماغ لیموں کی طرح نچوڑنے والی مشین میں نچوڑ رہا ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے دماغ کے عرق کے ساتھ اس کے ذہن کے خیالات بھی نچڑ جائیں لیکن خیالات تو جیسے کنکھجورے کے مانند اس کے دماغ کے ساتھ چمٹ کر رہ گئے تھے۔ ناخوشگوار ہواؤں سے کانپتے ہُوئے درخت لرزنے لگے —— تمھیں اس کنکھجورے کو نکال کر پھینک دینا ہوگا۔ محبّت کے بروا کو دل سے نکال پھینکنا ہوگا کیونکہ اس کے ساتھ کانٹوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ یہ کانٹے تمھیں کچھ دینے کے بجائے تمھارے وجود کو اور بھی تار تار کر دیں گے۔ نوری فوت ہو چکی ہے، محبت مر چکی ہے۔ اب اس کا بھی ایک لالو سائیں کے تکیے ایسا مزار بنا کر اس پر اپنے آنسوؤں کے چراغ جلاؤ تا کہ تم ان چراغوں کی لَو سے اپنی خواہشات جلا سکو اور ان جلی ہُوئی خواہشات کی راکھ کو اپنی رُوح کے زخموں پر لگا سکو —— اسے بھُول جاؤ —— سلیم۔

اس نے سر کو جھٹکایا۔ رفتہ رفتہ کنکھجورے کے پیر اس کے دماغ سے نکل گئے اور اس نے آہستہ سے کہا —— "اگر میری رُوح کے زخم پھر بھی نہ بھر سکے تو —— ؟ اچھا، خدا کو

یہی منظور تھا۔

آنکھوں کا جھولا اگرچہ ساکن تھا لیکن پھلکاری ابھی تک جھولے پر تھی۔

بہت دُور جانے کے بعد گاؤں کے داغ مٹ گئے اور وہ شہر میں تھا۔ اس کی جیب میں صرف آٹھ روپے اور چند آنے پائیاں تھیں۔ اس نے تنور سے دوپہر کا کھانا کھایا اور سرائے کے قریب اپنے باپ کے مُرشد کے مزار پر چلا گیا۔ وہاں کے گدی نشین کے پاؤں چھونے کے بعد اس نے بتایا کہ گاؤں والوں نے کوئی اور مولوی رکھ لیا ہے اور اب وہ ان کی مدد چاہتا ہے۔ پیر صاحب نے اس کو تعویذ لکھ کر دیا۔ اور اس نے تھوڑی سی رقم نذرانے کے طور پر پیش کی۔ پیر صاحب نے دُعا کے لیے ہاتھ اُٹھا لیے اور وہ کام کی تلاش میں چل پڑا۔

وہ تمام مسجدوں میں گھوما لیکن سب مسجدیں مولویوں سے پُر تھیں۔ رات کو اس نے لنگر سے کھانا کھایا اور پیر صاحب کے پاس حاضر ہو گیا۔ اس نے اپنی ناکام کوششوں کا ذکر کیا تو انھوں نے ہچکی لے کر علی حیدر کا نعرہ مارا اور مزید ہدیے کے لیے کہا۔ ان کا حکم پُورا ہُوا، اسے ایک اور تعویذ مل گیا اور وہ پیٹ کے اُلجھے ہُوئے تاگے سُلجھاتا ہُوا باہر صحن میں آ کر لیٹ گیا۔

اگلے روز، اُس سے اگلے روز ــــ ناکامی ــــ پھر ناکامی ــــ وہ ان سے ایک اور تعویذ لینا چاہتا تھا لیکن اس کی جیب اپنے دماغ کی طرح خالی ہو چکی تھی اور پیر صاحب نے چرس کے دھوئیں سے جھانک کر کہہ دیا تھا ــــ "بن ہدیے کے تعویذ نہیں ملے گا کیونکہ اس طرح اُلٹا اثر ہوتا ہے۔"

"لیکن پیر صاحب ابھی تک تو تعویذوں کا کوئی اثر نہیں ہُوا ــــ سیدھا نہ اُلٹا، مَیں تو ــــ"

"اوہو ــــ تمھارا اعتقاد اتنا کمزور ہے! جبھی تو تمھیں نوکری نہیں

ملتی ـــــ میاں کل سے اپنا انتظام کرو، لنگر سے کب تک کھانا کھاؤ گے۔"

تب محمد سلیم بے حد مایوس ہو کر اُٹھا اور بازاروں میں آوارہ کُتّے کی طرح گھومنے لگا۔ جوہریوں کی دکانوں جگمگاتے ہوئے زیور دیکھ کر کتنی مرتبہ اُسے خیال آیا کہ کسی طرح لے اُڑے۔ گناہ کا چور بار بار اس کے دل میں سیندھ لگانے کی کوشش کرتا لیکن وہ اسے مار مار کر بھگا دیتا۔ اور پھر وہ سوچتا ـــــ آخر اسے بے داغ ہونے کا صلہ کیوں نہیں ملتا؟ پیر کیوں اس قدر بے حس ہیں؟ خدا کیوں اتنا بے پرواہ ہے؟ وہ خود اتنا متزلزل کیوں ہے؟ ان سوالات کے جواب میں گرد و غبار کی چادر اس کے ذہن پر تن جاتی جس کے پیچھے وہ کسی چیز کو نہ دیکھ سکتا۔

بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ ایک کپڑے کی دُکان سے چند دیہاتی عورتیں کپڑا خرید کر نکلیں۔ ان میں سے ایک کے دوپٹے کے پلّو میں بندھے ہوئے پیسے اس کی پیٹھ پر لٹک رہے تھے۔ اس کی نگاہیں گرہ کے اندر گھومنے لگیں۔ گناہ کے چور کو تعویذوں نے دل میں سیندھ لگانے میں مدد دی اور وہ چشم زدن میں اس کا دوپٹہ کھینچ کر بجلی ایسی تیزی سے ساتھ والی تاریک سی گلی میں ایک مکان کی سیڑھیوں میں چھپ گیا۔ وہ دیہاتی عورت واویلا مچا رہی تھی اور لوگ اکٹھے ہو کر ہمدردی کا اظہار کر رہے تھے۔ سلیم نے دوپٹے کو اپنے تہہ بند کے ڈب میں اڑس لیا اور جانے کن کن گلیوں سے ہوتا ہوا پیر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

رات ہو چکی تھی۔ سب معتقد جا چکے تھے اور پیر صاحب جمائیاں لے رہے تھے۔ اُنھوں نے اُسے دیکھ کر علی حیدر کا نعرہ لگایا۔ پیسے وصول کیے اور کہا، "انشاء اللہ العزیز اب تیری آرزو پوری ہو گی۔"

جب چوری کیے ہوئے پیسے بھی ختم ہو گئے اور پیٹ کے الجھے تاگے نہ سلجھے تو وہ سمجھ گیا کہ یہاں اسے کچھ نہیں ملے گا ـــــ کاش وہ پہلے ہی اس حقیقت کو جان لیتا۔ وہ بہت دیر تک تاروں بھرے آسمان کو دیکھتے ہوئے خدا معلوم کیا کچھ سوچتا رہا۔ پھر جانے اس

کے دماغ کے کس کونے میں کونسی حس بیدار ہوئی کہ آخری تعویذ ٹکڑے ٹکڑے ہوکر خزاں رسیدہ پتوں کی طرح بکھر گیا۔ وہ مزار کی طرف بڑھا اور دروازے کے قریب جاکر چاروں طرف نظر دوڑائی۔ لوگ مُردوں کی مانند صحن میں سو رہے تھے۔ اس نے قبر کے پیروں کی طرف رکھی ہوئی مقفل تجوری سر پر اُٹھائی اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ اُس کا دل زور سے بالکل نہ دھڑکا جیسے اُس دیہاتی عورت کا دوپٹہ کھینچتے وقت دھڑکا تھا —— شاید اُس کے دل کی دھڑکن ہی بند ہوگئی تھی۔ وہ کسی ایسی طرف کو بھاگا جا رہا تھا جہاں اُسے جاننے والا کوئی نہ ہو۔ وہ شہر سے بے حد دُور نکل آیا۔

جب وہ چلتے چلتے بہت ہی تھک گیا تو پگڈنڈی سے ہٹ کر ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ تھوڑا سا ستانے کے بعد اُس نے پتھر سے بمشکل تالا توڑا۔ روپے روپے کے دس نوٹ اور کچھ ریزگاری اس کا مُنہ چڑا رہی تھی۔

جب سُورج کی تیز شعاعیں اس کے مُنہ پر کھیلنے لگیں تو وہ بیدار ہوا۔ آنکھیں ملتا ہوا اُٹھ بیٹھا اور پگڈنڈی پھر اس کے قدموں کے نیچے دبنے لگی۔ دُور دُور تک آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔ چاروں طرف کھیت ہی کھیت تھے۔ کہیں کہیں اکّا دُکّا کچے مکان دکھائی دے جاتے۔

شام کے وقت وہ ایک ریتلے میدان میں پہنچ گیا جہاں کہیں کہیں خشک خاردار جھاڑیاں اُگی تھیں۔ آسمان پر اُڑتی ہوئی لاتعداد چیلیں کسی اچھی خاصی آبادی کا پتہ دیتی تھیں۔ وہ کچھ آگے بڑھا تو دائیں طرف پگڈنڈی سے چند قدم دُور ایک جھاڑی کے قریب کسی جانور کی لاش کے پاس گدھ اور کوّے بیٹھے ضیافت اُڑا رہے تھے۔ اس کی نظریں اس لاش میں گڑ کر رہ گئیں۔ گدھوں سے نُچتے ہوئے مُردہ جانور سے اُٹھتی ہوئی بدبُو ایسی تیزی سے اس کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوا جس نے اس کے دل و دماغ کو محیط کر لیا اور ہولے ہولے ایک زہر خند کی صُورت میں اُس کے ہونٹوں پر اُتر آیا۔

اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ یہ چمک اُس دیے کی تھی جسے اُس نے محبت عقیدت اور تقدیس کی قبر پر ابھی ابھی روشن کیا تھا۔ وہ ایک بار صرف ایک لحظے کے لیے ہچکچایا اور پھر مسکرا دیا۔

رات کی سیاہ چادر نے آدھی دُنیا کو اپنے دامن میں چھپا لیا تو قریبی گاؤں کے کچھ فاصلے پر لق و دق میدان میں اُس نے ایک قبر تیار کر دی۔ تہہ بند کو پھاڑ کے لنگوٹی بنا کر باندھ لی اور اپنے بقیہ لباس کو بھی قبر ہی میں دبا دیا۔

صُبح صُبح وہ قبر کے پاس بیٹھ کر اُونچی اونچی آواز میں ہُو حق کے نعرے لگانے لگا۔ سب سے پہلا شخص جو اس کے قریب سے گذرا وہ فضل لوہار تھا جو اپنی سُسرال سے لوٹ رہا تھا۔ فضل نے جب دیکھا کہ ایک سائیں نما آدمی قبر کے کنارے بیٹھا اللہ اللہ کر رہا ہے تو اس نے انتہائی اعتقاد سے آنکھیں جھکا کر اس سے پوچھا کہ قبر رات ہی رات میں کیونکر ظہور پذیر ہُوئی۔ محمد سلیم نے اپنا نام سلامت شاہ بتا کر کہا کہ اس کے مُرشد حضرت کاڑے شاہ گاؤں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے تشریف لا رہے تھے کہ اسی جگہ زمین شق ہو گئی اور وہ اس میں زندہ سما گئے۔ پھر ہُو حق کے نعروں کے ساتھ سلامت شاہ کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو ٹپکنے لگے، وہ وجد میں آتے آتے رہ گیا اور فضل لوہار درود شریف پڑھنے لگا۔ تب سلامت شاہ یعنی شاہ صاحب نے اپنے پیر و مرشد کا ذکر کچھ اس طریقے سے کیا کہ فضل بے حد متاثر ہُوا۔ شام تک پانچ دس اور وہاں حاضر ہُوئے اور فیضِ عام سے مالامال ہُوئے۔

اس شام پیر کاڑے شاہ کی قبر پہ پہلا دیا جلا ———

فضل لوہار کی وجہ سے شاہ صاحب اور ان کے مرحوم مُرشد گاؤں بھر میں مشہور ہو گئے۔ گاؤں کے باسی تعویذ لکھوانے اور دُعاؤں کے واسطے چیونٹیوں کی طرح آنے لگے۔ اور شاہ صاحب کی دُعاؤں اور تعویذوں سے لوگوں کے کام واقعی پُورے ہونے لگے۔ مثلاً کتنے ہی دنوں رحیمے ٹانڈے کی گائے کسی وجہ سے بچھڑا انہیں جن رہی تھی حالانکہ

اس کے خیال کے مطابق دن پورے ہو چکے تھے۔ جب اُس نے شاہ صاحب کی خدمت میں دوپہر کے کھانے کے ساتھ پانچ روپے پیش کیے تو انھوں نے گائے کے گلے میں لٹکانے کے لیے تعویذ دیا اور دُعا بھی کی، خُدا کی قدرت، گائے نے ایک ہفتے کے بعد ہی بچھڑا جن دیا۔ جس سے رحیما ٹانڈا بہت متاثر ہوا اور اس نے بہت سا نذرانہ پیش کرنے کے علاوہ قبر پر سبز چادر بھی چڑھائی۔ پھر قادرے کی ماں اس کی بیوی سے بہت لڑتی جھگڑتی تھی۔ ایک تو بوڑھی اور دوسرے گنٹھیا کی مریض، اِن دونوں بیماریوں کی وجہ سے کچھ اور بھی بیمار ہو گئی تھی۔ شاہ صاحب نے قادرے کی بیوی کے کہنے پر تعویذ گنڈے کیے تو کرنا خُدا کا کیا ہُوا کہ وہ ایک ماہ کے بعد چل بسی اور اس کی بیوی نے کئی چڑھاوے چڑھائے۔ کتنے ہی عرصے سے بارش نہیں ہو رہی تھی۔ گاؤں کے چیدہ چیدہ افراد آئے اور شاہ صاحب کے ہاتھ پاؤں چومنے کے بعد درخواست کی۔ انھوں نے نعرہ لگایا اور کہا "ہو گی" تھوڑے ہی عرصے کے بعد مون سون کا ریلا آیا اور بارش ہو گئی۔ اِسی قسم کے اور کئی حادثے آئے اور شاہ صاحب دُور نزدیک حتّٰی کہ شہر میں بھی مشہور ہو گئے۔ اگر کبھی کوئی مُراد بر نہ آتی تو اُسے خدا کی طرف سے بہتری پر محمول کیا جاتا ——

فضل لوہار پر شاہ صاحب کی خاص نظرِ کرم تھی اور لوگ اسے رشک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ پھر وہ اپنی بیوی اور بچے کو بلکتا چھوڑ کر درویش بن گیا۔

پھر شاہ صاحب گاڑھے رنگ کا جوگیا لباس پہننے لگے۔ اِن کے گلے میں موٹے موٹے منکوں کی مالا تھی۔ انھوں نے بڑی بڑی انگوٹھیاں پہن لی تھیں اور بھاری کڑے کلائیوں میں چڑھا لیے تھے اب وہ بھنگ اور چرس کے بجائے شراب پیتے تھے۔ ان کے شہری مرید خود ان کے لیے بڑھیا شراب بہم پہنچاتے —— اس کے علاوہ ہر جمعرات کو چھمّو کا مجرا بھی ہوتا تھا۔

شروع شروع میں ایک دیا ٹمٹمایا تھا، پھر کئی دیے جھلملائے اور آج لاتعداد دیے

جگمگائے تھے۔ اور یہ جگمگاہٹ شاہ صاحب کے دِل میں خوشی بن کر ناچ رہی تھی۔

آج عرس کا پہلا دِن گزر گیا تھا اور ابھی دو دِن اور باقی تھے —— ابھی دو دِن اور خوشی کو چہکنا تھا۔ لیکن اس وقت جب کہ رات کے آنگن میں چاند بادلوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا، شاہ صاحب کی خوشی اور مُسکراہٹ پر اوس پڑ چکی تھی، وہ بے حد بے قرار تھے اور سناٹوں کی بخشی ہوئی بے چینیاں ان کے رگ و ریشے میں سرایت کر چکی تھیں۔ اب وہ ستاروں اور کہکشاؤں کی دُنیا میں جانا چاہتے تھے۔ لیکن خُدا معلوم حُجرے میں گونجی ہوئی آواز پھر ان کے کانوں کے پردوں سے کیوں ٹکرانے لگی —— "شکست، شکست —— شکست" اور شاہ صاحب کی بے چین رُوح اور بھی بے چین ہو گئی۔

بھیگی بھیگی کرنیں، جو ایک عجیب قسم کا احساس اپنے ساتھ لائی تھیں وہ بادلوں تک محدود ہو گئیں کیونکہ کرنوں کو جنم دینے والے چاند نے شاہ صاحب کے چہرے کے تاثرات سے ڈر کر بادلوں کی آغوش میں مُنہ چھپا لیا تھا۔ جب یہ شکست کی آواز ان کے دِل و دماغ پر مسلط ہو گئی تو انھیں اپنی ہی شکل کا ایک آدمی سامنے بیٹھا نظر آیا۔ اُس آدمی نے بڑی عجیب سی بھاری آواز میں کہا: "سلیم —— تو ہمیشہ سے تو ایسا نہ تھا۔ کیا تُو نے ایسی گھٹیا حرکتیں محض انتقام کی خاطر کی تھیں؟ اور کیا تو اپنا انتقام لے چکا ہے؟ ہرگز نہیں۔ میرے خیال میں تیری اس زندگی نے تجھے اپنی نظروں سے بھی گرا دیا ہے لوگوں کو دھوکا دینے کے بہانے تو اپنے آپ کو دھوکا دینے لگا۔ تُو نے دُنیا میں فریب ہی فریب دیکھ کر اپنے اُصولوں کو بے معنی سمجھا، کائنات تیرے لیے سراب بن گئی۔ تُو نے خود بھی اس فریب کا جواب فریب سے دے کر اپنے اخلاق کو شراب میں ڈبونا چاہا تھا۔ آج تیری معصومیت نے چھُوئی مُوئی کی طرح تجھ سے مُنہ موڑ لیا ہے —— پیارے محمد سلیم —— کیا فریب کا جواب صرف فریب ہے؟ کیا انسان کے اندر انسانیت کی کوئی قوّت ایسی نہیں جو شر کو زمین کے ساتویں پردے میں چھپا دے؟ کیا تُو نے جو کچھ بھی کیا وہ تیری سب سے بڑی

شکست نہ تھی ـــــــــ؟ اور ان کے ہم شکل کا چہرہ سوالیہ نشان بن کر رہ گیا۔

تب ریتیلی پہاڑیاں گونج اٹھیں ـــــــــ "شکست، شکست ـــــــــ شکست!" دور ذخیرے کے درختوں نے گلا پھاڑ پھاڑ کر یہی الفاظ دہرائے، بادلوں کی عجیب عجیب شکلیں بھی چیخنے لگیں۔ شاہ صاحب کو ہر طرف سے یہی آواز سنائی دینے لگی۔ اور انھوں نے آنکھیں بند کر کے کانوں میں انگلیاں ٹھونس کر کہا۔

"ہاں ـــــــــ یہ میری زندگی کی سب سے بڑی شکست تھی ـــــــــ میں نے اپنے کو دھوکا دیا ہے ـــــــــ اس جانور کی ہڈیوں نے مجھے اُلّو بنایا ہے۔ میں ان ہڈیوں کا طلسم توڑ دوں گا ـــــــــ توڑ دوں گا ـــــــــ"

شاہ صاحب کی انگلیاں آہستہ آہستہ کانوں سے ہٹیں۔ ان کے سامنے بیٹھا ہوا شخص فتح مندانہ مسکراہٹ ہونٹوں پر پھیلا کر غائب ہو گیا اور شاہ صاحب کے ہونٹوں پر اطمینان کی مسکراہٹ کھیلنے لگی۔

ـــــــــ

سورج، صبح کی دلہن کی مانگ میں دھیرے دھیرے سیندور بھر رہا تھا اور شاہ صاحب اپنے کمبل کو ٹھیک سے کندھے پر جماتے ہوئے اٹھے۔ کڑے، مالا، انگوٹھیاں ایک ایک کر کے گراتے ہوئے، قدموں کے نشان ریت پر چھوڑتے ہوئے آہستہ آہستہ مزار کی طرف چلنے لگے۔

ـــــــــ

آج عرس کا دوسرا دن تھا ـــــــــ زندگی اسی طرح مجسّم دعا بن کر مزار کے دروازوں سے لپٹی ہوئی تھی۔ لیکن شاہ صاحب کے حجرے میں پائل گونگی ہو چکی تھی اور شراب کی بوتلیں ٹوٹ گئی تھیں۔ چھمّو، شاہ صاحب کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئی تھی جب وہ مزار کی عمارت کے ایک کونے میں پہنچی تو وہ دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھے اپنے عصا سے زمین پر عجیب و غریب قسم کے نشان بنا رہے تھے۔ چھمّو کے بلانے پر وہ چونکے۔ اس نے گلے شکوے کیے کہ وہ اسے چھوڑ کر اتنی صبح کہاں چلے گئے تھے۔ شاہ صاحب نے

جواب میں صرف اتنا کہا۔ "سب لوگوں کو صحن میں بلالو ـــــ میں ان سے کچھ کہنا چاہتا ہوں"۔

چھمو نے جا کر لوگوں میں اعلان کیا۔ دعائیں رک گئیں۔ دیگوں میں چاولوں کے ساتھ اُلجھتے ہوئے کفگیر ٹھہر گئے۔ باہر میدان میں دیہاتی گھوڑ دوڑ اور نیزہ بازی کے جوہر دکھا رہے تھے، دوڑ اور نیزے رک گئے اور سب لوگ صحن میں جمع ہو گئے۔ جو کوئی جس طرح تھا چلا آیا ـــــ ان کے پیر صاحب نے انھیں بلایا تھا۔

لوگ ان کا فرمان سننے کے لیے بے قرار تھے۔ اور شاہ صاحب کی آواز گونجی ـــــ "میرے بھائیو ـــــ آج تک تم جس قبر پہ دیے جلاتے رہے ہو، جس کی پرستش کرتے رہے ہو، وہ پیر کاڑے شاہ کی قبر نہیں ہے ـــــ آج سے ایک سال پہلے ایک شخص محمد سلیم کو جنگل میں چند ہڈیاں ملی تھیں۔ اس نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

لوگوں کے سر چکرا گئے اور سرگوشیاں ہونے لگیں۔ فضل لوہار نے کہا ـــــ "آپ کو کیا ہو گیا ہے پیر جی ـــــ"

"بکواس بند کرو ـــــ! جب انسان کو سچی بات کہی جائے تو وہ اُسے جھوٹ سمجھتا ہے لیکن فریب کو سینے سے چمٹا لیتا ہے ـــــ تم سب بیوقوف جانور ہو ـــــ یہ قبر اس جانور کی ہے جسے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"آپ دیوانے تو نہیں ہو گئے شاہ جی ـــــ" ایک شہری گرجا۔

"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گدھیں نوچ رہی تھیں۔ اور میں نے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

"پھر اوئے اینھوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔" رحیمے ٹانڈے کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ اندھے ۔ ۔ ۔ ۔" شاہ صاحب چیخے۔

"یہ اپنے پیر سے منکر ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ کافر ہو گیا ہے"۔ گاؤں کا ایک بے باک نوجوان دھاڑا۔

"ہاں میں کافر ہو گیا ہوں"۔ شاہ صاحب کی آواز بیٹھ گئی۔ اور ان کے لمبے لمبے بال

چہرے پر بکھر گئے۔ "لیکن خدا کے لیے اس جانور کو پُوجنا چھوڑ دو ــــ اور اگر تمھیں یقین نہیں آتا ــــ تو یہ دیکھو ــــ یہ دیکھو۔"

شاہ صاحب نے اپنا عصا پھینک کر ایک ملنگ کا لمبا چمٹا لیا۔ قبر کی طرف بڑھے اور پاگلوں کی طرح چمٹے کے پے در پے چوٹوں سے سنگِ مرمر کی قبر کھودنے کی کوشش کرنے لگے۔ مریدوں اور عقیدتمندوں میں ایک شور اُٹھا۔ جیسے یہ ضربیں ان کے دل اور رُوح پر لگ رہی ہیں۔ یکایک کئی دیہاتی آگے بڑھے۔ اندھی لاٹھیاں، بیرو کی لاٹھی کی طرح ہوا میں لہرائیں اور کئی ٹھوکریں شاہ صاحب پر آ کے جم گئیں۔

اور فضل لوہار نے پیر کا ڑے شاہ کی قبر پر جمتے ہوئے شاہ صاحب کے خون کی طرف حقارت سے دیکھنے کے بعد سفید گنبد کی چوٹی کی طرف نظریں اُٹھائیں جہاں سیاہ جھنڈا ایک نئی شان سے لہرا رہا تھا۔

یہ میری پہلی کہانیوں کا انتخاب ہے۔ روایت کے مطابق اسے میرے دوسرے مجموعوں سے پہلے شائع ہونا چاہئے تھا۔ میرا پہلا انتخاب "چوراہا" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا تھا۔ دراصل ہمارے والی نسل کو اپنے کام کی نوک پلک سنوارنے کا جنون سا تھا، تشفی نہیں ہوتی تھی۔ اپنا لکھا لفظ، چھپا ہوا دیکھنے کا کیسے شوق نہیں ہوتا، یعنی اپنے تجربے، واردات کو شیئر کرنے کا۔ ہم لوگوں میں اعتماد تو بہت تھا لیکن جھجک بھی تھی۔ اگر قریبی زمانوں میں پیدا ہوئے ہوتے تو شاید ہم بھی "کاتتے اور لے دوڑتے"

ہم ہمیشہ اپنے "امکانات کی دریافت" میں سرگرداں رہے۔ پہلی کہانیاں اسی عمل کے آغاز کی کوششوں میں سے ہیں۔ اگر جدید کہانی، کوئی چیز ہے، اور اگر میں جدید کہانی، لکھتا ہوں، تو یہ کہانیاں پڑھ کر شاید احساس ہو جائے کہ ہم لوگ، "ایک ہی جست میں نتائج" تک نہیں پہنچے بلکہ اس کے پس منظر میں کڑی ریاضت اور "خود دریافتی" کے ادوار کی ایک اوڈیسی ہے، اور چونکہ یہ ایک نہ ختم ہونے والی اوڈیسی ہے اس لئے دعوے بھی کوئی نہیں۔ مَیں تو اس زمانے میں بھی فکشن سمجھنا لکھنا سیکھ رہا تھا اور اب بھی یہ عمل جاری ہے۔

اپنی فکشن کا یہ پہلا انتخاب، جو اب چوتھا انتخاب ہے، مَیں ــــ اپنی امی کے نام معنون کرتا ہوں۔

۲۳ ستمبر ۱۹۹۰ء

انور سجاد

تلاش وجود	تنقید
پہلی کہانیاں	۵۷ - ۱۹۵۱ء
چوراہا	۶۴ - ۱۹۵۸ء
استعارے	۷۰ - ۱۹۶۵ء
آج	۸۰ - ۱۹۷۱ء
رگ سنگ	ناول
خوشیوں کا باغ	ناول
نگار خانہ	ڈرامے
صبا اور سمندر	ڈرامے
رسی کی زنجیر	ڈرامے
رات کا پچھلا پہر	ڈرامے